احمد رشید
لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہونے والی کتاب
طالبان کے مصنّف کی نئی تصنیف
جہاد
وسط ایشیا میں جہادی تحریکوں کا فروغ
مشعل
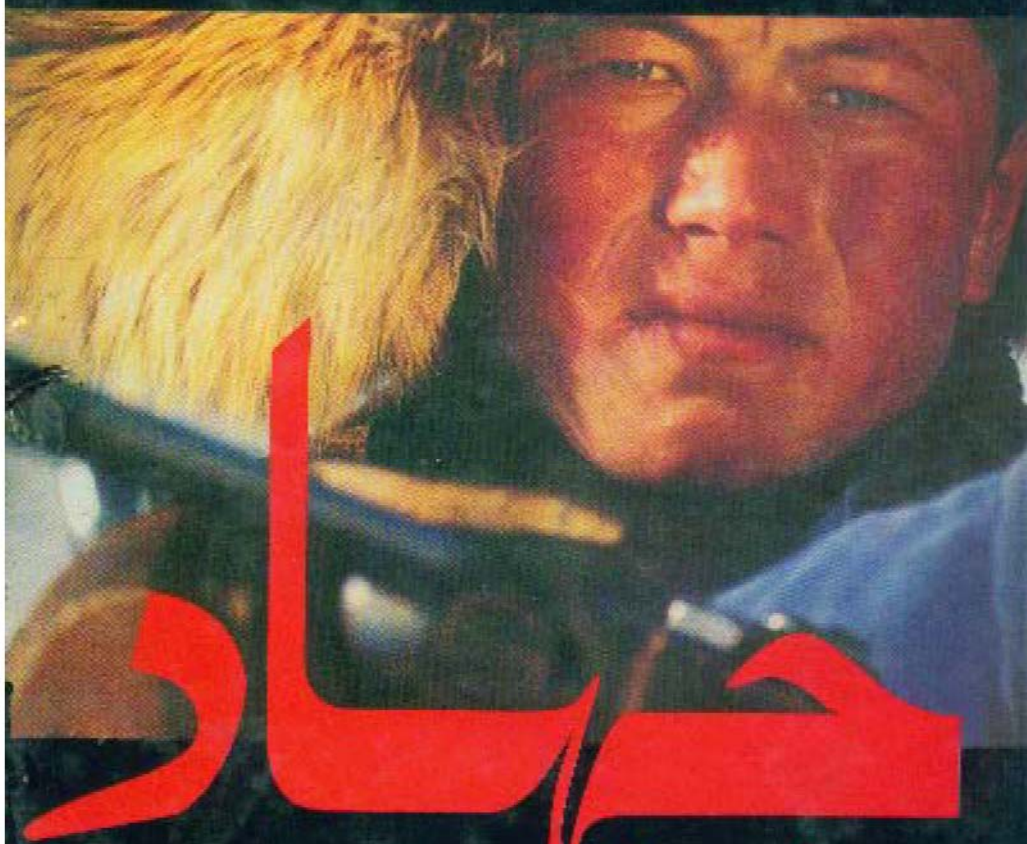
1

جہاد

وسط ایشیا میں جہادی تحریکوں کا فروغ

احمد رشید

اُردو ترجمہ: تنویر اقبال

مشعل

آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600' پاکستان

2

جہاد

وسط ایشیا میں جہادی تحریکوں کا فروغ

احمد رشید

اُردو ترجمہ: تنویر اقبال

ناشر: مشعل

آر بی 5 سیکنڈ فلور
، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

انتساب

اینجلیز اور اس کی محبت کے نام

اور

جانی داس اور فلپ ٹو پیلین کی یاد میں

جنہیں

اس وسیع و عریض سرزمین کی فضاؤں، کھیتوں، کھلیانوں

اور مرغزاروں سے بہت لگاؤ تھا

فہرست

7

ابتدائیہ

میں پہلی دفعہ 1988ء میں وسط ایشیاء گیا- میں نہ صرف افغان جنگ کے پس پردہ محرکات کا متلاشی تھا بلکہ افغانستان کی نسلی اقلیتوں کے متعلق بھی جاننا چاہتا تھا جو انہی دنوں، سوویت افواج کے انخلاء کے بعد، تاریخ میں پہلی بار، اپنی قسمت کی مالک خود بننے جا رہی تھیں- ان گروہوں کو سمجھنے کے لیے، مجھے ان کے مبداء کو جاننا تھا جو وسط ایشیا میں واقع تھا اور اس وقت سوویت یونین کا حصّہ تھا- تین سال بعد جب سوویت یونین بالآخر ختم ہو گیا، میں دوبارہ وسط ایشیا میں موجود تھا اور میں نے وہاں پانچ نئی آزاد ریاستوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے معرضِ وجود میں آتے دیکھا-

وسط ایشیا کے ان پے در پے دوروں کے نتیجے میں، میری پہلی کتاب ''وسط ایشیا کا احیاء: اسلام یا قوم پرستی،1994ء میں شائع ہوگئی- اس میں، میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا وسط ایشیائی ریاستیں نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر اپنے جمہوری نظام تشکیل دیں گی یا اسلامی بنیاد پرستی اس کی جگہ لے گی- یہ وہ سوال تھا جس کا میں اس وقت براہِ راست جواب نہیں دے سکتا تھا- یہ کتاب جزوی طور پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش بھی ہے-

تعارف میں، میں نے جہاد کے پیچیدہ مفہوم کو' مغرب میں جسے عموماً مقدس جنگ کے معنوں میں لیا جاتا ہے' اور نئی جہادی تحریکوں کے ظہور کی وجوہات کو تلاش کرنا چاہا ہے- لیکن جہاد کے تصور کو غلط سمجھنے میں صرف مغربی لوگ ہی شامل نہیں بلکہ نئے بنیاد پرستوں اور متشدد

اسلامی تحریکوں نے بھی اس کے عظیم تر مفہوم یعنی اچھا اور باکردار مسلمان بننے کی اندرونی جدوجہد کو توڑ موڑ کر رکھ دیا ہے- اس حوالے سے ان تنازعات پر سیر حاصل گفتگو ہوسکتی ہے، جنہوں نے وسط ایشیا کو شدید شکست دریخت کا شکار بنا رکھا ہے-

پہلا حصّہ وسط ایشیا کی تاریخ اور چھٹی صدی عیسوی سے لے کر کمیونسٹ دور کے اختتام تک، اس کی مقامی اسلامی تحریکوں کے متعلق ہے- نسلی تضادات کی تاریخ، اسلام کی افزائش اور جغرافیئے کا اہم کردار ـــــــ غرض ماضی کو سمجھے بغیر، ہم حال کو نہیں سمجھ سکتے:- میں نے ہر وسط ایشیائی ریاست کی آزادی کا پہلا عشرہ، حکمرانوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے حوالے سے مختصراً بیان کر دیا ہے-

دوسرا حصہ وسط ایشیا میں انقلابی اسلام کے نئے تصور کی آگہی کے بارے میں ہے- تین سب سے بڑی تحریکوں، جماعت احیائے اسلام، حزب التحریر اور ازبک اسلامی تحریک ـــــــ پر توجہ مرکوز کر کے، میں نے ان کے مبداء، عقائد، حلقہ اثر اور سرگرمیوں کا خاکہ کھینچا ہے- مشاہدے سے سب سے اہم دریافت یہ سامنے آئی کہ اگرچہ یہ تحریکیں ابتدا میں مختلف نظریات، لائحہ ہائے عمل اور مراکز تعاون کی حامل تھیں، لیکن وسط ایشیا کی صورتِ حال نے ـــــــ خصوصاً، معتدل ترین اسلام پر بھی حکومتی ظلم اور تشدد نے ـــــــ انہیں باہم مجتمع ہونے اور طالبان اور اسامہ بن لادن کی القاعدہ جیسی دوسری اسلامی تحریکوں کے حلقہ اثر میں جانے پر مجبور کر دیا- یہ تحریکیں ایک بالکل اجنبی سرزمین پر، ناقابل یقین تیز رفتاری سے پھیلتی جا رہی ہیں کیونکہ مقامی حکومتیں اور بین الاقوامی برادری دونوں ہی کسی بھی طرح کے مثبت اقدامات کرنے میں ناکام ہوگئیں اور وسط ایشیا کے عوام کو جبر و تشدد، بے روزگاری، غربت، بیماری اور جنگ کے سوا کچھ نہیں ملا-

دو سب سے بڑی زیر زمین اسلامی تحریکوں، حزب التحریر اور ازبک اسلامی تحریک کی تمام سرگرمیاں خفیہ ہوتی ہیں- وہ بہت کم اخباری بیانات دیتے ہیں، ان کے انٹرویو بھی کبھی کبھار آتے ہیں- وہ اپنی قیادت کی تصاویر لینے کی بھی اجازت نہیں دیتے- آخر کس طرح ازبک اسلامی تحریک کے لیڈر جمعہ نعمان غنی ایک افسانوی اور انتہائی دلیر کردار بن کر، وسط ایشیا میں ابھرے جبکہ عام لوگ تو ان کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں؟ یہ کتاب نعمان غنی اور ان سے بھی کہیں زیادہ سربستہ رازحزب التحریر کی قیادت، جن کے نام تک نامعلوم

ہیں، کے متعلق تحقیق و جستجو کی کوشش ہے- سو، اگر یہ بعض اوقات جاسوسی کی ایسی کہانی لگے جس میں سراغ کا اتہ پتہ ہی نہ چلے، افسانوی صورتِ حال نظر آئے اور نامکمل تصورات سامنے ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اختتام ابھی تحریر ہونا ہے-

میں نے درجنوں دفعہ وسط ایشیا کا دورہ کیا اور جب میں اس دلکش سرزمین پر موجود نہیں رہا، تب بھی وہاں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں نے اسی توجہ اور انہماک سے دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ میرے تصور میں رچ بس گئے ہیں- قدرتی توانائی کے آخری عظیم ترین ذخائر سے بھرپور، زمین کا یہ وسیع و عریض لینڈ سکیپ، اپنے دامن میں خوبصورت وادیاں، مرتعش آبادیاں اور جوش و جذبے سے لبریز سیاسی سرگرمیاں لئے، اہل مغرب کے لئے آج بھی ازمنہ وسطیٰ ہی کی طرح، سربستہ راز نظر آتا ہے بلکہ حقیقتاً کچھ زیادہ، کیونکہ وسط ایشیا کو یورپ اور ایشیا کے مابین پل کی حیثیت دینے کے باوجود، شاہ راہِ ریشم کو، یورپ نے ذریعہ سفر نہیں بنایا بلکہ اس سارے خطےّ کو افسانہ و افسوں قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے- گزشتہ عشرے میں طاعون کی طرح پھیلتی خانہ جنگیوں اور سیاسی بدامنی کے باوجود، بین الاقوامی میڈیا میں اسے اچھی طرح دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی- حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ، چین اور روس کا استحکام فی الوقت وسط ایشیا کے ہاتھ میں ہے-

وسط ایشیا میں آپ کوئی سوال کر تو سکتے ہیں مگر اس کے سیدھے جواب کی توقع نہ کیجئے- بسا اوقات آپ کو کوئی جواب ہی نہیں ملے گا- بس کچھ بصیرت افروز لمحے ہوتے ہیں- تاجکستان کی خانہ جنگی کے دوران،1993ء میں مجھے بھی ایک ایسا ہی لمحہ ملا- میں دوشنبے میں ایک معروف صحافی کے گھر کے باغیچے میں بیٹھا، اتوار کے شاندار لنچ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک گلی کے دونوں سروں پر فائرنگ شروع ہو گئی، جو بالآخر تین روزہ شدید لڑائی میں تبدیل ہو گئی- گولیاں جھاڑیوں میں پڑنے کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کو مار رہا ہے اور کیوں؟ لیکن میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک شاعر، ایک ناول نگار اور ایک صحافی پر مشتمل میرے میزبانوں نے جو بلاشبہ تاجکستان کے آزاد خیال دانش وروں میں خاصے اہم مقام کے حامل تھے، اچانک اپنی جیبوں میں چھپے پستول باہر نکال لئے اور فائرنگ کا جواب دینے لگے- ہم چھ گھنٹے تک باغیچے میں محصور رہے، لیکن میں کبھی نہیں جان سکا کہ حملہ آور کون تھے، حالانکہ پوری گلی لاشوں سے اٹی پڑی تھی-

امید ہے کہ یہ کتاب وسط ایشیا میں موجودہ لڑائیوں کے اسباب اور اس کے متحارب گروہوں کے بارے میں مناسب وضاحت کرے گی- جب تک بین الاقوامی برادری عالمی مستقبل پر، وسط ایشیا کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت کونہیں پہچانتی،صورت حال میں کوئی بہتری آ ہی نہیں سکتی- گو میں نے علاقے کے بنیادی کرداروں اوراہم مسائل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم اپنے ہرسوال کے جواب کی امید اس کتاب سے نہ کیجئے-

وسط ایشیا کے بعض نامعلوم دوستوں کی مدد کے بغیر، یہ کتاب لکھی ہی نہیں جا سکتی تھی- ان میں سرکاری حکام، سفارت کار، صحافی، اساتذہ، مولوی حضرات، کاروباری لوگ، امدادی کارکن اور عوام شامل ہیں- اقوام متحدہ، ادارہ برائے تیکنیکی تعاون اور ترقی، آغا خان فاؤنڈیشن اور سوروس فاؤنڈیشن جیسے انسانیت پسند اداروں نے سالہا سال میرے کام میں تعاون کیا، تاہم میرے اخذ کردہ نتائج سے وہ قطعی بری الذمہ ہیں- وسط ایشیا میں موجود غیر ملکی صحافیوں اور سفارت کاروں نے بھی نہ صرف مجھے مسلسل وقت دیا بلکہ اپنی بصیرت اور معلومات سے بھی نوازا-

دوحضرات، برنیٹ روبن اور اولیور رائے کے وسیع مطالعے، مشاہدے اور برسوں پر محیط باہمی دوستی کی وجہ سے، میں ان کا علیحدہ ذکر کرنا چاہوں گا- ان کے بہت سے تصوررات، ان سالوں میں، مجھ میں اس طرح جذب ہوئے ہیں کہ میں ان کے اور اپنے تصورات میں تفریق تک نہیں کرسکتا- اگر میں کہیں ان کے تصورات کو اپنا بنا کر پیش کر رہا ہوں تو امید ہے کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے-

میں تاجکستان میں اقوام متحدہ کے بحالی امن کے دفتر سے منسلک آئیو پٹیروف اور ہروشی نگاہاشی اور افغانستان میں اقوام متحدہ کے خصوصی مشن کے لخدار براہمی اور فرانسس وینڈرل کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا- جن کی مہربانی، مہمان نوازی اور تجربے سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا- ان حضرات نے افغانستان اور تاجکستان، دونوں کے بحران سے آگہی کے لئے میری کوششوں میں عملی مدد کی- مثلاً انہوں نے اقوام متحدہ کے جہازوں کے ذریعے میری رسائی ان مقامات تک بھی ممکن بنائی، جہاں پہنچنا ناممکنات میں سے ہوتا- لکھاری اورکوہ پیما نینسی اور جان بوچرڈ، انتہائی غیر متوقع انداز میں، معاون اور دوست بن کر سامنے آئے- ادارہ برائے تیکنیکی تعاون وترقی کے مسلسل مستعد سربراہ فریڈرک رسل نے

پرانی دوستی نبھاتے ہوئے انتہائی مشکل مواقع پر ضروری امداد فراہم کی۔

میں اپنے پبلشرز کا بھی ازحد ممنون ہوں، جنہوں نے وسط ایشیا کے متعلق تحقیق میں مجھے وقت، فنڈز اور میرے مضامین کے لئے جگہ فراہم کئے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ میں ____ شروع کے زمانے میں، ان کے معدودے چند قارئین کی دلچسپی کے لئے ____ دنیا کے اس دور دراز علاقے میں کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ ان برسوں میں، میں نے اپنے قارئین کو علاقے کے بارے میں حتی الامکان معلومات مہیا کرنے کی کوشش کی۔ فار ایسٹرن اکنامک ریویو کے دیرینہ مدیروں ناہن چندا اور مائیکل وائٹ کیولٹس نے مجھے بیس سال تک، اپنے میگزین میں وسط ایشیا پر مضامین کے لئے جس طرح جگہ دی اور میرے تجزیوں کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں اٹھایا، میرے بعض صحافی ساتھیوں کے لئے وہ انتہائی قابل رشک ہے۔ کئی دفعہ یہ ہوا کہ میں وسط ایشیا کے ایک طویل سفر کے بعد لوٹا اور انہیں بتایا کہ میرے پاس ایک پیچیدہ کہانی ہے جس کی وضاحت ممکن نہیں اور انہوں نے ہمیشہ مجھ پر اور میری تحریروں پر اندھا اعتماد کیا۔

لندن کے ڈیلی ٹیلی گراف اور اس سے بھی پہلے ''انڈی پینڈنٹ'' کو وسط ایشیا کے متعلق آگہی کی اہمیت کا بھرپور اندازہ تھا۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے موجودہ غیر ملکی مدیر ایلک رسل خود بھی علاقے کے مستند تجزیہ نگار بن گئے ہیں۔ انہوں نے بھی میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ پاکستان میں، میں ''دی نیشن'' اخبار کے عارف نظامی کا ممنون ہوں جنہوں نے علاقے کے بارے میں میرے مضامین چھاپے اور پاکستانی قارئین تک میرا یہ تصور پہنچانے میں میری مدد کی کہ وسط ایشیا اور افغانستان کے مشاہدے کے، ایک سے زیادہ طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔

ورلڈ پالیسی جرنل کے مدیر کارل ای میئر کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ انہوں نے مجھ سے وسط ایشیائی جمہوریاؤں کی آزادی کے پہلے دس سال پر آرٹیکل لکھنے کی فرمائش کی اور ان کی مدیرہ منتظمہ مہربان لنڈا رنگلے کا بھی شکریہ، جنہوں نے نہ صرف میرے دو مضامین شائع کئے بلکہ کمال عنایت سے مجھے ان میں سے کچھ مواد یہاں استعمال کرنے کی اجازت بھی دی۔ یہ کتاب ایڈٹنگ کے لئے ابھی ییل یونیورسٹی پریس میں گئی ہی تھی کہ پینٹاگان اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ ہوگیا۔ وسط ایشیا کی صورت حال کو اچھی طرح سمجھنے کی فوری ضرورت کو،

ان المیہ واقعات نے اور بھی اجاگر کیا ہے۔ میں اپنی مدیرہ لاریزا ہائی مرٹ کا، جنہوں نے مجھے اس کتاب کی تکمیل پر لگائے رکھا اور مسلسل میری حوصلہ افزائی کی اور لز پیلٹن کا، جنہوں نے میری پہلی کتاب طالبان اور موجودہ کتاب کو عوام تک پہنچانے کے لئے انتھک محنت کی، بہت ممنون ہوں اور مدیرہ مسودہ سوسن لیٹی کا خصوصی طور شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنہوں نے انتہائی احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ نہ صرف ایڈیٹنگ کی بلکہ ایڈیٹنگ کا مشکل کام شروع کرنے سے پہلے، وسط ایشیا کے متعلق خود آ گہی حاصل کرنے کی زحمت بھی اٹھائی۔

یہ کتاب میری بیوی انجلیز اور ہمارے دونوں بچوں کے تعاون کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ گھر سے میری مسلسل غیر حاضری کے باعث خصوصاً انہیں بے پناہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کا کوئی مناسب طریقہ شاید ہے ہی نہیں۔

لاہور

اکتوبر 2001ء

15

باب 1 تعارف

وسط ایشیا کے مجاہدین

اسلام کی تاریخ تبدیلی اور مطابقت کی کہانی سے عبارت ہے- اسلامی تاریخ میں وقتاً فوقتاً ایسی تحریکیں اٹھتی رہی ہیں جو اسلامی عقیدے کی ماہیت اور مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتی تھیں- ساتویں صدی سے ہی پیغمبر اسلام کے پیروکار، اسلام کا پیغام پھیلانے کے لئے، پوری معلوم دنیا میں ہر جگہ پہنچ گئے تھے- وسطِ ایشیاء کے خانہ بدوش مسلم قبائل کے لئے یورپ اور ایشیاء کے وسیع و عریض میدان اور بلند و بالا پہاڑ کبھی اجنبی نہیں رہے، کبھی وہ قدیم شاہراہ ریشم پر، اشیائے تجارت لئے، کاروانوں کی صورت میں مغرب کی طرف جا رہے ہوتے اور کبھی ان کے مسلح لشکر فتوحات کی شکل میں ان خطوں پر قابض ہو رہے ہوتے- خانہ بدوش فاتحین سلطنت پر قبضہ کر کے، اس کی شکل بدل ڈالتے لیکن وقت کے ساتھ، وہ خود بھی شہری بود و باش اختیار کر کے مقامی رنگ میں ڈھل جاتے- پھر کوئی نیا خانہ بدوش مسلمان فاتح حملہ آور ہوتا اور ان علاقوں پر قابض ہو جاتا- ان فاتحین کے ہمراہ جو مذہبی، سیاسی اور سماجی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتیں، عموماً ان کے پیچھے جہاد کا تصور کارفرما ہوتا-

ازمنۂ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں سے متاثر مغربی سوچ ــــــ مقدس جنگ کے بارے میں عیسائیت کے اپنے نظریئے کے مطابق ــــــ ہمیشہ یہی رہی کہ اسلام میں کافروں کے خلاف کی جانے والی جنگ ہی دراصل جہاد ہوتی ہے- مغربی مفکر آٹھویں صدی میں مُور مسلمانوں کے ہاتھوں اسپین کی فتح اور تیرہویں صدی سے اٹھارویں صدی کے دوران وسیع و عریض عثمانی سلطنت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس دوران ہونے والی خون ریزی پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے ہیں- وہ نہ صرف اس دوران ہونے والی عظیم سائنسی اور فنی کامیابیوں اور مسلم حکمرانوں کے قابلِ تعریف تحمل و برداشت کو نظر انداز کر جاتے ہیں بلکہ ان مملکتوں میں پرامن انداز سے پہنچنے والے جہاد کے حقیقی تصور کو بھی فراموش کر دیتے ہیں- جنگ جوئی جہاد کی روح ہرگز نہیں ہے-

نبی کریمؐ کی وضاحت کے مطابق افضل جہاد، سب سے پہلے خود اپنے باطن میں جھانکنا ہے- اسی طرح انسان بہتر انسان بننے کی کوشش کرتا ہے- اس عمل سے گزر کر مجاہد اپنے قبیلے یا معاشرے کے لئے بھی مفید ہوسکتا ہے- علاوہ ازیں جہاد ہر مسلمان کیلئے اطاعتِ خداوندی اور دنیا میں اس کے احکامات پر عمل درآمد کا امتحان ہے-''اخلاقی نظم وضبط کے لئے باطنی جدوجہد اور اسلام اور اس کے سیاسی عمل سے واضح وابستگی کا نام جہاد ہے-'' یہ بھی درست ہے کہ اسلام غیر منصف حکمران کے خلاف، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، بغاوت کی اجازت دیتا ہے- اس طرح جہاد سیاسی اور سماجی جدوجہد کو متحرک کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے- یہ ادنیٰ جہاد ہے- نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ سے افضل اور کم تر، دونوں طرح کے جہاد کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں- ایک جانب انہوں نے مسلمانوں کے لئے مثالی زندگی کا نمونہ پیش کیا اور اپنے خالق سے مکمل وابستگی کے اظہار کے لئے تمام زندگی خود کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد کی اور دوسری جانب کرپٹ عرب معاشرے سے اس کے اندر رہتے ہوئے جنگ بھی کی- معاشرے کو بدلنے کے لئے ہر راستہ اور طریقہ استعمال کیا- جنگ بھی ان میں سے ایک راستہ تھا-

افغانستان کے طالبان ہوں یا اسامہ بن لادن کا عالمی نیٹ ورک القاعدہ یا ازبکستان کی اسلامی تحریک، تمام عالمی جہادی تحریکیں، نبی اکرمؐ کے مجوزہ افضل جہاد سے صرفِ نظر کر کے، کم تر جہاد کو سیاسی اور سماجی فلسفے کے طور پر اختیار کر رہی ہیں- تاہم کوئی بھی اسلامی

نظریہ یا روایت ـــــــ نسلی، گروہی یا اعتقاد کی بنیاد پر ـــــــ کسی ایسے جہاد کی اجازت نہیں دیتا جس میں معصوم غیر مسلم مردوں، عورتوں اور بچوں یا اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہایا جائے- معصوم لوگوں کے قتل عام کو منصفانہ ثابت کرنے کی خاطر، جہاد کی یہی گمراہ کن تعریف جزوی طور پر، موجودہ انتہا پسند اسلامی تحریکوں کے انقلابی بنیاد پرستی کے خطوط اجاگر کرتی ہے-

ان جدید مسلمان بنیاد پرستوں کو اپنے تصوراتی معاشرے کو عملاً منصفانہ بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں، نہ ہی انہیں اپنے پیروکاروں کو ملازمت مہیا کرنے اور ان کی تعلیمی یا سماجی بہبود سے کوئی غرض ہے- انہیں مسلمان ملکوں میں موجود، مختلف الاعتقاد گروہوں کے مابین باہمی ربط و ضبط اور صلح جوئی کی فضا قائم کرنے کی اہمیت کا احساس بھی نہیں- ان جہادی گروہوں کے پاس مستقبل میں تشکیل پانے والی اسلامی حکومتوں کے لئے نہ کوئی معاشی منشور ہے اور نہ بہتر حکومتی ڈھانچہ- سیاسی اداروں کی تعمیر کا منصوبہ ہے اور نہ ہی فیصلہ سازی کے عمل میں عوامی شراکت کا کوئی بلو پرنٹ- حکمرانی کے لئے وہ جمہوری طور پر بنائی گئی کسی تنظیم یا پارٹی کے بجائے، صرف ایک کرشماتی لیڈر، امیر پر انحصار کو کافی سمجھتے ہیں- ان کا خیال ہے کہ اس کی سیاسی صلاحیتوں، تعلیم یا تجربے کے بجائے اس کا کردار، پارسائی اور خلوص، نئے معاشرے کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں- طالبان کے ملاّ محمد عمر، القاعدہ کے اسامہ بن لادن اور مسلم ازبک تحریک کے نعمان غنی، اسی مسلک کا مظہر ہیں-

یہ نئے جہادی گروہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے بھی خاصے سرگرم ہیں- تاہم یہ شریعت کو ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے، محض ذاتی رویوں کو منضبط کرنے اور اوڑھنے پہننے کے طور طریقوں کا ضابطہ سمجھتے ہیں- یہ وہ تصور ہے جو صدیوں پرانی روایات، ثقافت، تاریخ کو ہی نہیں بلکہ خود دین اسلام کی شکل بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے- طالبان القاعدہ اور ازبک مسلم تحریک کا انداز فکر، پچھلے چودہ سو سالوں میں ارتقا پانے والے تمام تاریخی تجربات، سائنسی مشاہدات اور مسلم اور غیر مسلم معاشرے میں فروغ پذیر مختلف النوع علوم کی افادیت پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے- چنانچہ طالبان نے عورتوں اور اقلیتی نسلی گروہوں پر ناروا پابندیوں اور مہاتما بدھ کے مجسموں کی تباہی کو منصفانہ ظاہر کرنے کے لئے افغانستان کی تاریخ کو از سرِ نو لکھنے کی کوشش کی ہے- ان جہادی گروپوں کا نیا اسلامی

نظام، اپنے شہریوں کو، محض ایک جابرانہ فوجداری ضابطہ دیتا ہے- اس میں کہیں بھی اسلام کی حقیقی اقدار، انسانیت نوازی اور روحانیت اجاگر نہیں ہو پاتیں- اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات مسلمانوں کو ایسی روحانی غذا فراہم کرتی ہیں جس کے ذریعے تقویت حاصل کر کے، وہ نہ صرف اپنے باطن کو پہچان سکتے ہیں بلکہ موجودہ، ہر لمحہ بدلتی، پیچیدہ دنیا میں معنویت بھی تلاش کر سکتے ہیں مگر نئے جہادی گروہوں نے اسلام کو صرف داڑھی کی لمبائی اور برقع پوش خواتین کے ٹخنوں کی عریانی جیسے سوالات تک محدود کر ڈالا ہے-

گیارہ ستمبر 2001ء سے پہلے مسلم بنیاد پرستی کی طویل تاریخ کا یہ نیا باب مغربی دنیا کی عمومی عدم توجہی کا شکار تھا- اس روز نیویارک اور واشنگٹن میں رونما ہونے والے بے مثال واقعات ــــــ جن میں افغانستان میں تربیت شدہ القاعدہ کے انیس مجاہدوں نے چار امریکی ہوائی جہازوں پر کنٹرول حاصل کر کے، ان میں سے تین کو امریکہ کے تجارتی اور فوجی مراکز سے ٹکرا کر، تقریباً چھ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ــــــ نے دنیا کو ہمیشہ کے لئے بدل کر رکھ دیا- جس طرح بیسویں صدی نازی ازم اور سرد جنگ سے عبارت ہے، اسی طرح اکیسویں صدی دہشت گردی کے خلاف مہذب اقوام کی جنگ کی صدی کہلائے گی-

لیکن ان حملوں کو محض دہشت گردی کا عمل قرار دینے سے، مسلم دنیا میں کارفرما چھوٹے چھوٹے انتہا پسند گروہوں کے سیاسی محرکات سے صرفِ نظر ہو جاتا ہے- سات اکتوبر کو جب امریکی قیادت میں الائنس نے طالبان کے دفاعی ٹھکانوں اور القاعدہ کے تربیتی کیمپوں پر بمباری شروع کی تو بعض رپورٹوں میں ازبک مسلم تحریک کے رہنما جمعہ نعمان غنی کے متعلق یہ اطلاعات آئیں کہ وہ شمالی افغانستان میں، طالقان کے علاقے میں طالبان کی دفاعی افواج کی کمانڈ کر رہے ہیں- بہت سے بنیاد پرست مسلمان گروپوں نے طالبان کے ساتھ مل کر آپریشنل مراکز قائم کئے ہوئے ہیں- جن کی جانب ابھی تک دنیا کی توجہ مبذول نہیں ہوئی، ان میں سے ازبک مسلم تحریک سب سے بڑا خطرہ نظر آتی ہے- کیونکہ وہ ازبکستان کے صدر اسلام کریموف کی ہمسایہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے- اس طرح جہاد کے اثرات براہِ راست وسطِ ایشیا میں پہنچ جائیں گے-

قازقستان، کرغیزستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان کے ممالک پر مشتمل، وسطِ ایشیا کا یہ علاقہ تقریباً عالمی میدان جنگ بننے ہی جا رہا ہے- اس کی دو ہزار سالہ تاریخ اسی

طرح کی جنگوں سے عبارت ہے کیونکہ ماضی کی عظیم سلطنتیں یورپ اور ایشیا کو ملانے والے تجارتی راستے، شاہراہ ریشم پر قبضہ جمانے کے لئے برسر پیکار رہتی تھیں۔ (غالباً رومن سلطنت واحد استثناء ہے، جس کی وسطِ ایشیاء پر حکمرانی نہیں رہی) لیکن موجودہ تصادم کی نوعیت ماضی کی جنگوں سے قطعی مختلف ہے کیونکہ یہ صورتِ حال سوویت یونین کی بپا کردہ انقلابی تبدیلیوں اور1991ء میں اس کی تحلیل سے پیدا شدہ انتشار اور افراتفری کا براہِ راست نتیجہ ہے۔

سوویت کمیونسٹ نظام سے آزادی کے بعد وسطِ ایشیا کے عوام کی اکثریت میں، فوری طور پر، جمہوریت، کھلی معیشت یا مغربی ثقافت اور صارفانہ رجحان کے لئے وہ جوش وخروش دیکھنے میں نہیں آیا جو سابقہ سوویت یونین کی دوسری جمہوریتوں مثلاً روس اور بالٹک ریاستوں میں اپنے عروج پر تھا۔ اس کے بجائے اسلامی احیاء کی تحریک نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سوویت سسٹم کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ کیمونزم اور مذہب کی ایک دوسرے سے قطعی کوئی مطابقت نہیں اور کمیونسٹوں نے اندرونِ ملک مذہب کی ہر شکل کو باقاعدہ طریق کار کے تحت دبانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سوویت سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی، وسط ایشیا کے عوام نے، جو گزشتہ چوہتر سال سے اپنا عقیدہ مخفی رکھنے پر مجبور تھے_____ موقع غنیمت جانا اور اپنے اسلامی ماضی کے ساتھ روحانی اور ثقافتی تعلق کو دوبارہ جوڑنا شروع کر دیا۔ اسلامی تشخص کی بحالی نہ صرف ان کی مذہبی اور ثقافتی پہچان کا مسئلہ تھا بلکہ جنوب کی ہمسایہ مسلم ریاستوں سے اپنائیت اور یگانگت کو بحال کرنا بھی تھا، جسے سٹالن کے دور میں بیرونی دنیا سے علیحدگی کے نام پر ختم کر دیا گیا تھا۔ پاکستان، سعودی عرب، ترکی اور دوسری ریاستوں سے آزاد وسطِ ایشیائی جمہوریتوں کا سب سے پہلے دورہ کرنے والے مسلمان علماء اور رہنما تھے، جنہوں نے یہاں سینکڑوں نئی مساجد کی تعمیر میں معاونت کی اور روسی اور دیگر مقامی زبانوں میں تراجم والے قرآن مجید کی جلدیں بلا قیمت تقسیم کی گئیں۔ اپنے تشخص اور ورثے کی ازسرِ نو دریافت کے اس موقع کو وسطِ ایشیا کے لاکھوں عوام نے دلی طور پر قبول کیا۔ اس ذاتی شناخت اور تہذیبی ورثے کا ہر تعلق وہ انتہائی اپنائیت کے ساتھ اسلام سے جوڑ رہے تھے۔

آزادی کے پہلے سال، جب میں نے اس علاقے کا دورہ کیا تو مقامی باشندوں کے

جذبے اور جوش وخروش پر حیرت زدہ رہ گیا- وہ اپنی وادیوں اور پہاڑی دیہاتوں سے دور اسلامی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے خواہاں تھے- ایران میں1979ء کے اسلامی انقلاب، اسرائیل کے خلاف فلسطینی مزاحمت یا کشمیر، الجزائر، مصر اور فلپائن میں مجاہدین کی جنگی سرگرمیوں کے بارے میں، انہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا- بہت سے لوگ نماز اور دوسرے اسلامی فرائض بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے حالانکہ اس دور میں بھی خانہ بدوش مبلغین کی زیرزمین تحریک،صوفیاء اور اساتذہ نے مذہبی روایات اور ان سے پیدا شدہ ثقافتی اور سماجی تصورات کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن جدوجہد کی تھی-

وسطِ ایشیائی عوام کے مشاہدے میں ایک بات بہرحال تھی اور وہ تھی افغانستان پر 1979ء کا روسی حملہ اور نتیجتاً دس سال تک جاری رہنے والی جنگ- اس علاقے کے ہزاروں جوانوں کو روسی افواج میں بھرتی کر کے افغان مجاہدین سے لڑنے کے لئے بھیجا گیا تھا- سوویت توقعات کے برعکس، بہت سے جوان فوجیوں نے، واپس اپنے گھروں میں جا کر، اپنے مخالفوں کی قربانیوں اور اسلامی جذبے کی متاثر کن کہانیاں، تعریفی انداز میں بیان کیں- حالانکہ ان کے بہت سے کمانڈروں کی نعشیں آہن پوش کفن میں واپس گئیں، لیکن زندہ بچ نکلنے والے' مجاہدین کی کامیاب گوریلا کاروائیوں اور اپنی ہی سوویت افواج کی عظیم قوت کا جرات و بہادری سے مقابلہ کرنے پر، افغان مسلمانوں کا ذکر انتہائی فخر کے ساتھ کر رہے تھے- چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے، پچھلی نسل کے لوگ افغانوں کا تقابلی جائزہ، اپنے ان مجاہدین کے ساتھ کرتے جنہوں نے1917ء میں بالشویک انقلاب کے خلاف، کوئی ایک عشرے تک مزاحمت جاری رکھی تھی- سوویت افواج اور ان کے نظام کے خلاف یہاں کے عوام کی نفرت قدرتی تھی- دوران جنگ یہ حقیقت اور زیادہ ابھر کر سامنے آئی کہ مقابل عوام سے ان کے گہرے مذہبی اور لسانی رشتے موجود ہیں اور اس احساس کو شدید تقویت ملی کہ سوویت نظام نے انہیں ان کے مشترکہ ورثے اور قومی تفاخر سے صریحاً کاٹ کر رکھ دیا ہے-

آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی، وسطِ ایشیاء کے عوام نے، آزادی کی ہمہ ہمی اور مذہبی جوش وخروش کے ماحول میں یہ محسوس کیا کہ ان کی کمزور ریاستوں کا سیاسی اور معاشی مستقبل اور اسلامی احیاء کا مستقبل، دونوں ہی ان کی حکومتوں کی پالیسیوں اور عملی کار گزاریوں کے تحت طے پائیں گے- حکمران مقبول اسلامی روایات اور جمہوریت کو اپنا کر،

تحمل اور برداشت کی ثقافت کے ساتھ، وسیع اسلامی دنیا میں شامل ہونا چاہیں گے یا وہ کمیونزم کی جابرانہ سیاسی، سماجی اور مذہبی پالیسیوں پر کاربند رہیں گے اور اس طرح عوامی مزاحمت میں اضافے کو یقینی بنا دیں گئے؟ اس طرح کے نازک فیصلے ہی یہ طے کریں گے کہ آیا وسطِ ایشیائی ممالک استحکام اور ترقی کی جانب قدم بڑھاتے ہیں یا عدم استحکام اور خانہ جنگی کا شکار ہوتے ہیں؟

انتخاب کا موقع تو تھا مگر جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ کرغیزستان کے صدر عسکر آقایوف کے سوا، تمام وسطِ ایشیائی قائدین، کمیونسٹ مزاج رکھنے کے باوصف، ان مختلف آپشنز پر غور کرنے کے لئے تیار ہی نہیں- ان مرکزیت پسند، شاہانہ کروفر والے قائدین اور حکمران طبقے نے اپنا پرانا جانا پہچانا راستہ، یعنی اختلاف رائے، جمہوریت، عوامی ثقافت اور بالآخر اسلامی احیاء کو بزور طاقت دبانے کا راستہ اختیار کیا- (کرغیزستان کے حکمران طبقے کی اکثریت بھی پرانی کمیونسٹ حکومت کی پروردہ ہی تھی-)

وسطِ ایشیاء کا دنیا کے نقشے پر ظہور، اپنے ساتھ کئی عالمی تنازعات بھی لایا- علاقے میں تیل اور گیس کے بے بہا ذخائر _____ جن کی طرف روس نے، روسی سائبیریا کے قدرتی وسائل کی وجہ سے، کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی _____ روس، امریکہ اور ایران، ترکی، پاکستان اور چین کے متصادم مفادات کی بدولت میدانِ جنگ کی شکل اختیار کر گئے- تجزیہ نگاروں نے اسے فوراً ہی ''نئے عظیم کھیل'' کا نام دے دیا- (انیسویں صدی کی زار شاہی سلطنت اور برطانیہ کے درمیان، وسطِ ایشیاء کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں حریفانہ کوششوں کے بعد) روس، چین اور امریکہ نے یہاں سے پائپ لائینیں قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی- اس طرح وہ نہ صرف مقامی قدرتی وسائل تک رسائی حاصل کر لیتے بلکہ وسطِ ایشیا کے عوام میں اپنا حلقہ اثر بنا لینے میں بھی کامیاب ہو جاتے-

افغانستان نے، جو پوری سرد جنگ کے دوران امریکی روسی مخاصمت میں، محض ایک پیادہ بنا رہا تھا سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بھی، خود کو کم وبیش اسی صورتِ حال میں پھنسا پایا- تاہم روسی مداخلت کے دوران، پاکستانی سیکرٹ سروس کے ذریعے حاصل شدہ امریکی امداد نے، انتہا پسند مجاہدین کو ایک نئی راہ سجھا دی جس نے صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا- طالبان نامی ایک نئے گروہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ایک ایسی انتہا پسند مسلم

بنیاد پرستی کا ماڈل بنانے کی کوشش کی جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

سعودی انتہا پسند اسامہ بن لادن کی مالی اور فوجی امداد نے طالبان کے زیر حکمرانی افغانستان میں ہر علاقے کے مجاہدین کو ایک ٹھکانہ فراہم کر دیا، جہاں وہ طالبان افواج کے ساتھ ضروری تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس جا کر، عدم استحکام اور انتشار پھیلانے کا کام سرانجام دے سکتے تھے۔

وسطِ ایشیا کی حکومتوں کی کوتاہ نظری اور سخت پالیسیاں بھی مجاہدین کے مقاصد کے لئے مدد و معاون ثابت ہوئیں۔سوویت معاشی معاونت کھو دینے کے باوجود ان ممالک کی قیادت نے جمہوری اور معاشی اصلاحات کی اہمیت سے انکار کیا اور ساتھ ہی ماضی کی جابرانہ پالیسیاں بھی جاری رکھیں، جن کے نتیجے میں اعتدال پسند اور سیاسی مصلحین بھی انقلابیوں کے کیمپوں میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ وسطِ ایشیائی حکمرانوں نے بار بار اسلامی سرگرمیوں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا، جس میں سرگرم مذہبی لوگوں کے ساتھ، ہزاروں عام مسلمانوں کو بھی جیلوں میں ڈال دیا گیا، انہیں اذیتیں دی گئیں اور ملک کے دور دراز علاقوں کی جیلوں میں طویل عرصہ کی سزائیں سنا کر بھیج دیا گیا۔1992ء سے1995ء تک پانچ سال کے دوران مسلمان باغیوں اور تاجک جمہوریت پسندوں کی تاجک حکمرانوں کے خلاف زبردست خانہ جنگی کے نتیجے میں پچاس ہزار سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں۔

تاجکستان میں جنگ کے خاتمے کے ساتھ ایک نئی امید روشن ہوئی۔ حکومت اور باغیوں کے مابین معاہدہ امن کے ذریعے، ایک نمائندہ مخلوط حکومت قائم ہوئی، لیکن چار سالہ معاشی مشکلات اور ہمسایہ ازبکستان کے انتہا پسندوں کی مداخلت اس کے لئے مسلسل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ تاہم ان سطور کو تحریر کرتے وقت بھی یہ حکومت قائم ہے اور ایک جمہوری طور پر منتخب حکومت ـــــ جس میں تمام قانونی اسلامی جماعتیں شامل ہیں ـــــ کا یہ ماڈل سارے وسطِ ایشیا کے لئے امن و استحکام کی حقیقی امید ہے۔

تاجکستان کے استحکام کو سب سے بڑا خطرہ اور خود وسط ایشیا کو بھی ازبک مسلم تحریک سے ہے۔ جماعت احیائے اسلام کی اعتدال پسندی سے غیر مطمئن ہونے کے بعد، مسلم انتہا پسندوں نے یہ تحریک1998ء میں شروع کی۔ انہوں نے وسطِ ایشیا کے مرد آہن اسلام کریموف کی حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کیا۔ ازبک تحریک نے وسطِ ایشیا کی حکومتوں کے

خلاف2001-1999ء کے دوران تاجکستان اور افغانستان کے ٹھکانوں سے متواتر گوریلا حملے جاری رکھے- جمعہ نعمان غنی کی کرشماتی فوجی قیادت میں ازبک تحریک نے جہادی سرگرمیاں پورے وسطِ ایشیاء میں پھیلا دی ہیں-

نعمان غنی کی مسلسل گوریلا کارروائیوں کا بنیادی ٹارگٹ وادی فرغانہ ہے، جو اس وقت ازبکستان، کرغیزستان اور تاجکستان کی تین ریاستوں میں منقسم ہے- ان میں سے ہر ملک براہِ راست فوجی تصادم کی زد میں ہے- اسی خطرے کو بھانپتے ہوئے قازقستان جیسے ملک بھی، جہاں کوئی جنگی مزاحمت موجودنہیں، کسی بھی توسیع شدہ جنگ کے متوقع خطرے کے مقابلے کے لئے اپنے فوجی اخراجات میں اضافہ کر رہے ہیں- دریں اثناء امریکہ، روس اور چین کے مابین اپنا اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لئے، مقابلے کا ایک نیا راوَنڈ شروع ہو گیا ہے- علاقے کے مستقبل کے منظر نامے کی تشکیل کے لئے یہ طاقتیں فوجی امداد، ایڈوائزر اور گوریلا سرگرمیوں سے مقابلے کی تربیت فراہم کر رہی ہیں- لیکن یہ بڑی طاقتیں ان ممالک میں موجود خوفناک معاشی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کی بہتری کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھا رہیں- ان کے حکمرانوں کو اپنی جابرانہ پالیسیوں پرعمل درآمد کی مکمل چھٹی ہے- (یہ بات گیارہویں باب میں زیر بحث آئے گی کہ سات اکتوبر کی بمباری کے بعد سے ازبکستان کے کریموف نے ____ امریکی فوجی الائنس کے ایک لازمی اتحادی کی حیثیت میں اپنی پوزیشن مستحکم کر کے ____ انسانی حقوق کی پامالی کی انتہا کر دی ہے-)

نتیجہ یہ ہے کہ ازبک اسلامی تحریک کوفروغ حاصل ہو رہا ہے- نعمان غنی، وسطِ ایشیا کے تمام انتہا پسندوں، یہاں تک کہ چیچنیا، داغستان (کاکیشیا) اور چینی مسلم صوبے زن جیانگ کے اوئی غرز علاقے کے افراد کو مجتمع کر رہے ہیں- علاقائی حکومتوں کا تختہ الٹنے اور شریعت کے نفاذ جیسے مقاصد کے حوالے سے ازبک مسلم تحریک نے بلاشبہ کثیر قومی جماعت کی شکل اختیار کر لی ہے- اس سارے علاقے میں اس کی حمایت بڑھتی جا رہی ہے- سعودی عرب کی مالی معاونت کے ساتھ ساتھ، افغانستان سے منشیات اور اسلحہ کی تجارت بھی ان کے لئے فنڈز کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے-

ایک اور مقبولِ عام تحریک حزب التحریر (اسلامی آزادی کی جماعت) بڑی تیزی سے وسطِ ایشیا میں جڑیں پکڑ رہی ہے- ازبک مسلم تحریک اپنے حقیقی مقاصد کے بارے میں بہت

کم اظہار کرتی ہے لیکن حزب التحریر اپنے اغراض اور مقاصد کے متعلق بے تحاشا لٹریچر پھیلا رہی ہے- ان کی ویب سائٹ(www.hizb-ut-tahrir.org) بھی موجود ہے- ازبک مسلم تحریک کے برعکس، حزب التحریر ــــ جس نے وسطِ ایشیا میں اعلان جہاد کر دیا ہے ــــ وسطِ ایشیائی ریاستوں کو متحد کرنا چاہتی ہے- اس کا حتمی مقصد تمام دنیائے اسلام کو متحرک کر کے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد تشکیل پانے والی خلافت کی طرز پر اسلامی خلافت کا احیاء ہے- وہ اس سلسلے میں غیر متشددانہ ذرائع کے استعمال پر یقین رکھتی ہے- لیکن حزب بھی ازبک مسلم تحریک کی طرح خلافت کے انتظام کے لئے سماجی، معاشی یا سیاسی منصوبہ بندی کے عمل اور اہمیت سے بالکل غافل ہے- تاہم اس کے یوٹو پیائی مقاصد علاقے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں- حکمران چونکہ تمام مسلمانوں کو ہی جہادی سمجھتے ہیں، اس لئے حزب کے حامیوں سے جیلیں بھری جا رہی ہیں-

اگر چہ ریاستی تشدد کا ہر عمل ان تحریکوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل رہا ہے، ان کے حقیقی پیغام کی شکل تبدیل ہوتی جا رہی ہے، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ازبک تحریک اور حزب التحریر کے نظریات وسطِ ایشیا کی مسلم روایات اور ثقافت سے ہم آہنگ نہیں- وہ صوفیا کے اسلامی تحمل و برداشت اور انیسویں صدی میں پروان چڑھنے والی جدید اسلامی معنویت سے قطع نظر درآمدی تصورات کو اپنی جدوجہد کی بنیاد بناتے ہیں- ان کی یہ انتہا پسندی افغان طالبان، پاکستان کے جہادی مدرسہ کلچر (جہاں ان تحریکوں کے کارکنوں نے تعلیم حاصل کی) اور سعودی عرب کے انتہا پسند وہابی نظریئے کے زیر اثر پروان چڑھی- وسطِ ایشیا کی اسلامی روایت اور تاریخ کے برعکس اجتہاد (نظریات کی جدید معنویت اور ان پر اجماعِ امت) کی بجائے سادہ ترین شکل کے جہاد کو ان گروہوں نے اپنا بنیادی مقصد قرار دے دیا تاکہ عوامی حمایت کو بھرپور انداز میں متحرک کیا جا سکے-

وسطِ ایشیائی حکمرانوں کی سخت سنسر شپ کی بدولت، ان مسلم تحریکوں کے بارے میں کسی بھی طرح کی معلومات کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں- لیکن افواہ، افسانویت اور کہانی سنانے کی وسطِ ایشیائی روایت نے ان تحریکوں کو رومانی رنگ دے کر ایک نئی اور مختلف حقیقت کو جنم دیا ہے- وسطِ ایشیا کے دیہاتوں میں لوگ مزے لے لے کر بتا رہے ہوتے ہیں کہ جدید اسلحہ لئے اور رات کے منظر کو واضح کرنے والی عینکیں پہنے خوبصورت دوشیزاؤں

پر مشتمل گوریلوں کا ہراول دستہ، کس طرح اپنے دشمن کو دور سے ہی ہلاک یا زخمی کر ڈالتا ہے یا گوریلوں کے سفری تھیلے ڈالروں سے بھرے ہوتے ہیں اور وہ انہیں _____ خوراک مہیا کرنے والے کسانوں میں _____ بے دریغ لٹا رہے ہوتے ہیں- دو گوریلوں نے ازبکوں کی پوری بٹالین کو یرغمال بنا لیا- مسلمان گوریلوں پر صوفیا کا خاص سایہ ہے- ان کے زخم فوراً ٹھیک ہو جاتے ہیں- شہادت کے بعد ان کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی ہوتی ہے- مجاہدوں کو سعودی عرب، پاکستان، ترکی، ایران اور اسامہ بن لادن سے مالی امداد ملتی ہے- اس افسانوی صورتِ حال یعنی کہانیوں میں سے حقیقت کو علیحدہ کرنے کی خواہش نے بھی، جزوی طور پر مجھے یہ کتاب لکھنے کی تحریک دی-

یہ حقیقت بہرحال واضح ہے کہ وسطِ ایشیا کے مسائل بنیادی طور پر داخلی نوعیت کے ہیں اور انہیں صرف ازبک مسلم تحریک کو شکست دے کر حل نہیں کیا جا سکتا- معاشی اصلاحات یا ترقی کا نہ ہونا، جمہوریت یا آزادی رائے کی عدم موجودگی، سوویت نوکر شاہی ذہنیت کا ارتکازِ اختیارات، کرپشن کا بڑھتا ہو کینسر اور عوامی مایوسی جیسے عوامل نے ان ریاستوں کی صورتِ حال کو بے حد مخدوش کر ڈالا ہے- قیادت عمر رسیدہ ہو رہی ہے اور آبادی کی اکثریت نوجوان ہے-50 ملین آبادی کا ساٹھ فیصد 25 سال سے کم عمر لوگوں پر مشتمل ہے- یہ نئی نسل بے روزگار کم پڑھی لکھی اور بھوکی ہے- گرتا ہوا معیارِ زندگی اور آزادی اظہار پر پابندیاں کب تک قابلِ برداشت رہیں گے؟ اگر نوجوان نسل کے مسائل کو حل نہ کیا گیا تو کسی سماجی اور سیاسی دھماکے سے بچاؤ قطعی ناممکن ہو جائے گا- لیکن حکمران اشرافیہ ہر قیمت پر اقتدار سے چمٹی رہنا چاہتی ہے- ان کی علاقائی رقابتوں، مخاصمتوں اور باہمی مقابلہ بازیوں نے انہیں بنیادی خود حفاظتی قدم اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا- وسطِ ایشیائی عوام کی حالتِ زار بہتر کرنے کے لئے مشترکہ منڈی کا قیام تو دور کی بات ہے، وہ تو علاقے میں امن وسکون کے لئے مشترکہ حفاظتی بیلٹ تک بنانے پر رضامند نظر نہیں آتے-

دریں اثناء مذہب اور نسل کا معاملہ کسی آتش فشاں سے کم نہیں- وسطِ ایشیا اس وقت ثقافتی خلا کا شکار ہے، جسے مغربی ثقافت کی نقالی کر کے پُر نہیں کیا جا سکتا- وسطِ ایشیا کے حکمران پوری اسلامی دنیا کو فیض یاب کرنے والے اپنے ثقافتی ورثے کو نظر انداز کر کے اپنے عوام کو گویا اپنے ہی ماضی سے منسلک، اپنے جدید تشخص کو جنم دینے سے روک رہے

ہیں- یہ حکومتیں روایتی اسلام، جمہوریت اور نسلی ہم آہنگی کو رواج دینے سے انکار کر کے درحقیقت انتہا پسندی کی آگ پر تیل چھڑک رہی ہیں-

وسطِ ایشیا کے حکمرانوں کو اس رجحان کو بدل ڈالنے کا ایک اور موقع ملا ہے- طالبان اور اسامہ بن لادن کے خلاف، امریکہ کی زیرِ قیادت اتحاد میں شریک ہو کر، انہیں تبدیلی، معاشی ترقی اور جمہوریت کی جانب گامزن ہونے کا ایک شاندار موقع حاصل ہوا ہے- مغرب، روس اور چین کو زیرِ احسان لا کر، مستقبل میں قدرتی ذرائع کی ترقی، نئے سیاسی اداروں کی تشکیل اور بہتر عوامی زندگی کے معاملات میں ان سے بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے- موقع موجود ہے، یہ اب وسطِ ایشیا اور دنیا پر منحصر ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں-

پہلا حصہ

وسط ایشیا میں اسلام اور سیاست

ماضی اور حال

باب 2

فاتحین اور بزرگانِ دین

حال سے مشابہ ماضی

وسطِ ایشیا پر کنٹرول کے خواہاں مختلف نسلی، سیاسی اور مذہبی عناصر کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود وسطِ ایشیائی تہذیب- پانچویں صدی قبل مسیح سے، جب داریوش اول نے ماورالنہر (موجودہ ازبکستان اور تاجکستان) کے علاقے کو ایرانی سلطنت میں شامل کیا تھا، 1920ء کے عشرے تک____ جب سٹالن نے اس علاقے کو جبری طور پر پانچ سوشلسٹ جمہوریتوں میں تقسیم کیا، یعنی موجودہ آزاد ریاستوں میں____ وسطِ ایشیا جنگ اور سلطنت، فن اور ثقافت، مذہب اور تجارت کا ایک اہم مرکز رہا ہے-

وسطِ ایشیا کی شاندار تاریخ کی ایک بڑی وجہ اس کی جغرافیائی اہمیت ہے- اس کی وسیع و عریض سرزمین براعظم ایشیا اور یورپ کو باہم ملاتی ہے- چین اور یورپ کو ملانے والی شاہراہ ریشم کی بدولت اسے، پرانے دور میں دنیا کا مرکز سمجھا جاتا تھا- حقیقتاً اس کے کئی راستے تھے، جن کے ذریعے تاجر اونٹ بردار کاروانوں کے ہمراہ ان براعظموں کو عبور کیا کرتے تھے- لیکن ان راستوں کے مسافر صرف ریشم یا مصالحے کی تجارت تک ہی محدود نہیں تھے- انہوں نے کاغذ سازی، بارود اور ریشم سازی جیسی نئی ٹیکنالوجیز کو بھی پھیلایا- نئے نظریات اور مذاہب بھی ان کے جلو میں ہر جگہ پہنچے- قدیم یونانیوں کا مذہب، بدھ مت، یہودیت، زرتشت، نسطوری عیسائیت، ہندومت اور بہت سے اسلامی نظریات نے اپنے اپنے عہد میں

کسی نہ کسی انداز میں، اس علاقے پر گہرے اثرات مرتب کئے- اسلام پر مختلف نظریات کا اثر اور وسطِ ایشیائی سرزمین کے حکمرانوں کا ردِعمل، یہ وہ عوامل ہیں جن کے مطالعہ کے بغیر علاقے کو درپیش موجودہ خطرناک تنازعات سے آگہی ممکن ہی نہیں-

جغرافیے کی اہمیت

وسطِ ایشیا چاروں جانب سے خشکی سے گھرا ہوا ہے- ماضی کی یہ اہمیت اور طاقت، آج اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے- اس کے جنوب میں ایران اور افغانستان ہیں- مشرق میں چین ہے اور شمال اور مغرب میں روس واقع ہے- وسطِ ایشیا کی وسیع و عریض وادیاں (مغرب میں) ایک جانب بحیرہ کیسپین کو چھوتی ہیں تو دوسری جانب، جنوب میں ہندوکش اور پامیر کے پہاڑی سلسلے ہیں- چینی سرحد کے ساتھ تیان شان پہاڑ ہیں- شمالی جانب، جہاں قازق میدان سائبریا سے جا ملتے ہیں، کوئی واضح جغرافیائی سرحدیں موجود نہیں- دو بڑے دریاؤں، دریائے آمو اور دریائے سیر کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے وسطِ ایشیا کو کبھی دو دریاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا تھا- دونوں دریا آرال کے سمندر میں جا گرتے تھے- ان دریاؤں سے پیدا شدہ جغرافیائی، ثقافتی اور سیاسی سرحدوں نے، اس علاقے کو باقی دنیا سے علیحدہ کیا ہوا تھا- یہ علاقہ صرف شاہراہ ریشم کے ذریعے دنیا سے منسلک تھا- دریائے آمو نے، مثال کے طور پر، ترک اور منگول سلطنتوں کو اور جنوب میں ساسانی سلطنت کو تقسیم کیا ہوا تھا اور آزاد افغانستان کے ساتھ ساتھ، برطانوی ہند اور زاروں کی روسی سلطنت کے درمیان، غیر فوجی علاقے کا کام دیتا تھا- حالیہ دور میں یہی دریا طالبان کے افغانستان اور وسطِ ایشیا کے درمیان سرحد بنا رہا- دریائے سیر ہمیشہ وسطِ ایشیائی سلطنت کے لئے سائبریا، منگولیا اور گوبی صحرا کی جانب سے حملوں کے خلاف مضبوط ڈھال بنا رہا ہے-

دریا ہی اس کی قدرتی سرحدیں نہیں- وسطِ ایشیا دنیا کے بلند و بالا پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ واقع ہے: کوہ پامیر نے موجودہ تاجکستان کا 93% حصہ گھیرا ہوا ہے- پامیر کے مشرق اور شمال میں تیان شان پہاڑی سلسلہ چلتا گیا ہے- جنوب مشرق میں ہمالیہ اور جنوب میں ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلے موجود ہیں- افسانوی سیاح مارکو پولو نے 1273ء میں چین جاتے ہوئے پامیر کے پہاڑی سلسلے کو عبور کیا تھا- اس نے اسے دنیا کی چھت قرار دیا تھا- ''پہاڑ در پہاڑ مسلسل چڑھائی، بالآخر آپ ایک ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں، جہاں اردگرد کا

ماحول آپ کو یہ احساس دینے لگتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بلند زمین ہے...... پہاڑ کی بلندی اتنی انتہا تک جا پہنچی ہے کہ اس کی چوٹی پر کوئی پرندہ نظر نہیں آتا- یہاں ایک انتہائی وحشی، غیر مہذب اور عقل سے عاری قبیلے کے افراد ضرور نظر آئے، جن کا گزر بسر جانوروں کے شکار پر ہے اور انہی کی کھالوں کو وہ اپنے لباس کے طور پر استعمال کرتے ہیں-'' یہ تھا مارکو پولو کی یادداشتوں سے ایک نوٹ:

پہاڑوں اور میدانوں کے اس وسیع اور عظیم الشان لینڈ سکیپ کے درمیان دنیا کے دو عظیم صحرا واقع ہیں- جنوب میں ترکمانستان کا زیادہ تر حصہ کم و بیش ایک لاکھ پینتیس ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا صحرائے کاراکم پر مشتمل ہے- یہاں غالباً دس سال میں ایک دفعہ ہی بارش ہوتی ہوگی- شمال کی جانب ازبکستان میں صحرائے کزل کم ہے- لیکن ان دونوں صحراؤں کے درمیان انتہائی سرسبز و شاداب وادیوں میں نخلستان بھی موجود ہیں- ان کے گرد شہروں اور آبادیوں کا ایک جمگھٹ ہے- ہر نخلستان معاشی طور پر ایک خودکفیل اکائی نظر آتا ہے- انہی نخلستانوں کے باشندے مقامی خانہ بدوشوں اور یہاں سے گزرنے والے تجارتی قافلوں سے تجارت کیا کرتے تھے- اپنے غیر تمدنی رویئے اور منتشر آبادی کی وجہ سے وسطِ ایشیا فاتحین کی للچائی نظروں کا ہمیشہ شکار رہا مگر اس پر حکمرانی بھی کاردارد تھا- تاریخ کے ہر دور میں وقفے وقفے سے سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں- انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی تک، جب یہ علاقے روسی سلطنت اور بعد ازاں سوویت یونین کا حصہ بنے، وسطِ ایشیاء کے جغرافیائی چہرے کو ذرا بھی نہیں چھیڑا گیا تھا- تاہم روسیوں اور بعد میں سوویت یونین نے سارا منظر نامہ ہی بدل ڈالا- آبپاشی کا شاندار نظام قائم کیا گیا تا کہ دریائے آمو اور دریائے سیر کے درمیان کپاس کی فصل کو بھرپور مدد دی جا سکے- اگرچہ اس عمل میں انہوں نے ناقابل تلافی ماحولیاتی نقصان اور آلودگی کو بھی جنم دیا، جن کے نتیجے میں بالآخر انہیں پانی کی شدید کمیابی کا سامنا کرنا پڑا- جھیلیں اور دریا خشک ہونے لگے اور زمینیں بنجر ہونے لگیں- آبپاشی کا وہ نظام جو کبھی زراعت اور خوراک کے حصول کا لازمی عنصر سمجھا جاتا تھا، آج سیاسی مصلحتوں اور کوتاہ نظری کے ہاتھوں شکست و ریخت کا شکار ہے-

آج کل وسطِ ایشیاء پانچ آزاد جمہوریتوں میں منقسم ہے- قازقستان، ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان اور تاجکستان- ان کے درمیان موجودہ متنازعہ سرحدیں سٹالن نے

قائم کی تھیں- لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت یہ اس کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا- اس کا وسیع و عریض علاقہ پندرہ لاکھ بیالیس ہزار دو سو مربع میل میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی کل آبادی پانچ کروڑ بیس لاکھ ہے جس میں سو سے زیادہ مختلف، نسلی گروہ شامل ہیں- زیادہ تر لوگ ازبک، قازق اور تاجک ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ جرمن، کوریائی، تبتی نسل کے افراد بھی ہیں- سب سے بڑا نسلی گروپ ازبکوں کا ہے- ازبکستان کی سوا دو کروڑ آبادی کا72% ازبک نسل کے لوگ ہیں جبکہ باقی اقلیتی شکل میں وسطِ ایشیا کی دوسری ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں- سوویت یونین کی شکست و ریخت سے پہلے تقریباً ایک کروڑ روسی بھی یہاں آباد تھے- وہ کل آبادی کا پانچواں حصہ تھے- ان میں سے اکثر سٹالن کی جبری آبادکاری کی پالیسی کے تحت یہاں لائے گئے تھے تاکہ علاقائی نسلی گروہوں کی طاقت کو کمزور کیا جا سکے- ایسے آبادکاروں کی اکثریت1991ء کے بعد واپس روس چلی گئی-

لیکن وسطِ ایشیا کا دل ہمیشہ سے وادی فرغانہ رہی ہے- دو سو میل طویل اور ستر میل چوڑی، یہ سرسبز اور شاداب وادی صدیوں سے انسانی آبادی کا بہت بڑا مرکز رہی ہے- آج بھی اس کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے یعنی وسطِ ایشیا کی کل آبادی کا20%- افغانستان کا فاتح اور ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھنے والا شہنشاہ بابر، اسی وادی میں پیدا ہوا تھا- بقول اس کے دنیا میں اگر کوئی جگہ جنت کے مشابہ نظر آ سکتی ہے تو وہ فرغانہ ہے- دہلی کے عالیشان محلات میں مقیم بابر، فرغانہ میں پیدا ہونے والے140 قسم کے انگوروں اور تربوزوں کو اکثر یاد کیا کرتا تھا- وادی کے گھوڑے، اپنی دلیری اور جرات کے لئے خانہ بدوش قبیلوں اور معماران سلطنت، دونوں میں یکساں مقبول تھے- ان کی شہرت چین تک جا پہنچی تھی- وادی فرغانہ نے فصلوں اور مویشیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیا- یہ وادی روایتی طور پر وسطِ ایشیا میں اسلام کا سیاسی اور ثقافتی مرکز بھی رہی ہے- یہاں سینکڑوں بزرگانِ دین، علماء، صوفیاء اور سپہ سالاروں نے جنم لیا جن کے علم و آگہی سے پوری اسلامی دنیا مستفید ہوتی رہی- کرغیزستان کا دوسرا بڑا اور سرحدی شہر آش دسویں صدی میں اسلامی علوم کا گہوارہ رہ چکا ہے- شہر کے عین درمیان ایک بڑے سے پہاڑ کے بارے میں یہ افسانوی روایت ہے کہ سلیمان بادشاہ (غالباً حضرت سلیمان) کو اس سے بے پناہ انسیت تھی- وہ پہاڑ آج بھی تخت سلیمان کے نام سے موسوم ہے- طویل عرصے تک مسلمان

زائرین اس کی زیارت کو آیا کرتے تھے- مغرب کی سمت، قدیم اسلامی سلطنت کے دارالحکومت بخارا اور سمرقند واقع ہیں- ازمنہ وسطیٰ کے بخارا کے ایک سو تیرہ مدارس اور تین سو ساٹھ مساجد نے بڑے جید علماء کو جنم دیا- انہی کے ذریعے دین کی تعلیمات روس، چین، جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ تک پھیلیں- اسی دور کا ایک محاورہ ہے: ''سورج بخارا پر نہیں چمکتا بلکہ دراصل بخارا سورج پر چمکتا ہے-1868ء میں بخارا کے روسی تسلط میں آ جانے کے بعد بھی، یہاں تقریباً سو مدرسے تھے، جن میں دس ہزار طلبہ زیرِ تعلیم تھے-

فتوحات کی تاریخ

وسطِ ایشیا کی تاریخ فتوحات کی کہانیوں سے عبارت ہے-کبھی وحشی منگول آئے اور کبھی عرب مجاہدوں نے اس کے وسیع میدانوں اور بلند و بالا پہاڑوں کو تسخیر کیا اور وقتی طور پر اسے دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کا حصہ بھی بنا دیا- سکندر اعظم، تیمور لنگ، چنگیز خاں جیسے فاتحین نے ان پر قبضہ کیا، انہیں اپنی سلطنتوں میں شامل کر کے مضبوط حکومتی سلسلوں کی بنیاد رکھ دی، جو صدیوں تک قائم رہے، یہاں تک کہ کسی نئے حملہ آور نے انہیں تاخت و تاراج کر ڈالا-

وسطِ ایشیا کی ابتدائی تاریخ شمالاً جنوباً، ایران اور ترک قبائل کے درمیان حریفانہ چشمکوں سے بھری پڑی ہے- دونوں طاقتیں ان زرخیز نخلستانی شہروں پر قبضہ کی خاطر ایک دوسرے سے جنگ آزما رہتی تھیں- پانچ سو سال قبل مسیح، داریوش اول کی زیرِ قیادت، ایرانی حدود ماوراء النہر تک بڑھ گئی تھیں-لیکن پھر ترک قبائل نے سائبریا اور منگولیا کی جانب سے حملہ آور ہو کر انہیں نکال باہر کیا- لگ بھگ ایک ہزار سال قبل از مسیح یہ قبائل مشرقی وسطِ ایشیا کے الاتاؤ پہاڑوں میں آن بسے تھے- چینی انہی قبائل کی شناخت کے لئے، جو ان کی سلطنت کے لئے ایک مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے، تور یا ترکی کے الفاظ استعمال کرنے لگے- وسطِ ایشیا کے تشخص کے لئے آج بھی ترکستان کا پرانا نام استعمال ہوتا ہے- سکندر اعظم کے ہاتھوں ایک بار پھر ایرانی حکومت کا شیرازہ بکھرا- اس نے329ق م اور327ق م کے درمیان باختر اور سوگدیانا (ازبکستان، تاجکستان اور افغانستان کے قدیم نام) کے علاقوں کو فتح کر لیا- اس نے خوبند نامی نیا شہر بھی آباد کیا-سکندر نے اپنے قبضے کو مستحکم کرنے کے لئے اپنے فوجیوں کو مقامی عورتوں سے شادی کرنے کی ترغیب دی- اس نے خود بھی سوگدی

شہزادی رخسانہ سے شادی کی تھی۔

سکندر کے یونانی نژاد سوگدی وارثوں نے باختر سلطنت کی بنیاد رکھی جو300ق م اور 140ق م کے درمیان وسطِ ایشیا کے بہت بڑے علاقے اور افغانستان پر حکمران رہی۔ وسطِ ایشیا کا مغربی حصہ، موجودہ ترکمانستان، پارتھائی نامی ایک قبائلی شہنشاہیت کے زیرنگیں تھا۔ ایران کے ساسانیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد غالباً226ء میں اس بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ اسی دوران شمال کی جانب سے شاکا قبائل، آخری صدی قبل مسیح تک مسلسل وسطِ ایشیا پر حملہ آور ہوتے رہے۔ جنہیں جلد ہی صحرائے گوبی کے منگولوں کے اجداد، زیانگ نو نامی خانہ بدوش قبائل نے شمالی وسطِ ایشیا سے نکال پھینکا۔ اوئی غرز جو اس وقت موجودہ زن جیانگ صوبے اور مغربی چین کے حکمران قبائل تھے، بھی زیانگ نو کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ اس کے بعد ان کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا۔400ء تک زیانگ نو قبائل (جو بعد میں ہن قبائل کے نام سے معروف ہوئے) وسطِ ایشیا عبور کر کے، دریائے والگا تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی سلطنت ــــــ پہلی خانہ بدوش منگول سلطنت ــــــ اب کوریا سے والگا تک پھیل چکی تھی۔

پانچویں صدی میں ہن قبائل نے اپنے سردار اٹیلا کی زیر قیادت یورپ میں قدم رکھا اور روم پر چڑھائی کر دی۔ ہن مغربی جانب متوجہ تھے، اس لئے وسطِ ایشیا میں پھر سیاسی خلا پیدا ہو گیا۔ ترک قبائل نے موقع غنیمت جان کر پھر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ وہ صدیوں سے اس موقع کی تاک میں تھے۔ منگولیا اور مغربی چین کے قبائلی حملہ آوروں نے وسطِ ایشیا پر یقیناً ثقافتی، سیاسی اور تمدنی اثرات مرتب کئے۔ تاہم اتنے وسیع اور عریض علاقے پر حکمرانی کے لئے ان کا سیاسی اور حکومتی نظام کیا تھا، یہ آج ایک سربستہ راز ہے۔ ہوتا یہ رہا کہ فاتح اس علاقے پر قبضہ کر کے مشرقی جانب پیش قدمی کرتا تھا اور اس کے پیچھے کوئی اور قوت یا قبائل اس کی جگہ لینے وہاں پہنچ جاتے تھے۔

البتہ ایک خانہ بدوش سلطنت نے خاصے اہم اثرات مرتب کئے۔ یہ تھی کشان شاہی جو پہلی اور دوسری عیسوی صدی کے درمیان ایران، شمالی ہند اور موجودہ چینی صوبے زن جیانگ کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری صدی میں عظیم کشان بادشاہ کنشک بدھ مت کے مہایان فرقے کا سرپرست بن گیا۔ اس سوچ کے تحت مہاتما بدھ کو اس کی انسانی تجسیم میں

پیش کیا گیا(پہلے بدھ کو محض علامتی طور پر لیا جاتا تھا یعنی پوجا پاٹھ اور گیان دھیان کے لئے) کشان سٹائل بدھ کے لاتعداد اور خوبصورت مجسمے، افغانستان اور تاجکستان میں، انیسویں صدی کے دوران ارضیاتی کھدائی میں برآمد کئے گئے- یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وسطِ ایشیاء کی ایک اہم خصوصیت_____ تحمل اور برداشت کو مدنظر رکھتے ہوئے، کشان بادشاہوں نے بدھ مت کے ساتھ ساتھ زرتشتی مذہب اور ہندومت کو پھلنے پھولنے کی بھی آزادی دے رکھی تھی-

نزول مسیح کے فوراً بعد کی کچھ صدیاں ہنوں، ساسانیوں، ترکوں اور چینیوں کی باہمی چشمک آرائی میں گزریں-مختلف گروہ یکے بعد دیگرے وادی فرغانہ پر حملہ آور ہوتے رہے-لیکن اہم جنگوں کا سلسلہ 650ء کے لگ بھگ اس وقت شروع ہوا، جب عرب اسلام کا پرچم اٹھائے یہاں آئے- اگلے سو سالوں میں انہوں نے ماوراء النہر پر حملہ آور ہو کر بخارا اور سمرقند پر قبضہ کرلیا-751ء میں عرب فوجوں نے تلاس (موجودہ کرغیزستان) کے مقام پر چینی فوجوں کو زبردست شکست دے کر انہیں نکال باہر کیا-

اگرچہ عرب خود بھی اس علاقے میں اپنی حکومتیں قائم نہیں کر سکے، تاہم وسطِ ایشیا میں اسلام کی جڑیں مضبوطی سے پھیلتی چلی گئیں-نخلستانی شہروں میں آزاد مسلمان حکومتیں معرضِ وجود میں آنے لگیں- ایران کی سامانی سلطنت(999-874ء) ان میں سب سے زیادہ اہم تھی- انہوں نے بخارا کو دارالحکومت بنایا تھا- سامانیوں نے اعلیٰ منظم نوکرشاہی اور فوج کے ساتھ انتہائی مہارت سے شاہراہِ ریشم کو وسعت دی، فارسی زبان کو ترویج دی اور بخارا کو پوری اسلامی دنیا کا تجارتی نقل وحمل کا اور ثقافتی مرکز بنا ڈالا- ابنِ سینا جیسے معالجوں، البیرونی جیسے ریاضی دانوں اور فردوسی جیسے شاعروں کو جنم دے کر سامانی حکومت نے فارسی زبان اور تہذیب وتمدن کے ارتقاء پر ایسے انمٹ نقوش چھوڑے، جو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی وسطِ ایشیا کے ماحول سے ختم نہیں کئے جا سکے-

ترک قبائل کی آمد کے ساتھ ہی سامانی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا- غزنوی خاندان نے افغانستان اور خراسان کی حکومت سنبھال لی- قراخانیوں نے بخارا پر قبضہ کر لیا- بعد ازاں سلجوق فوج نے آ کر انہیں شکست دی اور وسطِ ایشیا اور ترکی پر قبضہ کر لیا-1055ء میں سلجوقیوں کا سربراہ طغرل بغداد کے دروازوں پر کھڑا تھا- اگلی دو صدیوں تک سلجوق وسطِ

ایشیا، ایران اور عرب دنیا کی متحدہ سلطنت پر حکمران تھے، جس کی سرحدیں پامیر کی پہاڑیوں سے ایک جانب چین اور دوسری جانب عراق تک پھیلی ہوئی تھیں-

ان کے بعد منگول خانہ بدوشوں کا لشکر جرار آیا اور اس سارے علاقے پر قابض ہو گیا- 1228ء میں سلجوقوں نے منگول حکمران چنگیز خاں کے ایک قاصد کو گرفتار کر لیا اور منگولوں سے تجارتی مراسم رکھنے کی بناء پر 450 تاجروں کو قتل کرا ڈالا- غضب ناک منگولوں نے سلجوقوں کو ختم کرنے کی ٹھان لی- کئی مورخوں کا خیال ہے کہ بعد ازاں ہونے والی چنگیزی خون ریزی اور قتل و غارت میں سلجوقوں کی حماقتوں کا گہرا ہاتھ تھا-1220ء میں چنگیز خاں نے بخارا پر قبضہ کر لیا- یہاں اس نے تیس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا- انسانی سروں کے ایک مینار کے سامنے کھڑے ہو کر چنگیز خاں نے ببانگ دہل یہ کہا تھا: ''تم پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں، جو تم سے اس طرح باتیں کر رہا ہے تو جان لو، میں خدا کا عذاب ہوں- اگر تم گناہ گار نہ ہوتے تو خدا مجھے تمہیں سزا دینے کے لئے ہرگز نہ بھیجتا-''

منگول مغربی سمت بڑھتے رہے اور اس طرح انہوں نے روس اور مشرقی یورپ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا- اتنا وسیع و عریض علاقہ فتح کرنے کے بعد وہ اس کے انتظام و انصرام میں مصروف ہو گئے- انہوں نے شاہراہ ریشم کو درست کیا جو پے در پے حملوں کی وجہ سے شکست و ریخت کا شکار ہو گئی تھی- شاہراہ پر ریسٹ ہاؤس بنوائے- ڈاک کے نظام کو بہتر کیا- منگولوں کے دور میں استنبول سے بیجنگ کا سفر انتہائی پر امن اور محفوظ خیال کیا جاتا تھا- سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد پہلی بار اس دور میں یورپ اور ایشیا باہم مربوط ہو گئے تھے- چنگیز خاں کی وفات کے بعد، وسطِ ایشیا کی حکمرانی اس کے بیٹے چغتائی کے حصے میں آئی- اس کے جانشینوں نے بعد ازاں اس علاقے کو دو ریاستوں مغرب میں ماوراء النہر اور مشرق میں ترکستان میں تقسیم کر دیا-

وسطِ ایشیا میں ہونے والا آخری زبردست دھماکا، جس نے علاقے پر انتہائی اہم ثقافتی اور سماجی اثرات چھوڑے، تیمور لنگ کے ہاتھوں ہوا- چالیس برس کی عمر تک اس نے کوئی علاقہ فتح نہیں کیا تھا- اس نے وسطِ ایشیا کی پہلی مقامی حکومت کی بنیاد رکھی- وہ ترک خانوادے برلاس سے تعلق رکھتا تھا- وہ سمرقند کے نزدیک پیدا ہوا تھا، اسی لئے اس نے 1369ء میں اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا- وسطِ ایشیا کو فتح کرنے کے بعد اس نے اپنی حکومت

کو ہندوستان، ایران، عرب اور روس کے کئی علاقوں تک وسعت دی- سمرقند پہلے ہی دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا اور اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی- تیمور کے دور میں یہ شہر اپنی نادر روزگار تعمیرات کی وجہ سے دنیا کا سب سے دلکش عجوبہ بن گیا کیونکہ تیمور نے اپنے سارے مفتوحہ علاقوں سے ماہرین فن تعمیر اکٹھے کر کے یہاں بلا لئے تھے- چار صدیوں پر محیط ترک بادشاہت کے دور میں تہذیب وتمدن کے شاندار ارتقاء نے علاقے کو ہر لحاظ سے اتنا مضبوط اور طاقتور کر دیا کہ وہ بآسانی ایرانی ثقافتی اور سیاسی غلبے کی ہر کوشش کی مزاحمت کر سکتا تھا- تیمور نے تو ترکی زبان کی ایک بولی جگتائی کو فارسی کی جگہ درباری زبان بھی قرار دے ڈالا تھا-

شیبانی ازبکوں نے جو اپنا سلسلہ چنگیز خان کے پوتے ازبک خان سے جا ملاتے تھے، وسطِ ایشیا کی آخری عظیم خانہ بدوش سلطنت کی بنیاد رکھی-1500ء میں انہوں نے تیمور خاندان کو شکست دی اور بخارا کو اپنا دارالحکومت بنا لیا- شیبانی دور حکومت میں ترکی (ازبک) زبان اور ادب کو خوب فروغ حاصل ہوا- عظیم ازبک شاعر، میر علی شیر نوائی (150-1414ء) نے پہلا ترکی رسم الخط بنایا، جس نے فارسی کی جگہ لے لی-

سولھویں صدی کے بعد یورپ، افریقہ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستے دریافت ہو جانے کی وجہ سے شاہراہ ریشم کی اہمیت ختم ہو گئی- ساتھ ہی شیبانی سلطنت زوال کا شکار ہونے لگی- شاہراہ ریشم کی ترقی اور حفاظت ان علاقوں کے حکمرانوں کے لئے غیر ضروری ہو گئی- اس راستے پر تجارتی آمد و رفت کی کمی، آمدنی میں شدید نقصان کا باعث بن گئی، چنانچہ حکمرانوں میں باقاعدہ افواج رکھنے اور اپنی بادشاہتوں کو وسعت دینے کی استعداد سرے سے ہی ختم ہو گئی- مزید براں، روز مرہ زندگی پر گہرا اثر رکھنے والے قدامت پسند علماء نے تعلیم اور سائنس میں جدت پسندی پر مکمل پابندی لگا دی- اس طرح وسطِ ایشیا کو بالکل ہی دیوار سے لگا دیا گیا- شیبانی سلطنت آہستہ آہستہ چھوٹی متحارب شہری ریاستوں کا ملغوبہ بن کر رہ گئی- سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یہ علاقے تین علیحدہ مگر کمزور ریاستوں خیوا، قوقند اور بخارا کی شکل میں ابھرے- بعد ازاں یہاں خانوں نے اپنی حکومتیں بنا لیں: کنگراد خیوا میں، منگیت بخارا میں اور منگ قوقند میں براجمان ہو گئے- غربت کے مارے خان غلاموں کی تجارت اور عوام پر بھاری ٹیکس کے سہارے اپنی حکومتوں کی گاڑی کھینچ رہے

تھے- زار جو مسلسل اپنی سلطنت کی حدود بڑھانے کی فکر میں رہتے تھے- انہیں یہ سنہری موقع ملا تو وہ اسے ضائع کس طرح کر دیتے-

1650ء تک روسی سائبریا کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا کر، بحیرا لکاہل تک پہنچ چکے تھے- اگلی دوصدیوں میں روس کا کیشیا اور وسطِ ایشیا پر قبضے کے لئے آگے بڑھا- پیٹر اعظم نے1715ء میں قازق میدانوں پر حملہ کیا اور روسی قلعوں کی تعمیر شروع کر دی- پہلا قلعہ1716ء میں اومسک پر بنا تھا-1750ء تک تمام خانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ قازق ازبکوں کے خلاف، روسی انہیں بہتر تحفظ فراہم کر سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ماسکو کے ساتھ امن وتحفظ کے معاہدے کر لئے-

روسی فوج کا وسیع وعریض ڈھانچہ حکمرانوں کی توسیع پسندی کے شوق کو مہمیز دیئے جا رہا تھا- کا کیشیا کی فتح کے بعد روسی افواج بیکار تھیں- زاروں کی للچائی ہوئی نگاہیں وسطِ ایشیا کے زبردست معدنی اور زرعی وسائل پر جمی ہوئی تھیں-65-1861ء میں امریکی خانہ جنگی کی بدولت وہاں سے روسی فیکٹریوں کو کپاس کی سپلائی ختم ہو کر رہ گئی تو وسطِ ایشیا پر قبضے کی خواہش شدت اختیار کر گئی- اسی دوران روس برطانوی ہند کی بنگال سے افغانستان کی جانب توسیع اور پیش قدمی پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھا- یہی دور تھا عظیم کھیل کا- ایشیا پر قبضے کی خاطر روس اور برطانیہ کے درمیان قوت آزمائی کا کھیل، جس میں وسطِ ایشیا اور افغانستان کو ــــــ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ــــــ مہروں کی طرح استعمال کیا گیا- انیسویں صدی کے آخر میں، روس اور برطانیہ کی عظیم سلطنتوں کے درمیان آزاد افغانستان کو بفرسٹیٹ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا-

1665ء اور1876ء کے مختصر سے درمیانی عرصے میں روسی افواج نے تاشقند اور موجودہ ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان کے زیادہ تر حصوں پر قبضہ کر لیا- تاہم اس اثناء میں افغان تاجک سرحد بدستور کھلی رہی اور دونوں اطراف کے قبائلی سردار اور رہنما ایک دوسرے کے علاقوں میں پناہ گزین ہوتے رہے- وسطِ ایشیا کے انتہا پسندوں اور افغانستان کے طالبان کے درمیان دوبارہ اسی روایت کا احیاء کیا جا رہا ہے- روسیوں نے ترکستان کا صوبہ تشکیل دیا اور تاشقند کو اس کا دارالحکومت بنا دیا- ماسکو کا نامزد گورنر جنرل یہاں تمام اختیارات استعمال کرتا تھا- انہوں نے بخارا اور خیوا کی ریاستوں کو روسی زیر سایہ خود مختار سیاسی اکائیوں کی شکل دے دی- ان علاقوں پر روسی غلبہ تو آسانی ہو گیا تاہم خانہ بدوش

قبائل کی مزاحمت کئی عشروں تک جاری رہی۔ وادی فرغانہ میں وقفے وقفے سے بغاوتیں ہوتی رہیں۔1885ء میں روسی افواج نے وادی کے شہروں اوش، مرجلان اور اندیجان میں ایک صوفی درویش خان تورا کی قیادت میں بپا کی گئی بغاوت کو بری طرح کچل دیا۔1889ء میں روسی حکمرانوں کو اس وقت شدید خطرات سے دوچار ہونا پڑا جب اندیجان میں مسلمان انتہا پسندوں نے بائیس روسی فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ روسی افواج کی آمد سے پہلے بغاوت ساری شہری آبادیوں میں پھیل چکی تھی، لیکن روسیوں نے اس بغاوت کو انتہائی بربریت آمیز طریقے سے ختم کر ڈالا۔

علاقے میں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے کے لئے روسیوں نے وسطِ ایشیا میں روسی نسل کے افراد کو باقاعدہ بسانا شروع کر دیا اور وسیع وعریض زمین کو کپاس کی فصل کے لئے زیرِ کاشت لانا شروع کر دیا۔ سائبیریا سے ملحقہ قازق علاقوں میں1891ء تک دس لاکھ روسی اور قازق کسانوں کو آباد کر دیا گیا تھا۔ وسیع آبپاشی کے پراجیکٹس قائم کئے گئے اور کپاس کی کاشت میں زبردست اضافہ کیا گیا۔ روسی کاریگروں کی زیرِنگرانی نئی نئی صنعتیں قائم کی گئیں۔ وسیع ریلوے نظام کے ذریعے وسطِ ایشیا روس سے براہِ راست منسلک ہو گیا۔ اس طرح روسی سلطنت کی سرحدیں افغانستان، ایران، چین اور برطانوی ہند تک آن پہنچیں۔

زار حکومت کا آخری دور وسطِ ایشیا کے لوگوں کے لئے انتہائی صبر آزما دور تھا۔1916ء میں علاقے میں شدید قحط پڑ گیا۔ ماسکو نے پہلی جنگِ عظیم میں شاہی افواج کے لئے مقامی لوگوں کو بھرتی کرنا چاہا تو ایک بار پھر زبردست بغاوت پھوٹ پڑی۔ حکومت نے بھاری ٹیکس لگا دیئے اور ساتھ ہی یہاں سے بھاری مقدار میں گندم زبردستی دوسرے علاقوں میں لے جانے کی کوشش کی۔ قازق اور کرغیز خانہ بدوش قبائل کے مطابق زار حکومت کی حمایت میں یورپ جا کر لڑائی میں حصہ لینا انتہائی احمقانہ حرکت تھی، چنانچہ انہوں نے زار کے خلاف بغاوت کر دی۔ جلد ہی یہ بغاوت پورے وسطِ ایشیا میں پھیل گئی، لیکن گزشتہ بغاوتوں کی طرح اسے بھی روسی افواج نے کچل کر رکھ دیا۔ اس عمل میں لاکھوں افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ تیان شان کے پہاڑی علاقے میں قازق فوج نے کرغیزوں کے لئے گویا قیامت بپا کر دی۔ بے دریغ قتلِ عام کیا گیا۔ دیہاتوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور بے انتہا کرغیز باشندوں کو زبردستی سرحد پار چینی ترکستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ آج بھی

کرغیز1916-17ء کی تباہی و بربادی کو اپنی تاریخ کا بدترین دور قرار دیتے ہیں، جس میں ان کی آبادی کا چوتھائی حصہ موت کی نیند سلا دیا گیا یا ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

تاہم جب1917ء کا سوشلسٹ انقلاب بپا ہوا تو وسطِ ایشیا کے عوام اس کا حصہ بننے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ وسطِ ایشیائی عوام نے کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت کہیں زیادہ شد و مد سے سوویت یونین کے نظام کے خلاف مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان علماء اس جدوجہد کی قیادت کر رہے تھے۔ بالشویکوں نے انہیں ''بسماچی'' کا نام دیا۔1929ء میں بہرحال بسماچی مکمل شکست سے دوچار ہوئے اور وسطِ ایشیا کے نقشے کو تبدیل کر کے پانچ سوویت جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح بظاہر اس علاقے پر قبضے کے لئے صدیوں پر محیط جنگ و جدل کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس صورتِ حال کو بھی تبدیل ہونا تھا۔

وسطِ ایشیا میں اسلام

وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت سنی العقیدہ حنفی فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ شیعہ مسلمان زیادہ تر بڑے تجارتی شہروں مثلاً بخارا اور سمرقند اور تاجکستان میں آباد ہیں۔ تاجکستان میں اسماعیلی فرقہ ـــــ آغا خان جس کے روحانی پیشوا ہیں ـــــ پامیر کے پہاڑی علاقے گورنو بدخشاں میں آباد ہے۔ پاکستان اور افغانستان میں واقع پامیر کا جنوبی حصہ بھی اسماعیلیوں کے زیر اثر ہے۔1991ء سے وسطِ ایشیا میں بھی مذہبی جنونی گروہوں کو خاصی تقویت ملی ہے۔ ہر کسی کے پاس اس کے اپنے انداز کا فلسفہ اور شریعت ہے۔ اس طرزِ فکر نے وسطِ ایشیاء میں اسلام کی ایک اہم روایت ـــــ تحمل و برداشت ـــــ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں کے آزاد خیال سیاسی حکمرانوں کے تحت فلسفے، اخلاقیات، قانونی ضوابط اور سائنسی ریسرچ کا شاندار ارتقا اور عربوں، منگولوں اور ترکوں کے ذریعے، اس دور کی معلوم دنیا میں ان کی فکری اور عملی وسعت پذیری کی بدولت، وسطِ ایشیائی اسلام کی مختلف شکلیں ابھریں۔ ابتدائی زمانے کے وسطِ ایشیائی مسلمان، پرامن بقائے باہم کے فلسفے کے مطابق نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ یہودیوں، بدھوں، ہندوؤں، زرتشتیوں اور نسطوری عیسائیوں (جنہوں نے علاقے میں اپنے بعض تمدنی مراکز قائم کر لئے تھے) کے ساتھ امن وسکون سے رہ رہے تھے۔

غالبًا علاقے میں ابھرنے والی سب سے اہم اسلامی تحریک صوفیاء کی تھی- اسلامی تصوف کی یہ قسم اللہ سے براہِ راست تعلق اور عبادت کے دوسرے طریقوں کے بارے میں تحمل اور برداشت کا سبق دیتی تھی- عربوں کے حملوں کے فوراً بعد ہی وسطِ ایشیاء اور فارس میں تصوف کی تحریکیں جنم لینے لگی تھیں- ابتدائی صوفی حضرات کھردرا چوغہ پہنا کرتے تھے- عربی میں اُون کو صوف کہتے ہیں' اس طرح اس کا نام صوفی تحریک مشہور ہو گیا- یہ لوگ قبل از اسلام کی بعض قبائلی صوفیانہ علامات کو بھی اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے- صوفیاء نے اقتدار اعلیٰ' دانش ورانہ خیالات اور ملاؤں کی مخالفت کے ذریعے' اسلام میں عوامی شرکت کو بتدریج مقبول بنایا- وسطِ ایشیا کی غیر متمدن اور خانہ بدوش قبائل میں صوفیاء کا یہ نظریہ بڑا مقبول ہوا کہ اللہ کو ــــــ مذہبی رہنماؤں یا علماء کی مداخلت کے بغیر ــــــ براہِ راست پہچاننے کی کوشش کی جائے- صوفی طریقے کی جامع تعریف یوں کی جا سکتی ہے: ایک ہی روحانی سلسلے سے تعلق رکھنے والے صوفیوں کا باہم بھائی چارہ ــــــ اس میں شیخ یا بزرگ اپنے چیلے یا مرید بنانا شروع کرتے ہیں اور انہیں تربیت دے کر' اسی طرز فکر اور عمل کو آگے بڑھانے کی باقاعدہ اجازت دیتے ہیں- صوفیا اللہ کی توجہ کے لئے ذکر بالجہر (یا بعض اوقات خاموش عبادت' حمد و ثنا' گیت یہاں تک کہ رقص اور دھمال) کا استعمال کرتے ہیں- صوفیوں کی ایک اور قسم' درویشوں نے تو ذکر بالجہر اور دھمال کے انداز کو انتہائے فن تک پہنچا دیا- بہت سی طریقتوں میں تو سلوک اور عبادت کے نئے انداز اپنا کر' اپنے ہی پراسرار سماجی ڈھانچے تک تشکیل دے لئے گئے- تیرہویں صدی میں منگولوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد اسلام کے احیاء میں صوفیاء کے اندازِ طریقت نے بڑا اہم کردار ادا کیا- اسی طرح سوویت یونین کے ہاتھوں اسلام کے زیر زمین چلے جانے کے بعد سینکڑوں سال بعد بھی اس سرزمین کے باشندے اسلام سے اپنا نظری اور عملی تعلق قائم رکھنے میں صوفی انداز فکر کی بدولت کامیاب رہے-

نقش بندی' قادری' یساوی اور کبرادی چند اہم ترین سلسلہ ہائے طریقت ہیں- سب سے قدیم غالبًا قادریہ سلسلہ ہے' جس کے بانی عبدالقادر تھے- بارہویں صدی میں یہ بغداد کا ایک چھوٹا سا سلسلہ تھا جو وسطِ ایشیا میں منتقل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے تیرہویں صدی میں بے پناہ طاقتور ہو گیا- بعد ازاں یہ افغانستان اور ہندوستان تک پھیل گیا- وسطِ ایشیا کے قادری

زیادہ تر ماوراء النہر کے شہروں میں مرتکز تھے۔ کبرادی سلسلے کے پیشوا کبریٰ 1221ء میں منگولوں کے قتلِ عام کے دوران شہید ہو گئے۔ کبرادی طریقت خوارزم (موجودہ ازبکستان) میں خوب پھلی پھولی۔ یساوی سلسلے کا آغاز احمد یساوی نامی شاعر اور صوفی نے کیا تھا جن کا انتقال 1116ء میں ہوا' وہ جنوبی قازقستان میں مدفون ہیں۔ ان کا زیادہ تر حلقہ اثر وادی فرغانہ اور جنوبی ترک قبائل کے علاقے میں تھا۔ نقش بندی سلسلے کے روحانی پیشوا محمدؒ ابن بہاؤ الدین (89-1317ء) کا سلسلہ طریقت' وسطِ ایشیا اور افغانستان میں آج بھی روحانیت اور تصوف کا مقبول ترین طریقہ ہے۔ بخارا میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ دوسرے صوفیانہ سلسلوں کے برعکس نقش بندی' عملی جدوجہد کے ذریعے بھرپور تبلیغی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور سیاسی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے بہت سے لوگوں نے زار اور کمیونزم کے خلاف مختلف بغاوتوں کی قیادت تک کی۔ اندیجان میں 1898ء کی بغاوت کا رہنما ایک نقش بندی تھا۔

صوفیا کا پیغامِ طریقت وادی فرغانہ کے ذریعے چین اور افغانستان کے راستے ہندوستان اور عرب دنیا تک پھیلتا چلا گیا۔ روایتی علماء مقامی حکمرانوں کو اپنے اثر میں رکھنے کے لئے نقشبندی طریقت کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ ان کے اور نقش بند روحانی پیشواؤں کے درمیان مخاصمت بڑھتی چلی گئی۔ نقش بندیوں کا اثر اس حد تک بڑھ گیا کہ ترک سلطان اپنی حکمرانی کے استحکام کے لئے نمایاں روحانی پیشواؤں کی حمایت حاصل کیا کرتے تھے۔ حکمرانوں اور صوفیاء کے مابین تعلق کی نوعیت بڑی عجیب تھی۔ بقول ایک اسلامی سکالر بروس لارنس کے اس میں ہمیشہ ایک تناؤ اور کشیدگی کی کیفیت ہوتی تھی کیونکہ صوفیا خود کو ان مطلق العنان حکمرانوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور دائمی حکمران خیال کرتے تھے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اہم نقش بندی خاندانوں (اس سلسلے کی قیادت عموماً باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی) نے زوال پذیر وسطِ ایشیا کی شہری ریاستوں میں سیاسی اور روحانی رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔ بعض صوفی گھرانے تو مختلف ریاستوں کے حکمران تک بن گئے۔ انیسویں صدی میں ہونے والی جدید اصلاحات کے ہاتھوں ان میں سے کئی خاندان ناجائز ذرائع سے پیسہ اکٹھا کر کے بہت امیر بھی ہو گئے۔ موجودہ افغان' چیچن اور فرغانہ کی جہادی تحریکوں پر نقش بندی سیاسی سرگرمیوں نے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

تاہم ان نخلستانی شہروں اور وادیوں سے آگے وسطِ ایشیائی علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا سلسلہ آہستہ رو اور خاموش انداز میں چلا- سترہویں صدی تک قازق علاقے میں اسلام نہیں آیا تھا- بعد میں بھی قدیم خانہ بدوش روایت اور ثقافت' خصوصاً سامانی ثقافت کے اثرات' تصوف کے جلو میں ظاہر اور پوشیدہ طریقے سے اسلام کے خدوخال پر اثر انداز ہوتے رہے- فارسی حکمرانوں کے زرتشتی مذہب کی' مسلمان حکومت کے دور میں خاصی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی' تاہم اس کے بہت سے اثرات اسلامی رنگ میں رنگ کر نہ صرف وسطِ ایشیاء میں بلکہ ایران اور ہندوستان میں بھی موجود رہے- چنانچہ شروع سے ہی وسطِ ایشیا میں اسلام کی دو گروہی شاخیں سامنے آئیں- نئی آبادیوں اور نخلستانی شہروں میں' مقامی حکمرانوں اور علماء کے زیرِ اثر' شہری ثقافتوں میں' روایتی' قدامت پرست اور علمی اسلام کو فروغ ہوا جبکہ دوسری جانب خانہ بدوشوں کا کھلا ڈلا' کم تر حدود و قیود کا حامل اسلام پروان چڑھا جس پر ماقبل اسلام کی روایات اور تصوف کا نمایاں اثر تھا- بقول فرمنڈ براوڈل نامی مورخ کے ''اسلام دراصل شہری مذہب ہے' چنانچہ وہ انتہائی غیر آباد وسیع وعریض علاقوں کے درمیان موجود چند گنجان آباد علاقوں میں مرتکز ہے-'' آج بھی قازق' کرغیز اور ترک مان خانہ بدوش قبائل انتہا پسند اسلامی سوچ کے حامل نہیں اور نخلستانی آبادیوں اور شہروں کی نسبت ان میں اسلامی انقلابیت کی ترویج بہت کم ہے-

وسطِ ایشیا میں اسلام عربوں کے ساتھ آیا تھا لیکن جلد ہی وہ نومسلم ایرانیوں اور ترکوں کے ہاتھوں نکال باہر کئے گئے- صدیوں تک اس علاقے پر ایرانیوں کا گہرا اثر رہا-1500ء کے لگ بھگ صفوی بادشاہوں کے ایران پر قبضے تک یہی صورتِ حال رہی- صفویوں نے ایران کا سرکاری مذہب سنی اسلام کے بجائے شیعہ اسلام قرار دے دیا- جس سے وسطِ ایشیا میں ایرانی اثر ونفوذ کو زبردست دھچکا لگا- مزید براں ایرانی بادشاہوں کو اپنے مغربی جانب ترکوں کی عثمانی طاقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہونا پڑا اس طرح وسطِ ایشیا کی جانب سے ان کی توجہ ہٹ گئی-

تاہم وسطِ ایشیا میں زبان و ادب' فن' شاعری اور سائنسی علوم پر ایرانیوں نے گہرے نقوش مرتب کئے- شیبانی ازبکوں کی حکومت سے قبل وسطِ ایشیا مکمل طور پر فارسی ثقافت کے غلبے اور کنٹرول میں تھا- ازبکوں نے اقتدار میں آتے ہی انتہائی جارحانہ انداز میں پورے

علاقے کو ترکی رنگ میں ڈھالنا شروع کر دیا- تاہم آج بھی تاجک علاقے میں ایرانی نسل کے لوگ موجود ہیں جو فارسی زبان بولتے ہیں اور اپنی فارسی ثقافت اور تمدنی ورثے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں- تاہم ایرانی اور ترک ثقافتی کشمکش آج بھی کسی نہ کسی انداز میں جاری ہے- چاہے وہ ایران اور ترکی کے مابین اپنا اپنا حلقہ اثر بڑھانے کی کارروائیاں ہوں یا تاجکستان اور ازبکستان کے درمیان ـــــ ایک دوسرے ملک کے اقلیتی باشندوں کے سلسلے میں ـــــ تنازعات ہوں، چاہے سرحدی کشیدگی ہو- بہت سے تاجک یہ سمجھتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کے شہر ـــــ جو سٹالن نے ازبکستان کے حوالے کر دیئے تھے ـــــ دوبارہ ان کے حوالے کئے جانے چاہئیں کیونکہ وہ ہمیشہ سے تاجکستان کے تاریخی اور ثقافتی مراکز رہے ہیں- زاروں کی حکمرانی میں اسلامی طرز معاشرت کے تحرک میں خاصی کمی آ گئی- وجہ یہ نہیں تھی کہ وسطِ ایشیا کے نئے آقا اسلامی تعلیمات، قانون یا اس کے عملی نفاذ میں مداخلت کر رہے تھے بلکہ انہوں نے یہاں کے باشندوں کو صنعت، تعلیم اور ٹیکنالوجی کے جدید اور ترقی پذیر راستوں کی جانب راغب کیا- ایک جانب روسی زیادہ قدامت پرست علماء کی سرپرستی کر رہے تھے اور دوسری جانب روسی نسل کے لاکھوں لوگ اس علاقے میں آباد کئے جا رہے تھے- شاید وہ وسطِ ایشیا کو بھی نئی روسی نسل کا وطن بنانا چاہتے تھے-

لیکن اس معاملے میں نئے نو آبادیاتی آقاؤں کو جزوی کامیابی حاصل ہوئی- مغربی نظریات اور سائنس کے ارتقاء نے اسلام کی جدید تشریح و توضیح کے راستے کھول دیئے- اس کام کی شروعات تاتاریوں کے ایک اصلاحی گروہ ''جدید'' نے کی- یہ لوگ تاتاری زبان کے اخبار ''ترکمان'' کے بانی اسماعیل بے گس پرنسکی (1851-1914ء) سے متاثر تھے- انیسویں صدی میں اصولِ جدید (نئے تعلیماتی اصولوں) کو بنیاد بنا کر اس تحریک نے دوسری دانش ورانہ اسلامی اصلاحی تحریکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے یہاں کی مسلم نو آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا- یہ لوگ غیر مسلم حکمرانوں کے زیر تسلط مسلمان کالونیوں میں مغربی جدیدیت اور اسلامی عقیدے اور ثقافت کے درمیان ٹکراؤ سے پیدا شدہ مسائل کو مناسب انداز میں حل کرنے کے لئے کوشاں تھے- اسی طرح کی تحریکیں ہندوستان، مصر، ترکی اور افغانستان میں بھی چل رہی تھیں- ابتداء میں یہ تحریکیں سامراج مخالف اور پان اسلام ازم کی حامی تھیں مگر ساتھ ساتھ وہ مذہبی اصلاح، جدید تعلیم اور سائنسی فہم و آگہی کی اہمیت پر بھی

زور دینے لگیں۔

جدید اساتذہ اور علماء نے تاشقند اور فرغانہ میں نئے اسکول کھولے جہاں جدید تقاضوں کے مطابق روایتی اسلامی مضامین کے ساتھ ریاضی، سائنس، تھیٹر، شاعری، روسی اور ترکی ادب کی تعلیم بھی دینا شروع کر دی۔ انہوں نے ڈرامے اور اوپیرا کی روایت ڈالی۔ کئی اخبارات شائع ہونےلگے۔ ترکی زبان اور جدید ترک ثقافت کے احیا میں ان سرگرمیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کے تصنیف کردہ لٹریچر میں پہلی دفعہ مقامی تاریخ، ثقافت اور سیاست کا تجزیہ جدید انداز میں کیا گیا تھا۔ جدید تحریک کے لوگ اپنے جدید اندازِ فکر کی وجہ سے دوطرفہ مخالفت کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف روسی تھے اور دوسری طرف قدامت پرست علماء، جنہیں جدید لوگ رجعت پسند اور نئی روشنی کا مخالف سمجھتے تھے۔ علماء کی قدامت پرستی اور اصلاح دشمنی ہی کی وجہ سے روسی ان کی حمایت کرتے تھے تاکہ انہیں استعمال میں لا کر روس مخالف اسلامی اور قومی تحریکوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے تحریک کو (سیاسی اور نظریاتی بنیاوں پر منقسم) عوامی قوت بنانے کے بجائے انٹلکچول حدود میں رکھا۔ 1917ء کا انقلاب بپا ہوا تو جدت پسندوں نے بالشویکوں کی حمایت کی کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح نہ صرف زارشاہی کی غلامی کا جوا گردن سے اتر جاتا بلکہ کمیونسٹ نظریات میں زیادہ آزادی کے مواقع، جدید نظریات اپنانے اور تعلیمی ترقی کے امکانات بہت بڑھ جاتے۔ دوسرے نقطہ نظر کا مسلم گروہ اسلامی روایات کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے کمیونسٹوں کے خلاف مزاحمت پر اتر آیا۔ 1917ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے والے جدیدیوں نے وسطِ ایشیا میں مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا لیکن انہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سوویت حکمرانوں نے جدیدیوں کو بورژدا اصلاح پسند قرار دے کر ان کے لٹریچر پر پابندی عائد کر دی۔ سٹالن نے حکومت سنبھالتے ہی ان کے خلاف آہستہ آہستہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ 1937ء کے قتلِ عام میں جدیدیوں کو چن چن کر مار ڈالا گیا۔ 1991ء میں آزادی کے بعد مختصر ثقافتی آزادی کے دور میں ازبک دانش وروں نے جدیدیوں کی تصانیف کو دوبارہ شائع کرنے اور انہی مقبول بنانے کی کوششیں شروع بھی کیں مگر انہیں بری طرح دبا دیا گیا۔ ازبک صدر اسلام کریموف جدیدیت میں دلچسپی کے احیاء کی ہر کوشش کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں حالانکہ اس تحریک کا اسلام، قوم پرستی اور جمہوریت کے مابین بقائے باہمی سے بہت گہرا تعلق ہے۔

باب 3

سوویت یونین میں خفیہ تحریکیں

1917ء میں بالشویکوں نے جب ماسکو اور پیٹرز برگ پر قبضہ کیا تو وسطِ ایشیا 1916-17ء کے شدید قحط، جبری ٹیکس، باغیوں کے خلاف زار شاہی فوج کی کارروائیوں، مسلمان دانش وروں کی زیر قیادت بڑھتی ہوئی عوامی سیاسی بیداری اور طاقتور روس مخالف رجحانات کی بدولت شدید سیاسی بحران کا شکار تھا۔ بالشویکوں کو تاشقند میں صرف کسی حد تک دانشورانہ حمایت حاصل ہوئی۔ یہاں روسی النسل کارکنوں اور بعض مسلمانوں نے مل کر تاشقند سوویت کی بنیاد رکھی۔ اپریل 1918ء میں تاشقند کے بالشویکوں نے تاشقند کی خودمختار سوشلسٹ سوویت باقاعدہ قائم کی مگر شہری حدود سے باہر اس کے اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے۔

1917ء میں بالشویکوں نے حقوق کا ایک معاہدہ شائع کیا جس کے مطابق تمام قومی گروہوں کا حقِ خود اختیاری تسلیم کیا گیا تھا۔ اس طرح بالشویکوں کو سابقہ زار شاہی میں موجود لاکھوں غیر روسیوں کی حمایت حاصل کرنے کا سنہری موقع حاصل ہو گیا۔ اس معاہدے کے مطابق مسلمانوں کو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی بھی مکمل آزادی تھی۔ تاہم جلد ہی وسطِ ایشیا کے لوگوں کو یہ سمجھ آ گیا کہ نظریہ خود اختیاری کی' کی جانے والی تعریف میں اس کی حقیقی معنویت بہت محدود تھی۔ حقیقی حق خود اختیاری یا غیر روسی قومی گروہوں کے لئے یونین سے علیحدگی کا حق اس کی بنیاد ہرگز نہیں تھا۔ اس کے برعکس حق خود اختیاری صرف

پرولتاری طبقے کے ساتھ مخصوص تھا ______ اور وسطِ ایشیا میں اس وقت تک پرولتاری طبقے کا وجود ہی نہیں تھا- بالشویک حق خود اختیاری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے بشرطیکہ عظیم تر روس کے وجود کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو- روسی پرولتاریہ زار شاہی کا حصہ بننے سے انکار کر کے اس کا تختہ الٹ سکتی تھی مگر غیر روسی علاقے نئی جنم لیتی بالشویک حکومت سے علیحدگی کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے- ایک مغربی لکھاری جو1918ء میں تاشقند میں تھا' اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتا ہے: ''حق خوداختیاری بالشویکوں کے پروگرام میں شامل تھا اور مقامی مسلمان آبادی یہ سمجھتی تھی کہ یہ حق ان کے اور ان کی95% آبادی کے حوالے سے ہے- لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ حق خود اختیاری بالشویکوں کی رائے میں تاشقند کے حوالے سے قطعی نہیں تھا-''

نظریاتی ہنگامہ خیزی کی مختصر بہار

تاہم انقلاب نے زبردست سیاسی بحث وتمحیص کو جنم دیا اور کچھ عرصے کے لئے سابقہ زار شاہی کی مختلف اقوام کے درمیان زبردست سیاسی بیداری کا احساس پیدا ہوا- نتیجے میں بہت سے مختلف النوع سیاسی رویئے اور نظریات پیدا ہوئے- (کمال یہ ہے کہ آزادی کے بعد اسی طرح کے نظریات نے کسی نہ کسی شکل میں دوبارہ جنم لے لیا ہے-) پہلی دفعہ وسطِ ایشیاء کے لوگوں کو قوم پرستی کا جذبہ محسوس ہوا اور وہ اپنی سرزمین اور اس میں موجود مختلف نسلی گروہوں کے مفادات کی عمومیت اور یکسانیت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئے- اسلامی احیاء سے مشروط یہ جذبہ اس وقت بھی حاوی تھا- یہ قومی تفاخر کئی نئی سیاسی تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہوا- پان ترک ازم نے جدیدیوں اور دوسرے شہری دانشوروں کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ ______ وسطِ ایشیا میں ترکی بولنے والوں کو اکٹھا کر کے ان کے لئے ایک ریاست ترکستان کی تشکیل کی جدوجہد کی- یہ ترک ریاست روسی قبضے سے آزاد اور اسلامی نظریات کے مطابق چلائی جانا تھی- خانہ بدوش نسل کے گروہوں کے درمیان قبائلی قومیت پرستی کی ایک شکل ابھری- مثلاً قازق قبائل نے ''الاش اردہ'' نامی سیاسی جماعت تشکیل دے دی' جسے20-1917 کے درمیانی عرصے میں قازق علاقے کے وسیع حصے میں حکومت بھی کرنے دی گئی-

الاش اردہ کی قوم پرستی جہاں روس مخالف رجحان کی حامل تھی وہاں ازبک جیسے نسلی

گروہوں کے ظلم وستم کی وجہ سے ان کی بھی شدید مخالف تھی- دریں اثناء روایتی علماء اور ملاؤں جو زارشاہی میں سماجی طور پر تنہا ہو کر رہ گئے تھے' کو یہ محسوس ہوا کہ بالشویک حکومت یا مقامی قوم پرستوں کی حکومت میں بھی کہیں وہ بالکل ہی بے اختیار ہو کر نہ رہ جائیں- اس بحرانی دور میں انہوں نے بھی موقع غنیمت جانا اور شریعت کے تحت' ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا نعرہ لگا دیا- وسطِ ایشیا کے بعض مسلمانوں نے کمیونزم کی حمایت شروع کر دی- 1920ء میں جب بالشویکوں نے مسلمان تنظیموں کو آذر بائیجان میں باکو کے مقام پر ایک اہم کانگریس میں مدعو کیا تو مسلم وفود نے اس نعرے کو اپنا لیا کہ مشرق مغرب نہیں ہے- مسلمان روسی نہیں ہیں اور ایک مسلم کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کی اجازت کا مطالبہ کر دیا- نئی مسلم پارٹی کے زبردست وکیل' کازان کے ایک تاتار صحافی اور لکھاری میر سعید سلطان گالیف تھے' جنہوں نے بالشویکوں کی نہ صرف حمایت کی تھی بلکہ وسطِ ایشیا اور کاکیشیا میں دندناتی ہوئی زارشاہی افواج سے مقابلہ کرنے کے لئے سرخ فوج میں ڈھائی لاکھ مسلمانوں کی شمولیت کے لئے زبردست مدد بھی کی تھی- گالیف کو یقین تھا کہ وسطِ ایشیا میں طبقاتی جدوجہد پر قومی جدوجہد کو فوقیت دی جانی چاہیئے اور روسی شاونزم کے خلاف صرف علیحدہ مسلم کمیونسٹ پارٹی اور فوج ہی حاوی ہو سکتی تھی- انہوں نے بالشویکوں کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی کہ مسلمانوں کو مناسب خودمختاری ملنے کی صورت میں کمیونزم اور اسلام شانہ بشانہ چل سکتے ہیں-

1923ء میں زارشاہی افواج کے خلاف خانہ جنگی میں فتح پانے تک بالشویکوں نے اس طرح کے نظریات کو برداشت کیا اور اس کے بعد انہوں نے وسطِ ایشیا کو دوبارہ فتح کرنے اور جماعتی حکومت کی سمت پیش قدمی شروع کر دی- انہوں نے نہ صرف گالیف کو بلکہ ہر اس شخص ـــــــ مسلم کمیونسٹ' جدیدی' ملا' گروہی اور قبائل سردار اور الاش اردہ کے قائدین جیسے قوم پرستوں ـــــــ کو جو بالشویک فلسفے کی مخالفت کر رہا تھا' گرفتار کر لیا- وسطِ ایشیا کی یہ فتح' اس سرزمین کو ہزارہا افراد کے خون سے رنگین کر گئی- بعد کے واقعات میں مثلاً سٹالن کا جبری بندوبست اراضی اور اجتماعی پروگرام (جس میں قبائلی نظام کو صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا گیا) سیاسی صفایا اور اسلام کو مغلوب کرنے کی کوششوں میں لاکھوں انسان اور موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے-

مسلم دنیا میں موجود نو آبادیاتی ریاستوں کے مسلمان' نئے سیاسی نظریات سے مسلح ہو کر

غلامی کا جوا اتار پھینکنے اور نئی آزاد مسلم ریاستوں کی تشکیل میں مصروف تھے مگر وسطِ ایشیا میں سامراجیت کی ایک شکل کی جگہ دوسری مسلط ہو رہی تھی۔ 1917ء سے 1923ء کے درمیانی عرصے میں مختلف رنگا رنگ نظریات کی افزائش ــــــــ خصوصاً یہ بحث کہ اسلام کا کس طرح کمیونزم، نیشنلزم، پان ترک ازم اور جدت پسندی کے متحارب نظریات کے ساتھ ساتھ استنباط کیا جائے؟ ــــــــ بالشویک انقلاب کے بعد ختم ہو کر رہ گئی۔ پیدا شدہ خلا کو فوری طور پر سرکاری ریاستی جماعت، روسی کمیونسٹ پارٹی (جسے بعد میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا نام دیا گیا) نے پر کر دیا۔ اگلے سات عشروں تک وسطِ ایشیا خارجی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا کیونکہ سوویت یونین نے ایران، ترکی، افغانستان اور بعد ازاں چین کے ساتھ بھی اپنی سرحدیں مکمل طور پر بند کر دی تھیں۔ 1980ء کے عشرے میں پریسٹرائیکا کے نظریئے کی آمد کے ساتھ ان بند راستوں میں سے کچھ کھلنا شروع ہوئے۔ اس دوران وسطِ ایشیا کے لوگ ان سیاسی نظریات سے قطعی لاعلم تھے جنہوں نے بیسویں صدی کو نئی شکل دی۔ وہ سرحد پار چلنے والی اسلامی تحریکوں اور ان کے تصورات سے بھی قطعی ناآشنا تھے۔ 1991ء میں جس وقت وسطِ ایشیا آزادی سے ہمکنار ہوا، نظریاتی اعتبار سے اس کے باشندے 1920ء کے عشرے ہی میں سانس لے رہے تھے۔ 1923ء اور اس کے بعد کمیونسٹوں کی ستم رانیوں کا وسطِ ایشیا کے موجودہ بحران سے براہ راست تعلق ہے، جنہوں نے اس علاقے میں نظریاتی اور سیاسی ارتقاء کو جامد کر کے رکھ دیا تھا۔

یہ بات نہیں کہ سوویتائزیشن کا عمل بغیر کسی مخالفت کے بڑھتا چلا گیا تھا۔ فروری 1928ء میں مولویوں اور مذہبی پیشواؤں کی قیادت میں، کسانوں اور مزدوروں نے بھی شدید بغاوت کر دی تھی۔ پہلی بسماچی بغاوت میں بہت سے آزاد گوریلا گروپس شامل تھے جو ترکمانستان اور تاجکستان کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ گروہ اپنی اپنی جگہ مختلف مقاصد ــــــــ جہاد، شریعت، ترک نیشنلزم، اینٹی کمیونزم ــــــــ کے لئے برسرِ پیکار تھے۔ ان تمام لڑائیوں میں جو 1929ء تک جاری رہیں۔ بسماچی بدستور اپنے اپنے قبیلوں اور فرقوں میں منقسم رہے۔ انہوں نے نظریاتی طور پر مشترکہ قیادت یا باہمی یکجہتی پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی تقسیم کی بدولت سوویت یونین کے خلاف ان کی مزاحمت کمزور پڑتی گئی تاہم انفرادی قیادتوں اور گروہوں نے اس مزاحمت کا سلسلہ اگلے دس سال تک جاری

رکھا- یومت قبیلے کے ایک مالدار زمیندار محمد قربان جنید خان نے______ جنہیں ترکمان قبائل نے اپنا سردار چن لیا تھا______1927ء تک انتہائی دلیرانہ مزاحمت جاری رکھی- بعد ازاں انہیں جبری جلا وطنی کے ذریعے افغانستان بھیج دیا گیا- انگریزوں نے اس مزاحمت میں بسماچیوں کی بہت مدد کی- وہ سوویت یونین کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے اور بسماچیوں کو ہندوستان سے گولہ بارود اور اسلحہ کے اونٹ بردار قافلے بھیجتے رہے-

آخری بسماچی بغاوت تاجکستان میں1929ء میں کچل دی گئی- بہت سے بسماچی رہنما اور ان کے ہزارہا ازبک' تاجک اور ترکمان ہمدرد افغانستان کی طرف فرار ہو گئے- پچاس سال بعد بسماچی نظریات کی چنگاریوں نے پھر بغاوت کی آگ بھڑکا دی- اس دفعہ افغانستان پر روسی حملے کے خلاف' اس نے افغان مجاہدین کو مزاحمت کی تحریک دی- تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا- اس دفعہ برطانیہ کے ساتھ امریکہ نے بھی اشتراک کر لیا اور وسطِ ایشیائی ممالک میں اسلامی حمیت کو ابھارنے کے لئے مجاہدین کو استعمال کرنا شروع کر دیا- وہ اس طرح سوویت وسطِ ایشیا میں سیاسی مزاحمت پیدا کرنا چاہتے تھے-

مسلمانوں پر تشدد

وسطِ ایشیا میں بسماچی مزاحمت کے دوران سٹالن نے بغاوتوں کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ سوچا کہ انہیں تنہا کر دیا جائے' چنانچہ اس نے ترکستان کو پانچ ریاستوں میں تقسیم کر کے اس کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا- نئی سرحدیں جغرافیائی یا نسلی بنیاد پر بنانے کے بجائے صرف اس مقصد کو مدنظر رکھ کر قائم کی گئیں کہ مزاحمت کا خاتمہ کس طرح ہو سکتا ہے- وادی فرغانہ کو تین جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا گیا اور سرحدیں اس طرح ابھاری گئیں کہ قبائل' گاؤں اور مذہبی گروہ منقسم ہو کر رہ گئے- تاجکوں کو ان کی ریاست ضرور دی گئی مگر اس کے اہم ترین ثقافتی اور معاشی مراکز بخارا اور سمرقند اس میں شامل نہیں تھے- یہ دونوں شہر ازبکستان کو مل گئے- بہت سے تاجکوں نے خود کو ایسی جمہوریتوں کا باسی پایا جہاں دوسرے لسانی گروہوں کی اکثریت تھی- ترکمانستان پر عرصہ دراز تک براہِ راست روسیوں کی حکومت رہی- بغاوت کا خاتمہ تو ایک طرف رہا' یہ مصنوعی اکائیاں بہت سے علاقائی تضادات' سرحدی اور آبی تنازعات اور ذیلی ڈھانچے کے مسائل کا باعث بن گئیں- یہ سب مسائل آج بھی وسطِ

ایشیاء کے لئے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔

اسلامی مزاحمت کو کچلنے کی طرح1920ء کے عشرے کے آخر میں اجتماعیت کے نام پر آزادمنش قازق، کرغیز اور ترکمان قبائل کو نشانہ بنا لیا گیا۔31-1930ء کے دوران مویشیوں کی جبری اجتماعی ملکیت کی مہم کے دوران لاکھوں قازق اور کرغیز چین کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعض ماہرین کے اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ قازق ہجرت، قتل و غارت، قحط زدگی یا اور وجوہات کی بنا پر لاپتہ ہو گئے۔ یہ لوگ قازقستان کی کل آبادی کا ایک تہائی تھے۔ گڈریئے اپنے مویشی ریاست کی تحویل میں دینے کے بجائے، انہیں مار ڈالنا مناسب سمجھتے تھے۔ قازقستان میں مویشیوں کی تعداد1929ء میں چوہتر لاکھ تھی جو1933ء میں سولہ لاکھ رہ گئی۔ بھیڑوں کی تعداد 2 کروڑ 2 لاکھ کے بجائے صرف سترہ لاکھ رہ گئی۔ بہت سے کرغیز قبائل تو1924ء میں ہی چین چلے گئے جب سرخ فوج ان کے مویشیوں اور گلوں کے اعداد وشمار جمع کرنے علاقے میں آئی تھی۔ ایک یورپی عینی شاہد کے مطابق پانچ لاکھ کرغیز اپنے ہمراہ یاکوں، گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کے سارے گلے چین لے گئے تھے۔''حدنظر تک، اونٹوں کے قافلوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ لگتا تھا علاقے کے سارے مویشی ہی اس میں شامل تھے، جو سوویت اہلکاروں سے بچنے کے لئے نکلے جا رہے تھے_____ اس وقت مجھے یہ شبہ ہوا کہ شاید میں آزاد کرغیزوں کا آخری مارچ دیکھ رہا ہوں۔''1917ء اور 1927ء کے عشرے کے دوران اندازاً چوتھائی کرغیز آبادی فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

تاہم ان جابرانہ کارروائیوں کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ بہت سی ترقی پسندانہ اصلاحات بھی لائے۔ تعلیم اور حفظان صحت کو عام کیا گیا۔ صنعتی نشوونما ہوئی۔ کاشت کاری اور آب رسانی میں زبردست میکانائزیشن ہوئی۔ اور روس سے براہِ راست مربوط، جدید اطلاعاتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا۔ بلاشبہ مقصد یہی تھا کہ وسطِ ایشیا کی پیداوار، خام مال، معدنیات وغیرہ کی روسی علاقوں کی جانب منتقلی کو آسان بنایا جائے۔ چنانچہ وسطِ ایشیا روسی صنعتوں کے لئے نو آبادی بن کر رہ گیا اور بعد ازاں آبادی کا بوجھ کم کرنے کے لئے لاکھوں روسیوں کو جبری طور پر یہاں بھیج دیا گیا تاکہ وہ زمین آباد کر سکیں اور فیکٹریاں چلا سکیں۔

اپنی قوت کو پوری طرح مرتکز کرنے کے بعد سوویت حکمرانوں نے وسطِ ایشیا میں اسلام کے عمومی اور عملی نفوذ کو روکنے کے لئے تعزیری اقدامات شروع کر دیئے۔ کمیونسٹ پارٹی نے

تمام مذہبی مشاہدات کو بورژوا ابتری قرار دے دیا اور تمام مذاہب اور اعتقادات پر مکمل پابندی عائد کر دی- اسلام کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا کیونکہ اسے دقیانوسی اور رجعت پسند سمجھا جاتا تھا- روسی اس سے خوفزدہ بھی تھے کیونکہ بسماچی مزاحمت کے دوران انہیں تجربہ ہو گیا تھا کہ اسلام کمیونسٹ حکمرانی کے لئے حقیقی سیاسی اور مذہبی مزاحمت کی بھرپور قوت رکھتا ہے- انہوں نے اسلام کو ایک رجعت پسند قوت قرار دیا جسے ان انگریز سامراجیوں کی حمایت اور مدد حاصل تھی جو انقلاب کو کمزور کر کے ترقی اور تعلیم کا راستہ روکنا چاہتے تھے-

مساجد کو بند کر کے ورکشاپوں میں بدل دیا گیا- اسلامی عبادات اور مجالس پر پابندی لگا دی گئی- عورتوں کو پردہ کرنے سے روک دیا گیا- بچوں کیلئے قرآن پڑھنا اور سیکھنا ممنوع ہو گیا- یہاں تک کہ اجتماعی ملکیت کے پروگراموں میں بھی اسلام مخالف عنصر شامل تھا- 1917ء میں روسی سلطنت میں لگ بھگ بیس ہزار مساجد موجود تھیں-1929ء میں چار ہزار سے بھی کم مساجد زیر استعمال تھیں اور1935ء تک ازبکستان میں صرف ساٹھ مساجد، ترکمانسان میں صرف چار اور قازقستان میں صرف بیس مساجد رجسٹرڈ تھیں- لاکھوں مسلمانوں کے لئے کوئی مقامی مساجد نہیں تھیں اور مدارس پر مکمل پابندی عائد تھی-

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ 1941ء میں سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے سے صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی- سب لوگوں کو جنگ میں شریک کرنے کی ضرورت کے پیش نظر سٹالن نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے چار اسلامی روحانی مراکز قائم کئے- ان کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنا بلکہ مسلمان آبادی پر بہتر کنٹرول بھی مقصود تھا- وسطِ ایشیا اور قازقستان کا اسلامی ڈائریکٹوریٹ تاشقند میں قائم کیا گیا- دوسرے مراکز یوفا روس میں (یورپین روس اور سائبریا کے لئے) باکو، آذربائیجان (ٹرانس کاکیشیا)، بوئناکسک، داغستان (شمالی کاکیشیا) میں واقع تھے- جنگ کے سالوں میں وسطِ ایشیا کو وسیع پیمانے کی صنعتوں کی نشوونما کا فائدہ بھی حاصل ہوا کیونکہ سٹالن نے ساری کی ساری روسی فیکٹریاں سرحدی علاقوں سے وسطِ ایشیا میں منتقل کر دی تھیں تاکہ انہیں جرمن بمباری سے محفوظ رکھا جا سکے- ساتھ ہی ساتھ سٹالن نے وسطِ ایشیا کو ایسے نسلی گروہوں کے لئے ڈمپنگ گراؤنڈ بھی بنا دیا، جنہیں سوویت حکمران جرمنوں کا طاقتور حامی تصور کرتے تھے- ان آبادیوں کو پورے کا پورا کاکیشیا اور یوکرائن سے نکال کر یہاں لے آیا گیا-23 فروری1944ء کو سٹالن نے پانچ

لاکھ چیچنوں کو وسطِ ایشیا اور سائبریا کی جانب زبردستی بھیج دیا- ان میں سے ایک تہائی راستے میں یا جلا وطنی کی حالت میں مارے گئے- وسطِ ایشیائی جمہوریتوں کی تشکیل کے بعد انہی پالیسیوں کی بدولت علاقے میں بحرانی کیفیت پیدا ہوئی اور اس سے ایسے مسائل نے جنم لیا جو آج تک جاری و ساری ہیں-

جنگ عظیم دوم کا خاتمہ ہوتے ہی مسلمانوں کے خلاف ظلم و تشدد کا بازار پھر گرم ہو گیا- بلکہ مئی 1944ء میں جنگ کے خاتمے سے پہلے ہی حکومت نے مذہبی رسوم و رواج کے امور کی کونسل بنا ڈالی جو بعد ازاں اسلام اور مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے سوویت یونین کا اہم ترین ریاستی ادارہ بن گیا- سوویت یونین نے قانونی طور پر اسلام کو محض رسم و رواج اور روایات کا مجموعہ قرار دے دیا - جونہی ماسکو نے اسلامی تمدن اور ثقافت کو مٹانے کے لئے اپنی زبردست مہم شروع کی، مزید مساجد کو بند کر دیا گیا- تاہم نکیتا خردشچیف کے دور میں (1955-58ء) مختصر سا آزادی کا جھونکا آیا- یہ سٹالن کی سخت پالیسیوں کو نرمانے کی خردشچیف حکمت عملی کا حصہ تھا تاہم جلد ہی ایک اور کریک ڈاؤن سر پر آن پہنچا-

1960ء کے عشرے میں سوویت حکمرانوں نے ایک اور راستہ اختیار کیا- وسیع مسلم دنیا میں سوویت خارجہ پالیسی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ماسکو نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ روسی سماج میں اسلام کے خلاف قطعی کوئی بغض و عناد نہیں- ایک باقاعدہ حکمت عملی تیار کی گئی جسے روسی مخالفوں نے ''سرکاری اسلام'' کا نام دیا- اس کے تحت تاشقند اور بخارا میں دو مدرسے قائم کئے گئے جس میں مولویوں کو اسلامی اور سوویت دونوں طرح کے مضامین کی تعلیم دی جانے لگی- ریاست کے منظور شدہ ان مولویوں کو مساجد میں مقرر کیا جاتا تھا- بعض طلبہ کو ملک سے باہر (عموماً جامع ازہر، مصر میں) اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے کی اجازت بھی دی گئی- مسلمانوں کے مقدس امام کا احترام کیا جانے لگا- بعض مسلمانوں کو حج اور مشرقِ وسطیٰ کے مقدس مقامات کی زیارت کی اجازت بھی دی گئی- سوویت حکومت نے بہت سے غیر ملکی مسلمان وفود کو تاشقند کے دورے کی بھی دعوت دی تاکہ وہ اسلام اور سوشلزم کے متوازن ربط کا عملی مظاہرہ دیکھ سکیں-

آخری اسلام مخالف صلیبی جنگ، میخائیل گورباچوف نے اپنے ''آزاد روی'' کے پریسٹرائیکا پروگرام کے تحت شروع کی جس میں اسلام کو جدیدیت کا دشمن اور وسطِ ایشیا کے

نسلی گروہوں میں روس مخالف جذبات کو بھڑکانے کا مرکزی نکتہ تصور کیا گیا تھا- گورباچوف کی ذاتی اسلام دشمنی کے نظریات کو وسطِ ایشیائی رہنماؤں نے مزید تقویت بخشی جو عوامی سطح پر اسلامی احیاء سے خوفزدہ تھے کیونکہ اس کے نتیجے میں زیادہ جمہوریت اور آزادی کے مطالبات شروع ہو جاتے اور اس طرح مقتدر حلقوں کو شدید خطرات لاحق ہو جاتے-

اسلام زیرِ زمین

سوویت دور میں زیرِ زمین چلے جانے کے باوجود ''غیر سرکاری اسلام'' ہی تھا جو حقیقی نظریات اور عقاید کا حامل تھا- غیر رجسٹرڈ مساجد خفیہ طور پر بنائی جانے لگیں- اگر حکام کسی جگہ ایک مسجد کو بند کر دیتے تو فوراً ہی کہیں اور ایک نئی مسجد قائم ہو جاتی- ایک اندازے کے مطابق ازبکستان میں1945ء میں چھ سو غیر رجسٹرڈ مساجد موجود تھیں- جبکہ تاجکستان میں پانچ سو سے زیادہ امام بارگاہیں موجود تھیں جہاں سات سو سے زیادہ مولوی موجود تھے- مقدس ایام میں ان مقامات پر ہزاروں افراد جمع ہوا کرتے تھے- لوگوں نے گھروں میں مدرسے بنا رکھے تھے- وہ رات کے وقت نماز پڑھنے اور دوسری مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے اکٹھے ہوا کرتے تھے- وہ مقدس مقامات اور مزاروں پر جانے کے لئے اور انہیں مخفی رکھنے کے لئے کمیونسٹ ایام رخصت کا انتخاب کرتے- خفیہ مساجد اور مدارس قبرستانوں میں قائم کئے جاتے تھے تاکہ زندہ اور مردہ دونوں طرح کے انسانوں سے ملاقات کی جا سکے- خانہ بدوش مولوی اور فقیر، مقامی کمیونسٹوں کی نظروں سے بچتے بچاتے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں مذہبی طور طریقوں کی تعلیم کے لئے جاتے رہتے تھے- مقامی آبادیوں کے چندوں پر ان کا گزارا چلتا تھا-

1960ء تک ایک اندازے کے مطابق صرف تاجکستان میں چھ ہزار غیر رجسٹرڈ مولوی تھے- وادی فرغانہ بھی خانہ بدوش علماء کا ایک بڑا مرکز تھی- یہ لوگ حکمرانوں سے بچ بچا کر وسطِ ایشیا کے طول و عرض میں پھرتے پھراتے اپنی زندگیاں کاٹ دیتے تھے- وادی میں خفیہ مدارس کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی- وسطِ ایشیا کے دور دراز علاقوں سے بچے پڑھنے کے لئے فرغانہ آیا کرتے تھے- اس دوران اسلام کی بقا کے لئے خفیہ صوفی جمیعتوں یا صوفی طریقت نے بھی زبردست کردار ادا کیا- خفیہ مبلغوں نے صوفیوں کی تعداد اور اس کی

مقبولیت کے اضافہ میں انتھک کام کیا- منظّم صوفی گروہ خفیہ طور پر مذہبی لٹریچر بھی چھاپا کرتے تھے- یہ لٹریچر وسیع پیمانے پر تقسیم ہوتا تھا- غیر مقلد روسی لکھاریوں کے مضامین کے مماثل، یہ مزاحمتی ادب مغربی اور مسلمان سکالرز کی توجہ حاصل نہیں کر سکا-

مقامی کمیونسٹ پارٹیوں کے اندر بھی بعض حکام نکاح، پیدائش اور اموات کے اہم مواقع پر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے مولویوں اور صوفیوں کی خدمات خفیہ طور پر حاصل کیا کرتے تھے- (روسیوں کے ساتھ مخلوط شادیاں نہ ہونے کے برابر تھیں- صرف تعلیم یافتہ قازق اور کرغیز شہری باشندے مذہب سے کم تعلق کے باعث ایسی شایاں کر لیتے تھے-)1989ء میں، میں نے ایک ایسی ہی خفیہ مسلمان شادی وادی فرغانہ کے ایک اجتماعی فارم میں سرانجام پاتے دیکھی- شادی مقامی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں رجسٹر کی گئی- یہ قانونی مجبوری تھی- دلہن نے سفید لباس پہنا ہوا تھا- لیکن گھر واپس آتے ہی دلہن نے اپنا سفید لباس اتارا اور روایتی ازبک کپڑے زیب تن کر لئے- ایک غیر رجسٹرڈ مولوی نے اسلامی طریقے کے مطابق ان کا نکاح پڑھایا- اس رات خفیہ طور پر ایک بھیڑ ذبح کی گئی اور ہر شخص اس کے پکائے جانے تک گانے اور ناچنے میں مصروف رہا- سکیورٹی پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لئے شادی کا کھانا صبح سویرے دیا گیا لیکن اس شادی میں کمیونسٹ پارٹی کے مقامی اراکین بھی شریک تھے اور فارم کے کارکنوں کے ساتھ انہوں نے بھی شادی کے پروگرام کا خوب لطف اٹھایا- بعد ازاں وہ سب اپنے اپنے کاموں کے لئے اس طرح چل دیئے جیسے وہ رات بھر سو کر ابھی اٹھے ہوں- جہیز اور دلہن کی قیمت____ سوویت قانون کے مطابق غیر قانونی____ لڑکے کے خاندان کی جانب سے رقم کی بجائے جیولری، فرنیچر اور بھیڑ کی شکل میں ادا کئے گئے-

اسلام کو زندہ رکھنے میں عورتوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا- انہوں نے نہ صرف گھروں میں اسلامی روایات اور تمدن کو قائم رکھا بلکہ صوفیا کے مراکز____ جہاں لوگ ہر ہفتے نماز پڑھنے کے لئے اکٹھے ہوتے تھے، کی صفائی ستھرائی اور انتظامی معاملات میں بھی خفیہ طریقے سے مدد کرتی رہیں-1990ء کے عشرے میں میں نے پامیر کی پہاڑیوں میں واقع چند ایسے ہی صوفی مراکز کا دورہ کیا- میں نے خاص طور سے محسوس کیا کہ مقامی دیہاتی، سوویت جبر کے دور میں ان مراکز کا خیال رکھنے والی خواتین کو عزت و احترام اور محبت کی نظر سے دیکھتے

تھے- ماسکو میں بیٹھے حکمرانوں کو غالبًا ان ساری رسوم اور طریقوں کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا یا پھر وہ عین اپنی ناک تلے ہونے والے ان معاملات کو نظر انداز کرنے کی ایکٹنگ کرتے تھے- وسطِ ایشیائی کمیونسٹ پارٹیوں کے مسلمان اراکین یقیناً خفیہ اسلامی رسوم و رواج کے بارے میں جانتے تھے مگر وہ اپنی معلومات کو ماسکو پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے- جزوی طور پر وہ اپنے ہم وطنوں اور مولویوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ روسیوں کو ذہنی اذیت پہنچانے میں فخر بھی محسوس کرتے تھے- سوویت جس طرح مسلم اور غیر مسلم دنیا کے درمیان حائل خلیج کو ختم نہیں کر سکے، اسی طرح روسی اور وسطِ ایشیائی باشندوں کی باہمی دوری کو بھی قربت میں نہیں بدل سکے- وسطِ ایشیاء کے عوام کے درمیان گروہی، علاقائی اور مذہبی اتفاق اور یک جہتی کو قائم رکھنے میں اسلام نے بنیادی کردار ادا کیا- کمیونسٹ نظام تو ماضی کے ہر ثقافتی نشان کو مٹانے کے درپے تھا مگر مقامی کمیونسٹ پارٹیاں ـــــ جن کے اکثر اراکین مسلمان تھے ـــــ درحقیقت علاقائی اور مذہبی اتحادوں کی بنیاد پر تشکیل پاتی تھیں- سمرقند، تاشقند اور وادی فرغانہ کی ازبک اشرافیہ کے درمیان ازبک کمیونسٹ پارٹی تک میں روایتی رقابتیں جاری رہتی تھیں- سنٹرل کمیٹی کی مجبوری یہ تھی کہ اسے پارٹی میں تمام علاقوں کے لوگوں کو نمائندگی دینی پڑتی تھی- قازقستان اور کرغیزستان کی مقامی کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی مختلف علاقوں کے درمیان ایک مناسب توازن قائم کر رکھا تھا جبکہ ترکمانستان میں تین بڑے قبائل کو نمائندگی دی گئی تھی- تاجکستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں ازبک اور تاجک کے ملغوبے نے قبائل اور لسانی گروہوں میں شدید علاقائیت پرستی کو جنم دیا- زمین کی مشترکہ ملکیت کے فلسفے کے تحت بڑے بڑے فارموں کا قیام بھی اس سلسلے کو روک نہیں پایا- بلکہ یہی اشتراکی فارم ایک قبیلے یا علاقے کے اکٹھے کام کرنے کی وجہ سے گروہی یکجہتی کو مزید طاقتور بنانے کا ذریعہ بن گئے-

پریسٹرائیکا کے تحت اسلامی محاربت کا عروج

1980ء کے عشرے کے وسط میں صدر میخائیل گورباچوف نے اپنی پریسٹرائیکا کی حکمت عملی کے تحت سماجی اور سیاسی پالیسیوں میں کسی حد تک آزادروی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا- ان آزادیوں میں مذہبی رسومات پر پابندیوں کا خاتمہ شامل نہیں تھا لیکن پورے روس میں

لوگوں نے اس معاملے کومختلف انداز میں لیا اور تقریباً ہر جگہ ہی مذہبی رسم و رواج کا فوری احیا ہونے لگا- خصوصاً روسی حکمران طبقہ وسطِ ایشیا میں اسلام سے دلچسپی کے برملا اظہار سے بری طرح چکرا کر رہ گیا- ہزارہا مساجد تعمیر کر ڈالی گئیں- قرآن اور دوسرا سلامی لٹریچر سعودی عرب اور پاکستان سے منگوایا گیا اور آبادیوں میں مفت تقسیم کیا گیا اور فارموں اور دیہاتوں میں راتوں رات روپوش مولوی باہر آ کر کھلم کھلا نمازوں کی پیش وائی کرانے لگے-

اس ''دھماکے'' کی بنیادی وجہ بلاشبہ یہ تھی کہ سوویت جبر کے بدترین دور میں بھی اسلام نے اپنا وجود برقرار رکھا- سوویت حکمرانوں نے اسے جتنا ختم کرنے کی کوشش کی، نسلی، علاقائی اور مذہبی مزاحمت کے نتیجے میں یہ اور بھی شدت کے ساتھ وسطِ ایشیا میں پھیلتا چلا گیا- لیکن اسی دوران بہت سے خارجی عوامل نے بھی اسلام کے احیاء میں مدد کی- ان نئے عوامل کی بدولت وسطِ ایشیائی اسلام میں ایک نیا پریشان کن رویہ پیدا ہو گیا- ایک ایسا رویہ جو آج بھی پوری طرح حاوی نظر آتا ہے اور وہ تھا اسلامی محاربت کا آغاز- واضح طور پر یہ رویہ روایتی اسلام کی پیداوار ہونے کے بجائے خارجی اسلامی دنیا کے نظریات کے زیر اثر پروان چڑھا-

1980ء کے عشرے میں ہزارہا علاقائی نوجوانوں کو افغان مجاہدین سے مقابلے کے لئے سرخ فوج میں بھرتی کیا گیا- یہ مجاہدین1979ء سے اپنے ملک پر سوویت حملے کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے- وسطِ ایشیائی مسلمانوں کو یہاں اسلامی دنیا کے بارے میں جاننے کا موقع ملا- وہ یہاں اپنے ہی ہم مذہبوں سے جنگ لڑ رہے تھے، چنانچہ اپنے مخالفوں کی اسلام محبت سے وہ بے پناہ متاثر ہوئے- قیدی ہونے والے وسط ایشیائی فوجی عموماً مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو جاتے تھے- جنگ کے تسلسل نے اس صورت حال کو اور وسعت دی- امریکہ، برطانیہ، پاکستان اور سعودی عرب بھی اس میں ملوث ہو گئے-

1986ء میں امریکہ، برطانیہ اور پاکستان کی سیکرٹ سروسز نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ جنگ کے دائرے کو گوریلا حملوں کے ذریعے تاجکستان اور ازبکستان تک پھیلا دیا جائے- افغانستان میں سوویت افواج کے لئے ہر طرح کی رسد انہی علاقوں سے آتی تھی- افغان مجاہدین نے دریائے آمو عبور کر کے مارچ1987ء میں تاجکستان کے دیہاتی علاقوں پر راکٹوں سے حملہ کیا- سینکڑوں ازبک اور تاجک مسلمان خفیہ طریقوں سے پاکستان اور

سعودی عرب کے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے یا گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کرنے جا پہنچے تاکہ وہ مجاہدین کے ساتھ شامل ہوسکیں- دنیا بھر سے انقلابی مسلمانوں کو بھرتی کرنا ـــــ تاکہ وہ افغان مجاہدین کی ہمراہی میں لڑسکیں ـــــ امریکہ، پاکستان اور سعودی عرب کے وسیع تر منصوبے کا ایک حصہ تھا-

1982ء اور 1992ء کے دوران تینتالیس اسلامی ممالک کے پینتس ہزار انقلابی مسلمان افغان مجاہدوں کے ساتھ لڑتے رہے- ہزارہا طلبہ نے پاکستان کے سرکاری زیر سرپرستی مدارس میں تعلیم حاصل کی- نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا کے لگ بھگ ایک لاکھ انقلابیوں کا پاکستان اور افغانستان سے براہِ راست رابطہ ہوگیا-

لیکن جلد ہی مسلمانوں نے افغانستان کی حدود سے باہر بھی حملے کرنے شروع کر دیئے-1980ء کے آخری سالوں میں پاکستان کے اہم دیو بندی مدارس نے وسطِ ایشیا کے طلبہ کے لئے مخصوص جگہیں مختص کر دیں، جہاں انہیں مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ مناسب گزارہ الاؤنس بھی ملتا تھا- کافی عرصے تک دیو بندی مدارس وسطِ ایشیا کے ان طلبہ کے بارے میں مختلف کہانیاں سناتے رہے جو خفیہ طور پر بلا پاسپورٹ یا ویزے کے یہاں آئے ہوئے تھے اور انہیں باقاعدہ سکالرشپ دیئے جاتے تھے- یہ تمام طلبہ ایک بڑی جنگ کے لئے تیار کئے جا رہے تھے-1989ء میں میری ملاقات چند ازبک اور تاجک انقلابیوں سے افغانستان میں ہوئی- انہیں یقین تھا کہ افغانستان کی فتح سارے وسطِ ایشیا میں انقلابات کا دروازہ کھول دے گی- دیو بندی فرقہ ـــــ جہاں انہیں جہادی تربیت دی جاتی تھی ـــــ سنی اسلامی خیالات کے احیاء کا داعی ہے اور یہ انیسویں صدی میں برطانوی ہند میں قائم ہوا تھا- اس نے بعض دوسرے سنی فرقوں کے ساتھ اسلامی تصورات کو پاکستان (افغانستان اور بعد ازاں وادی فرغانہ) میں انقلابی بنانے میں خاصی مدد کی- دیو بندی شیعہ فرقے سے نفرت کرتے تھے- عورتوں کا عملی کردار ان کی رائے میں خاصا محدود تھا- لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر میں سنیوں میں جہاد کے فلسفے کا احیا ان کا اہم ترین کارنامہ تھا- پہلے جہاد کا تصور صرف ایرانی شیعوں تک محدود تھا' اسی کے نتیجے میں ایرانی انقلاب نے جنم لیا-

بہرحال 1990ء کے عشرے میں پاکستانی دیوبندی مدارس نے طالبان قیادت کو تعلیم

دینے میں اہم کردار ادا کیا- جہاد ان کے پروگرام کا ایک اہم حصہ تھا- تاہم دیوبندیوں کو وسطِ ایشیا میں جہادیوں کے درمیان بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا- دیوبندی طالبان نے اسلامی انقلابیوں کی نسل پر ــــــ جنہوں نے بعد میں اسلامی ازبک تحریک تشکیل دی ــــــ گہرا اثر ڈالا اور ان کے سیاسی تصورات اور جہاد کے نظریئے کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا- تاجکستان کی مسلمان اپوزیشن افغان تاجک فوجی کمانڈر احمد شاہ مسعود سے بہت متاثر تھی کیونکہ اس کے اسلامی نظریات کا تاجک قوم پرستی سے گہرا تعلق تھا- اس طرح ازبک اور تاجکوں، ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان طویل عرصے سے موجود تقسیم، انقلابی اسلام کے نئے تصورات کے بہاؤ میں بھی اپنی جگہ کام دکھاتی رہی- ازبک جہادی پاکستان اور افغانستان کے پشتونوں اور بعد ازاں طالبان کی زیر قیادت اسلامی انقلاب میں بے پناہ کشش محسوس کرتے تھے- تاجکوں کو اپنا پسندیدہ ہیرو تاجک افغان نسل کے مجاہدوں میں نظر آتا تھا- غرض پاکستان اور افغانستان دونوں نے مل کر انہیں وسطِ ایشیا میں اسلامی انقلابی تصورات پھیلانے کے عمل میں شریک کر لیا-

ایک اور اہم سنی فرقہ وہابیوں کا تھا، جنہوں نے افغان جنگ (اور سوویت یونین کی شکست و ریخت) کے نتیجے میں وسطِ ایشیا میں قدم جمانے کی کوشش کی- وہابی فرقے کے ڈانڈے اٹھارویں صدی کی اس تحریک سے جا ملتے ہیں جو سعودی عرب کے عبدالوہاب کی زیر قیادت، عرب بدوؤں میں صوفی طریقت کو ختم کرنے کے لئے چلائی گئی تھی- سعودی شاہی خاندان نے بیسویں صدی میں وہابی مسلک کو ریاست کے قانون کا درجہ دے دیا اور 1970ء کے عشرے میں تیل کی گرم بازاری کے دوران وہابیت کی تبلیغ کو اپنی خارجہ پالیسی کا ایک اہم حصہ بنا لیا- اگرچہ وہابی پہلے پہل وسطِ ایشیا میں 1912ء میں پہنچے تھے، جب وہاں مدینہ کے ایک شہری سید شرع محمد نے وادی فرغانہ میں وہابی مسلک کے کچھ مراکز بنائے- یہ سادہ مزاج فرقہ ــــــ جو نہ صرف صوفیت کے خلاف تھا بلکہ مزاروں پر عبادت کا بھی مخالف تھا ــــــ وسطِ ایشیا کی معتدل اسلامی روایات کو توڑنے کی وجہ سے کبھی مقبولیت حاصل نہیں کر سکا- لیکن 1980ء کے عشرے میں جونہی سعودی عرب نے افغان مجاہدین اور بعد ازاں وسطِ ایشیائی علماء (جن میں سے اکثر سعودی مدارس میں زیر تربیت رہے تھے) کو مالی مدد دینا شروع کی، آہستہ آہستہ ان علاقوں میں وہابیت کے اثرات مرتب ہونے لگے-

جونہی انہوں نے وسطِ ایشیا کے مختلف مسائل کو اجاگر کرنا شروع کیا، یہاں کی مختلف جمہوریاؤں کے حکمرانوں کی کوتاہ نظری اور ظالمانہ ردِعمل نے وہابی مسلک کو مزید تقویت دی۔ مثلاً 1992ء میں ازبک حکومت نے ہر اس شخص پر جو اسلامی انقلاب کا حامی سمجھا جاتا یا حکومت مخالف خیالات کو اسلامی نظریات کا حصہ سمجھتا، وہابی کا لیبل چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ 1997ء تک حکومت غیر سرکاری مساجد میں عبادت کرنے والوں یا اکیلے میں نماز پڑھنے یا اسلامی تعلیم لینے والے عام مسلمانوں کو بھی وہابی قرار دے رہی تھی۔ غیر رجسٹرڈ پیش امام سے ربط بڑھانے والے یا بچوں کو قرآن پڑھانے اور سکھانے والے مسلمانوں کو بھی وہابی کہا جانے لگا۔ آج کل حکومت تمام مسلمانوں کو انتہا پسند وہابی مسلک سے منسلک کر کے دراصل انہیں ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حکمران طبقوں میں اسلامی تصورات سے لاعلمی بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ وہ محض غلط لیبل چسپاں کر کے ہر طرح کی اسلامی سرگرمیوں کو بری طرح دبانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس عمل کے ذریعے وہابی فرقے کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ عام مسلمان اس فرقے کو جبر و ستم کا نشانہ بننے والے مخلص اور ایماندار مسلمان سمجھنے لگے ہیں۔ اس طرح انہیں وسطِ ایشیا میں اپنے قدم جمانے اور تحریک کو مسلسل آگے بڑھانے میں یقیناً مدد ملے گی۔

وسطِ ایشیا میں سوویت یونین کا دورِ انحطاط

12 دسمبر 1991ء کو پانچ وسطِ ایشیائی جمہوریاؤں کے صدور ـــــــ نور سلطان نذر بایوف (قازقستان)، رحمان نبی یوف (تاجکستان) عسکر آقایوف (کرغیزستان)، اسلام کریموف (ازبکستان) اور سپر مراد نیازوف) ترکمانستان) عاشق آباد میں مل بیٹھے۔ موضوع تھا اس علاقے سے دور یورپی براعظم میں پیدا شدہ بحران۔ صرف چار دن پہلے روس، یوکرائن اور بیلا روس کے صدور نے منسک ٹریٹی پر دستخط کر کے سابقہ سوویت یونین کا خاتمہ کر دیا اور آزاد ریاستوں کی نئی دولتِ مشترکہ بنا ڈالی۔ ان رہنماؤں نے اتنا اہم قدم اٹھانے سے پہلے وسطِ ایشیا میں اپنے ساتھیوں سے مشورے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

اس سرد اور برفیلی شام، عاشق آباد ایئر پورٹ پر، میں نے ان رہنماؤں کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں دور سے ہی ان کے غم و غصے، بے وفائی اور پریشانی کا احساس اچھی طرح

جان سکتا تھا- انہیں معلوم تھا کہ جس روس پر ان کا تکیہ تھا وہ انہیں داغِ مفارقت دے گیا ہے- اگست1991ء میں صدر میخائل گورباچوف کے خلاف بغاوت کی کوشش کے بعد سے وسطِ ایشیا کے رہنما ان شدت پسند رہنماؤں میں پیش پیش تھے جو سوویت یونین کے خاتمے کے باوجود ایک زیادہ مضبوط مرکز کا مطالبہ کر رہے تھے- انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد، ان کی ریاستوں کا تحفظ،معیشتیں اور سماجی خدمات ـــــــ جو ساری کی ساری روس کے ساتھ منضبط تھیں ـــــــ تباہ ہو کر رہ جائیں گی اور اب یہ واقعہ رونما ہو چکا تھا- اپنی میٹنگ کے اختتام پر وسطِ ایشیائی رہنماؤں نے اعلان کیا کہ اگر انہیں دوسری رکن ریاستوں کے مساوی درجہ دیا جائے تو ان کی ریاستیں بھی آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ (CIS) میں شمولیت کی خواہاں ہوں گی- حقیقتاً وہ نئے گروپ میں شمولیت کے لئے روس سے بھیک مانگ رہے تھے- دس دن بعد 21 دسمبر کو الماتا میں ـــــــ جو قازقستان کا دارالحکومت تھا ـــــــ ایک نئی دولت مشترکہ کی داغ بیل ڈالی گئی جس میں سابقہ پندرہ جمہوریاؤں میں سے گیارہ ریاستیں شریک ہوگئیں- (تین بالٹک ریاستوں اور جارجیا نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا) چنانچہ ایک صدی پر محیط، پے در پے تین انقلابات کے ہاتھوں وسط ایشیائی عوام پہلے زبردستی زار شاہی کے روس میں مدغم کئے گئے پھر سوشلسٹ جمہوریاؤں کی شکل میں سوویت یونین کے ہتھے چڑھے اور پھر زبردستی آزاد ریاستوں کی نئی تنظیم میں شمولیت پر مجبور ہوئے- فرق صرف یہ تھا کہ پہلے دونوں انقلاب خونیں تھے اور تیسرا پرامن- بہرحال وسطِ ایشیا کے رہنما اس صورت حال پر خوش ہونے کے بجائے دکھی تھے- الیکٹرسٹی گرڈز سے لے کر تیل کی پائپ لائنوں، سڑکوں، فوجی چھاؤنیوں تک وسطِ ایشیائی ریاستیں، لاکھوں دھاگوں کے ذریعے روس کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں- ان کی صنعت اور زراعت کا دارومدار روسی درآمدات پر تھا جبکہ ان کی برآمدات زیادہ تر روسی مارکیٹوں تک ہی مخصوص تھیں- وسطِ ایشیا آنے والی ہر بین الاقوامی ٹیلی فون لائن ماسکو سے مربوط تھی- ان ریاستوں کی اپنی قومی افواج بھی نہیں تھیں- بہت سی غریب ریاستیں مثلاً تاجکستان کا سارا انحصار ہی روسی سب سڈی پر تھا، جسے اب منقطع ہو جانا تھا- لیکن وسطِ ایشیائی رہنماؤں نے اس بحران کے موقع پر جرات مندی کا مظاہرہ کیا اور انفرادی ریاستوں کو تباہی کے خطرے سے بچانے کے لئے وسطِ ایشیا کی مشترکہ مارکیٹ اور کمیونٹی کے

قیام کا اعلان کر دیا-

ان نئی ریاستوں کے منتخب قائدین بے حد قدامت پرست کمیونسٹ تھے اور خارجی دنیا کے بارے میں ان کی رائے ماسکو کی محتاج ہوتی تھی- انہوں نے گورباچوف کی اصلاحی کوششوں کی مخالفت بھی اسی لئے کی تھی کیونکہ حکومت کی مرکزیت کو کمزور کرنے والی کوئی بھی حرکت ان کی طاقت کے سرچشموں کے لئے خطرہ بن سکتی تھی اور ان کے عوام کے درمیان قومی پرستی کی تحریکوں کو تیز کرسکتی تھی- سوویت نظام کے تحت تربیت اور تعلیم پانے والے ان میں سے بہت سے لوگ اپنی قومی زبان اچھی طرح بول بھی نہیں سکتے تھے-ان کی مراعات اور ترقیاں سب ماسکو کے مرہون منت تھیں- سوویت افواج کی موجودگی میں ان کا تحفظ مضمر تھا، اب ان کی واپسی کا خطرہ سر پر تھا- ان کی معیشوں کا تمام تر انحصار روسی تجارتی روابط پر تھا- ان کی تعلیمی اور صحت سے متعلقہ سہولیات کا دارومدار وسیع روسی مالی امداد پر تھا-

وسطِ ایشیا کے حکمران ماسکو سے آزادی ملنے پر جتنے خوفزدہ تھے وہاں کے عوام اس کا اتنا ہی زیادہ خیر مقدم کر رہے تھے- اب ہر کسی کو ایک آزاد ملک چلانے کے امکانات کا سامنا کرنا تھا اور افراطِ زر، ملازمتوں کی فراہمی، معاشی ارتقاء، خارجہ پالیسی اور دفاع کے مسائل سے خود ہی نمٹنا تھا- بحران کا حقیقی سامنا انہیں اس وقت کرنا پڑا جب لاکھوں روسی ـــــــ جو فوج، نوکر شاہی اور معاشی شعبے میں ان پانچوں ریاستوں میں کلیدی جگہوں پر تعینات تھے ـــــــ روس واپس بھاگنا شروع ہوئے- ایک زبردست انتظامی بحران نے ان ساری ریاستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا-

لیکن یہ رہنما جس چیز سے سب سے زیادہ خوف زدہ تھے، وہ تھا سیاسی آزادی سے متعلق عوامی توقعات، آزادیٔ اظہار، جمہوریت اور اسلام کا زبردست چیلنج- سوویت یونین کو کھولنے کی، گورباچوف کی کوششوں کے نتیجے میں وسطِ ایشیا میں نئے سیاسی نظریات اور نئے مذہبی رویوں کا عام اظہار ہونے لگا- نئے ابھرتے ہوئے نظریات میں ایک مغربی جمہوریت تھی، جس کی وکالت بالٹک ریاستوں کی جدوجہد سے متاثر ہونے والے اور آزاد خیال روسی کر رہے تھے- دوسری طرف پان ترک ازم کی تحریک تھی جس کے حامی چین کی سرحدوں سے ترکی تک پھیلی ہوئی ایک متحدہ ترک ریاست تشکیل دینا چاہتے تھے- آزاد مارکیٹ سرمایہ داری کے ہمنوا بھی تھے اور اسلامی بنیاد پرستی کے پیروکار بھی تھے جو شریعت کا نفاذ

چاہتے تھے- گورباچوف غیر سنجیدگی میں ایک ایسا پینڈورا باکس کھول بیٹھے جسے وسطِ ایشیا کے حکمران کسی نہ کسی طرح بند کر ڈالنا چاہتے تھے-

ان لوگوں کو یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی قوت کو مستحکم نہیں کرنا چاہتا تھا- مارچ1985ء میں گورباچوف کے مقتدر ہونے تک اتفاقاً پچھلے چار سالوں میں وسطِ ایشیا کی کمیونسٹ پارٹیوں کو اپنے پانچوں فرسٹ سیکرٹریوں سے ہاتھ دھونے پڑے- ان میں سے ہر ایک نے تقریباً بیس سال تک بلا شرکت غیرے اقتدار کے مزے لوٹے لیکن 1986ء کے آخر تک یہ پانچوں افراد یا تو وفات پا گئے یا انہیں ان کی مقتدر حیثیتوں سے علیحدہ کر دیا گیا- اس طرح وسطِ ایشیا کو روسی کنٹرول میں لانے کا بہترین موقع سمجھ کر گورباچوف نے خالی جگہوں کو روسیوں سے پُر کرنے کی کوشش کی- بہرحال یہ منصوبہ یک طرفہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا-

دسمبر1986 میں مثال کے طور پر گورباچوف نے قازقستان کمیونسٹ پارٹی کے چیف دین محمدؒ کی جگہ ـــــــ جو نسلاً قازق تھے اور1964ء سے جمہوریہ کے سربراہ تھے ـــــــ روسی کینڈی کولبن کو مقرر کر دیا- کولبن کے حکومت سنبھالنے کے چند ہی روز بعد الماتا میں شدید فسادات پھوٹ پڑے اور برق رفتاری سے دوسرے شہروں تک پھیل گئے- دوسری جنگ عظیم سے موجود روس مخالف اور کمیونزم مخالف جذبات کا سراپا اظہار ان عوامی مظاہروں میں ہوا- سترہ افراد مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے- عوامی احتجاج اور طاقت کے اس عریاں اظہار نے سوویت استبداد کو ہلا کر رکھ دیا- کولبن کی جگہ قازق نسل کے ہی نور سلطان نذر بایوف کو لے آیا گیا- گورباچوف دوسری وسطِ ایشیائی ریاستوں کی حکومتوں کو بدلنے میں کامیاب رہے (سوائے ازبکستان کے) لیکن ان کی قیادت علاقائی نسلی گروہوں میں سے ہی لی جاتی رہی-

وسطِ ایشیا جسے کبھی سوویت یونین کی امن پسند اور فرماں بردار عقبی منجمد خلیج سمجھا جاتا تھا، اب اپنی معاشی محکومیت، نسلی الجھنوں اور بڑھتی ہوئی روس مخالف جذباتیت کا مظاہرہ پرتشدد انداز میں کر رہا تھا- مئی 1988ء میں عاشق آباد میں مظاہرے شروع ہو گئے کیونکہ نوجوانوں کو ملازمتوں کے مواقع نہ ملنے کی شکایت تھی- جون1989ء میں وادی فرغانہ میں ازبک اور ترکوں کی زمین اور رہائش کے مسئلے پر لڑائی میں درجنوں لوگ ہلاک ہو گئے- فروری1990ء میں تاجک اور آرمینیا نسل کے لوگوں میں دوشنبہ شہر میں خون ریز جھڑپیں

ہوئیں- مسئلہ وہی رہائش کی کمیابی کا تھا-1990ء میں سب سے زیادہ پرتشدد واقعات جنوبی کرغیزستان میں وادی فرغانہ کے مشرقی کنارے پر ازبکوں اور کرغیزوں کے درمیان ہوئے- اس نسلی فساد کے نتیجے میں سینکڑوں افراد مارے گئے اور کسانوں کی لاشیں اوش بازار میں گوشت لٹکانے کے ہکوں میں ڈال کر لٹکا دی گئیں- اور ہنگاموں کوختم کرنے کے لئے سوویت فوج کو بلانا پڑا- ستمبر 1991ء میں مسلمان انتہا پسندوں نے' فرغانہ کے شہر نعمان گن میں صدر اسلام کریموف کے خلاف ایک اور بغاوت بپا کر دی- اسی دوران نگورنو کاراباخ کے علاقائی تنازعے پر آذربائیجان اور آرمینیا کے مابین جنگ چھڑ گئی- اس تنازع میں تیس ہزار افراد موت کے منہ میں چلے گئے-

وسطِ ایشیا کی کمیونسٹ اشرافیہ نے سوویت افواج اور ماسکو کی معاونت اور سہارے کی بدولت امن و امان بحال کر لیا تھا- ان واقعات نے انہیں مزید خوف زدہ کر دیا کہ کہیں آزادی کے بعد' زیادہ خوفناک علاقائی اور معاشی تنازعات کا لاوا نہ پھوٹ پڑے-1988ء میں افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے متعلق گورباچوف کے فیصلے کو حکمران اشرافیہ نے انتہائی بے وفائی سے تعبیر کیا- اس فیصلے میں ان کی رائے تک نہیں لی گئی- (افغانستان پر حملے کے متعلق بھی ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا) ہزاروں فوجیوں کی تابوتوں میں بند لاشیں آنے کی وجہ سے سوویت یونین میں ماسوائے وسطِ ایشیا کے' جنگ مخالف تصورات مقبول ہو رہے تھے-مگر وسطِ ایشیا میں یا کم از کم اس کے حکمران حلقوں میں جنگ کی حمایت کی گئی کیونکہ سوویت افواج کی سپلائی بیس ہونے کی وجہ سے' علاقے کو بہت سے معاشی فوائد حاصل ہو رہے تھے- وسطِ ایشیا کے حکمران طبقے کمیونسٹوں اور مجاہدین کے درمیان کابل میں جاری اقتدار کی جنگ کے نتائج کے متعلق بھی بہت خوفزدہ تھے- ان کی پریشانی بھی صحیح تھی- اپریل1992ء میں سوویت یونین کے خاتمے کے صرف چار ماہ بعد' کابل مجاہدین کے قبضے میں آ گیا-

1990ء میں وسطِ ایشیائی حکمرانوں کو بدترین معاشی بحران کا سامنا تھا- خوراک کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں- روزمرہ کی اشیاء کی دوکانیں خالی ہو گئی تھیں کیونکہ روسی فیکٹریوں نے نقد ادائیگی کے بغیر سامان کی فراہمی سے انکار کر دیا تھا- اپنے معاشی بحران کی وجہ سے روس میں وسطِ ایشیائی خام مال' کاٹن اور معدنیات کی مانگ ہی نہیں تھی اور

اس علاقے کے حکمرانوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ سوویت یونین سے باہر کی دنیا سے نئے خریداروں کو کس طرح متوجہ کریں- سوویت یونین کی جانب سے دی جانے والی امداد اچانک روک لی گئی تو حکومتیں تنخواہیں اور پنشن تک دینے سے قاصر ہوگئیں- پھر بھی انہوں نے مغربی امداد کے راستے کھولنے کے لئے معاشی اصلاحات کے متعلق سوچنے تک سے انکار کر دیا- سلویک جمہوریاؤں کے برعکس وسطِ ایشیا میں مارکیٹ اکانومی کی بحالی کے لئے قابلِ ذکر اصلاحات کی سمت کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی- مارچ1991ء میں قازقستان' کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی ہڑتال سے مفلوج ہو کر رہ گیا- نتیجتاً ستر ہزار مزدور بے روزگار ہو گئے' کیونکہ کئی ماہ تک انہیں تنخواہیں اور پنشنیں ہی نہیں مل سکیں-

روس میں وسطِ ایشیا کے خلاف ایک عمومی جذباتی فضا موجود تھی- یہ علاقہ جو کبھی سوویت مادر وطن کا اہم جزو تھا' ثقافتی' نسلی اور مذہبی طور پر روس سے علیحدہ سمجھا جانے لگا- معاشی نقطہ نگاہ سے اسے قدرتی وسائل کی بنیاد سمجھنے کے بجائے' مالی بوجھ کے طور پر لیا جانے لگا- ''ہم وسطِ ایشیا کی مشکلات اور مسائل کیوں اپنے سر لیتے پھریں' جس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں' کوئی مذہبی رشتہ نہیں؟ ہم اکیلے ہی بھلے-'' یہ الفاظ روسی نائب وزیراعظم ایگزگائیڈر کے ایک معان کے ہیں- سوویت یونین کے ایک شدید مخالف' باغی الیگزینڈر سولزے نتسن نے بھی اپنے ایک طویل مقالے میں یہ توجیہہ دی تھی کہ ''بھوکے ننگے وسطِ ایشیاء کے ناروا بوجھ سے پیچھا چھڑا کر ہی'' روس زیادہ مضبوط ہوسکتا ہے- اپنے ہاتھوں وسط ایشیا میں آباد کئے ہوئے روسی شہریوں کی بھی ماسکو کو کوئی خاص پروا نہیں تھی جبکہ وہ لوگ ان علاقوں میں موجود اپنے تحفظ کے لئے شور مچا رہے تھے-

جون1991ء میں بورس یلتسن60% ووٹ لے کر روسی صدارت کا الیکشن جیتے تو ماحول بالکل ہی بدل گیا- سلاوی شاونزم کی ترویج اور حکمرانی کا نظریہ' حزب مخالف کا مقبول نعرہ بنا دیا گیا- یلتسن کی فتح ملکی سلامتی کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئی- گورباچوف نے ماسکو کے اختیارات کو تمام جمہوریاؤں میں تقسیم کرنے اور سوویت یونین کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے کسی معاہدے کی تشکیل کے انتظار میں میں پورا موسمِ گرما انتہائی تندہی سے کاٹا- معاہدے سے صرف ایک روز پہلے 20 اگست1991ء کو ماسکو کے انتہا پسندوں نے بغاوت کا ایک ڈرامہ رچایا' تاکہ اپنی حکومت کی جڑوں کو ماسکو میں زیادہ مضبوط بنا سکیں- چند دن بعد

بغاوت کچل دی گئی مگر یونین کا معاہدہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

دوسری سوویت جمہوریاؤں نے بغاوت کی مکمل مذمت کی مگر وسطِ ایشیا کا ردعمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان کے رہنماؤں نے سوویت یونین کو بچانے کے لئے اس بغاوت کی مکمل حمایت کی۔ قازقستان کے صدر نے البتہ شروع کے تین دن مکمل خاموشی اختیار کی۔

صرف کرغیز صدر آقایوف نے بغاوت کی مذمت کی اور اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے اپنی افواج بشکیک میں جمع کر لیں۔ جب بغاوت ناکام ہو گئی اور فاتح گورباچوف ماسکو پہنچے تو وسطِ ایشیائی حکومتوں کو اعتماد کے شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ نوزائیدہ حزب مخالف نے ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کر ڈالا۔ علاقائی حکمرانوں نے دوبارہ گورباچوف کی پناہ چاہی اور ان کے اتباع میں اپنے کنٹرول کو مضبوط کرنے لگے۔ 24 اگست کو جونہی سوویت کمیونسٹ پارٹی توڑی گئی وسطِ ایشیا کے حکمرانوں نے فوری طور پر اپنی اپنی کمیونسٹ پارٹیاں ختم کر ڈالیں۔ تاجکستان میں البتہ اپوزیشن نے حکومت کے خلاف دوشنبہ میں احتجاجی ریلیاں منعقد کیں۔ جس کے نتیجے میں تاجک کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری قاہر میخانوف مستعفی ہو گئے۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جس کے نتیجے میں صرف چھ ماہ بعد خانہ جنگی کی ابتدا ہو گئی۔

چنانچہ دسمبر میں آزادی کے وقت وسطِ ایشیا شدید بحران کا شکار تھا۔ اس کے رہنما گم کردہ راہ اور مستقبل سے خوفزدہ نظر آتے تھے، تاہم وسطِ ایشیا کے عوام کے لئے یہ آزادی اپنے قومی اور نسلی تشخص کے اظہار کا خوشگوار پیغام تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے حکمران اپنی انفرادی خواہشات اور باہمی رقابتوں کو ختم کر کے پانچ ریاستوں کی یونین قائم کریں گے جو نہ صرف روس کے مقابلے میں کھڑی ہو سکے گی بلکہ داخلی سلامتی اور تباہ حال معیشتوں کی بحالی اور ترقی کی ضامن بھی ہوگی۔ یہ سادہ سی عوامی توقع زبردست اہمیت کی حامل تھی کہ ان کے رہنما ایک معاشی کامن مارکیٹ، مشترکہ سلامتی اور تحفظ اور خارجی دنیا کے لئے اپنی ایک اجتماعی صورت کی تشکیل کی سمت متحرک ہوں۔ علاقے کے بہت سے دانشوروں کے خیال میں ان ریاستوں کو درپیش انفرادی مسائل اور مشکلات کا حل انہی اقدامات کے ذریعے ممکن تھا۔ شروع شروع میں یہاں کے حکمرانوں نے ان منصوبوں کی منظوری کے لئے باتیں بھی کیں۔ مشترکہ منڈی اور بین الاقوامی مجالس میں اجتماعی حیثیت کی

تشکیل کی ضرورت کی وکالت بھی کی لیکن مستقبل کی ریاستی منصوبہ بندی کے بحث و مباحث میں عوامی شرکت یا آراء کو اہمیت نہیں دی گئی۔ ترکمانستان اور ازبکستان میں ماسکو کے اخبارات اور ٹی وی تک سنسر کئے جانے لگے کیونکہ ان کے اپنے ریاستی ذرائع ابلاغ کی نسبت یہ کچھ زیادہ آزاد تھے۔

سیاسی پابندیوں اور سنسر شپ کے آغاز کے ساتھ ہی حکمرانوں نے انفرادی ریاستی تشکیل کی تنگ پالیسیوں کی جانب مراجعت شروع کر دی کیونکہ ان کی نظر میں ان کی سیاسی بقا اسی طرح ممکن تھی۔ معیشتی اور سلامتی کے مسائل سے مشترکہ طور پر عہدہ برآء نہ ہونے کی بنا پر وہ روز افزوں داخلی مسائل کے حل میں بھی بے بس نظر آتے تھے۔ مزید برآں روس بھی وسطِ ایشیا کے مسائل میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ ان علاقوں سے روسی دستوں کی واپسی کے بعد مقامی فوج میں عجیب افراتفری پھیل گئی۔ روس کے معاشی منصوبہ ساز اپنی برآمدی اشیائے صرف اور مکمل(finished) اشیاء کی بین الاقوامی قیمتیں لینے پر بضد تھے جبکہ وسطِ ایشیائی خام مال، کپاس اور معدنیات انہی قیمتوں پر خریدنا چاہتے تھے جو سوویت عہد میں ادا کرتے تھے۔ ماسکو نے تمام قرضے، امداد اور سب سبڈی نہ صرف روک لئے بلکہ گزشتہ قرضوں کی فوری واپسی کا مطالبہ بھی کر ڈالا اور وہ بھی امریکی ڈالرز کی شکل میں۔

سفارتی عملے کی کمی، غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی، زرمبادلہ کی غیر موجودگی اور تیکنیکی مہارت کی کمی جیسے مسائل کی وجہ سے خارجی دنیا سے براہِ راست تعلقات میں دشواریاں حائل تھیں۔ وسطِ ایشیا میں تجربہ کار سرکاری اہل کاروں، ماہرین اور صنعتی ناظموں کی شدید قلت پیدا ہوگئی کیونکہ ان تمام پوسٹوں پر روسیوں کا قبضہ تھا اور اب وہ یہاں ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پورا وسطِ ایشیا معاشی انحطاط کی لپیٹ میں آ گیا۔ معیار زندگی گرنے لگا، افراطِ زر میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا، بے روزگاری بڑھنے لگی اور صنعت و زراعت کے لئے ضروری خام مال ناقابلِ حصول بن کر رہ گیا۔ معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ مقامی سیاسی اور نسلی رقابتیں بھی ابھرنے لگیں اور سرحدی تنازعات کی آگ بھی بھڑکنے لگی۔ حکمرانوں نے اپوزیشن جماعتوں پر پابندی لگا دی، ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کو سخت کر دیا۔ مستقبل کی پالیسیوں پر عوامی مباحثوں اور گفتگو کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہ طبقہ ابھی تک نیم بے

حسیٰ تابعدارانہ رویئے اور سیاسی بے عملی کے اس نظریئے پر عمل پیرا تھا جو سوویت دور میں وسیع تر مزاحمت یا احتجاج سے بچنے کے لئے عوام کے دل و دماغ پر زبردستی مسلط کیا گیا تھا۔ تاہم اس نے اپنی سیاسی بقا کو ریاستی پالیسی قرار دیتے ہوئے تمام دانشوروں' علماء اور سیاسی پارٹیوں جیسے سرگرم سیاسی عناصر کو بزور طاقت روپوش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے اسلام پسندوں کی طرح یہ تمام گروہ بھی بالآخر انقلابی اور متشدد ہونے لگے۔

اسی دوران جہاں وسطِ ایشیاء کے جمہوریت پسند سیاسی فیضان کے لئے روس اور بالٹک ریاستوں کی جانب دیکھتے تھے' وہاں بہت سے نوجوانوں کی نگاہیں اسلام اور پاکستان' ایران' ترکی اور سعودی عرب جیسی مسلمان ریاستوں کی جانب اٹھتی تھیں۔ وہ اسلامی تصورات میں بے پناہ کشش پاتے تھے۔ پچھلے چند سالوں میں وسطِ ایشیا میں اسلامی نظریئے کے احیاء نے مقامی نسلی یکجہتی اور روس مخالف قوم پرستی کے جذبات کو بے پناہ تقویت بخشی ہے۔ انہیں یہ شعور بخشا کہ سوویت دور میں انہوں نے کیا کیا گنوایا اور انہیں کیا حاصل کرنا ہے۔

اسلامی تصورات کے احیاء کی تیز رفتاری نے حکمران طبقے کو حیرت زدہ کر ڈالا۔ مسلمان عوام اور مقامی روسیوں کے درمیان اور حکمران طبقے اور عوام کے درمیان خلیج وسیع تر ہو گئی۔ چونکہ مسلمانوں کو روپوش ہو جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے عقیدے کو زندہ رکھنے کے لئے روپوش علما اور چوری چھپے عبادات پر تکیہ کر رہے تھے اس لئے منظّم سیاسی اپوزیشن سامنے لانے کے لئے ان کے پاس عوامی جماعتوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ جہاں تک حکمران طبقے کا تعلق ہے' انہیں نہ تو سیاسی' معاشی بحران کا حل اور نئی سیاسی پارٹیوں سے نمٹنے کا طریقہ سمجھ آیا اور نہ ہی اسلامی نظریات کے احیاء کو روکنے کا راستہ۔

سوویت یونین کی شکست و ریخت سے بھی پہلے' مسجدوں کی تعمیر کا ایک زبردست سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اکتوبر1990ء میں کرغیزستان میں پچاس نئی مساجد بنائی گئیں جبکہ پہلے یہ تعداد پندرہ مسجدیں سالانہ تھی۔ ترکمانستان میں پانچ کے بجائے تیس مسجدیں بنائی گئیں۔ تاجکستان میں سترہ کے بجائے چالیس مساجد اور قازقستان میں سینتیس کی جگہ نوے مسجدیں بنیں۔ ایک سال بعد اکتوبر1991ء میں ہر جمہوریہ میں ایک ہزار سے زیادہ نئی مساجد تھیں اور روزانہ ایک نئی مسجد بن رہی تھی۔ صوفی تحریک خوب پھلی پھولی۔ مشترکہ فارموں میں مقامی صوفیا کے مزاروں کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ یہ مقامات فوراً ہی ہفتہ وار سماع' عبادت'

پارٹیوں اور خاندانی پک نک کے مراکز بن گئے- یہاں نوجوانوں کو مقدس مقامات کی روحانی قوت کے متعلق بتایا جانے لگا- صوفیا کی رسوم سکھائی جانے لگیں- خواتین نے گھریلو مدرسے بنا لئے' جہاں بچوں کو نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ سکھایا جاتا-

اسلام کا مقامی احیاء غیر ملکیوں کی آمد کے ساتھ ہی تیزی سے انقلابی شکل اختیار کرنے لگا- سعودی عرب' خلیجی عرب ریاستوں' پاکستان' ترکی اور ایران سے قرآن مجید' اسلامی لٹریچر اور نقد رقم کے ساتھ مبلغین آنا شروع ہو گئے- اسلامی دنیا میں ہر کسی کی خواہش اور کوشش تھی کہ ان نوزائیدہ مسلم ملکوں میں اپنے اپنے مسلک کی ترویج کر کے' یہاں کے باشندوں کے دلوں کو فتح کر لے- یہ مبلغین خود کو مسلمانوں کا ایسا ہراول دستہ سمجھ رہے تھے جو وسطِ ایشیا کے مجبور مسلمانوں میں اسلامی حمیت بیدار کر کے امتِ مسلمہ کے عروج کا باعث ہوگا اور اس سے ان کے مخصوص فرقے کو بھی تقویت ملتی-

ابتدا میں وسطِ ایشیا کی قیادت نے بھی دوسری سابقہ سوویت ریاستوں کی طرح' بہت سی ضروری رنگا رنگ تبدیلیاں لا کر' نئی صورتِ حال سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی- کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی- خود کو سوشلسٹ یا عوامی نمائندوں کے طور پر تبدیل کر ڈالا- کمیونسٹ پارٹیوں کی پراپرٹی کو قومیا لیا گیا- اہم ممالک میں سفیروں کا تقرر کیا گیا- سیاسی اصلاحات کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود کو دوبارہ جنم لینے والے مسلمانوں کے طور پر پیش کیا- عوامی تقریروں اور کابینہ کی میٹنگوں میں قرآن کی تلاوت کرائی جاتی یا دُعائیں مانگی جاتیں- لیکن حکمرانوں کا عمومی تکیہ پرانے ''سرکاری اسلام'' کے نیٹ ورک پر تھا' جس میں مساجد اور مولویوں کے ذریعے اسلامی انقلابیت کو قابو رکھا جاتا تھا- یہاں نہ تو پیسے کی ریل پیل تھی' نہ ہی کوئی خاص اثر و رسوخ- لوگ اسے سابقہ سوویت نظام کا حصہ جان کر ناقابل اعتبار گردانتے تھے- حکمران طبقے نے صوفی مسلک یا دوسرے مقبول اسلامی نظریات کے احیاء کی قطعی حوصلہ افزائی نہیں کی- ابتدا میں تو انہوں نے مقدس اسلامی ایام کے دوران عام تعطیل کرنے سے بھی انکار کر دیا- اسلامی سوچ یا نظریئے کی حامی جماعتوں پر پابندی کے ذریعے ریاستوں نے سیاسی طور پر اسلام کا نام استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا- صرف تاجکستان میں شدید سیاسی بحران کے حل کے لئے مقبول عام جماعت احیائے اسلام کو قانونی تسلیم کیا گیا- 1992ء تک وسطِ ایشیائی حکمرانوں کے جابرانہ اقدامات کی بدولت

اسلامی انقلاب کے غیر ملکی نظریات کی' بمع ان کے مالی فنڈز کے' مزید حوصلہ افزائی ہونے لگی- مقامی تحریکیں حالات کے پیش نظر زیر زمین چلی گئیں تا کہ پکڑ دھکڑ اور پولیس کے ہاتھوں ہراسانی سے بچا جا سکے- وسطِ ایشیائی حکومتوں نے ان تعلقات کو بھی اسی طرح ختم کرنے کی کوشش کی' جیسے انہوں نے سیاسی آزادیوں اور منہ زور ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کر لیا تھا' لیکن یہاں وہ سست روی کا شکار ہو گئیں- بہت سے علاقوں میں انقلابی اسلام کے بیج بوئے جا چکے تھے-سوویت یونین کا وجود تو باقی نہیں رہا مگر وسطِ ایشیاء کے مسائل کا حل ابھی بہت دور تھا-

باب 4

آزادی کا پہلا عشرہ

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد 8دسمبر1991ء کو وسط ایشیائی ریاستوں کو جہاں عظیم چیلنجوں کا سامنا تھا' وہاں تابناک مواقع بھی ان کے منتظر تھے- ان علاقوں کے عوام روسی زیر تسلط سوویت یونین میں کبھی بھی خوش نہیں رہے اور مسلمان بسماچیوں کی زیر قیادت بغاوتوں کا ایک سلسلہ بالشویک انقلاب کے بعد سے ہی جاری تھا- بند سرحدیں' کپاس کی جبری کاشت' فارمز کی اجتماعیت' عوامی پیمانے پر نو آبادکاری کی سوویت پالیسیوں اور خصوصاً سٹالن کے ہاتھوں وسط ایشیا کی نئی جغرافیائی تقسیم اور پانچ نئی ریاستوں کے بے موقع قیام نے علاقے کو معاشی ناہمواریوں' نسلی اور سیاسی تقسیم اور خفیہ مذہبی عملیت پسندی کا شکار بنا دیا- لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی تھا' ہر ریاست کی سرزمین انتہائی زرخیز اور آئل' گیس' معدنیات اور دوسرے قدرتی وسائل سے مالا مال تھی- وسط ایشیاء میں موجود دنیا کا آخری سب سے بڑا توانائی کا ذخیرہ دنیا بھر کے سرمایہ کاروں کا مرکز نگاہ بن گیا- ان پانچوں حکومتوں کے سربراہوں کو روسی تسلط سے نجات پانے اور خود کو بین الاقوامی برادری سے مربوط کرنے کا بے مثال موقع ملا مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے- بعض حکمرانوں نے کوششیں بھی کیں- کرغیزستان کے عسکر آقایوف نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے بعض پروگرام شروع کئے اور کاروبار کو پرائیویٹائز کر دیا- قازقستان کے نور سلطان نذر بایوف نے امریکی آئل کمپنیوں سے مذاکرات کئے اور تانگیز آئل فیلڈز سے بحیرہِ اسود تک ایک اہم

پائپ لائن کی تکمیل کر ڈالی- ازبکستان کے جابر اسلام کریموف نے بھی طاقتور اپوزیشن پارٹیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے دی اور کئی بین الاقوامی ترقیاتی منصوبے طے کر لئے-لیکن آزادی کا پہلا عشرہ ختم ہونے پر وسط ایشیا کی ریاستوں کو شدید سیاسی بے چینی غربت کے تسلسل اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا تھا- ساتھ ہی ایک بالکل نیا مسئلہ--- اسلامی انتہا پسندی کی صورت میں ____ سارے علاقے کے استحکام کے لئے خطرہ بن کر ابھر رہا تھا- اس قدر عالی شان قدرتی وسائل کے باوجود بین الاقوامی سرمایہ کاری محدود شکل میں ہی آ سکی- جب تک وسط ایشیا کی حکومتیں اپنی معیشت اور سیاسی صورتِ حال کو مستحکم کرنے کی کوئی راہ ڈھونڈ نہیں لیتیں' سرمایہ کار کم زرخیز مگر اپنے لئے محفوظ علاقوں کا متلاشی رہے گا-

قازقستان: ضائع شدہ وسیع وسائل

خانہ بدوش قازق قبائل اپنے افسانوی سردار الاشاخاں کی سربراہی میں' بارہویں صدی کے دوران' جنوبی سائبریا سے ہجرت کر کے قازق چراگاہوں میں آ بسے تھے-ان کے سیاسی نظام کی تین سطحیں تھیں- قبائلی' برادری اور خاندانی- ان کا سربراہ خان کہلاتا تھا- اگرچہ ان کی مختلف برادریاں یا گروہ باہم دست وگریباں رہتے تھے لیکن کسی خارجی حملے مثلاً مشرق کے چینی یا جنوب کے ازبک کی صورت میں پورا قبیلہ متحد ہو جاتا تھا- خاصی دیر سے قبول اسلام کرنے والے قازق تاتاری مولویوں کے زیراثر سترہویں صدی میں آئے- (قازقوں میں کمزور مذہبی تشخص ہی کی وجہ سے ان میں مسلم انتہا پسندی نہ ہونے کے برابر ہے) اگرچہ آزادی کے بعد قازق اسلام کے بارے میں زیادہ حساس اور عملاً نیک ہو گئے ہیں- تاہم انتہا پسند تحریکوں کو زیادہ تر حمایت جنوب کے ازبکوں کی جانب سے مل رہی ہے- اٹھارویں اور انیسویں صدی میں' قازق سرزمین سب سے پہلے روسی توسیع پسندی کا نشانہ بنی- جابجا جنگی قلعوں کا جال بچھا دیا گیا- جنگ جو خانوں کو باجگزار بنایا گیا' علاقائی تقسیم کے معاہدے ہوئے-حکومت نے روسی اور کاکیشیائی لوگوں کو' گندم اور کپاس کی کاشت اور خانہ بدوش قازقوں کو محدود کرنے کے لئے' اس علاقے میں بسانا شروع کر دیا- صرف 1891ء میں دس لاکھ روسیوں کو شمالی قازقستان میں لا کر آباد کیا گیا- اس وقت سے یہاں

روسیوں کی مسلسل اکثریت رہی ہے۔

سوویت حکمرانوں نے بھی ان زرخیز میدانوں میں روسی اور کاکیشیائی کسانوں کی آبادکاری، مقامی بغاوتوں کو خونی تشدد کے ذریعے دبانے اور قازق قبائل کو تباہ و برباد کرنے کی روسی پالیسیاں جاری رکھیں۔1954ء تک ماسکو شمالی قازقستان کو غیر آباد سرزمین قرار دیتا رہا تاکہ وہاں روسی کسانوں کو آباد کر سکے۔ سوویتوں نے بائیکونر فضائی اڈے کو میزائلوں کے ٹسٹ اور راکٹ پیڈ کے طور پر بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ سیمی پلاٹنسک کو ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات کے لئے مرکز بنا لیا گیا۔ ان مراکز کی وجہ سے مقامی آبادی کے لئے انتہائی خطرناک ماحولیاتی، ارضی اور حفظان صحت کے مسائل پیدا ہو گئے۔ یہاں تابکاری اثرات کی سطح اب بھی خاصی بلند ہے۔

ظالمانہ حد تک ذاتی محکومی اور اپنی نوزائیدہ سیاسی تنظیموں کے جبر کے ہاتھوں قازق ___ وسط ایشیائی قوموں میں ___ اپنی تاریخ و ثقافت کی عدم موجودگی کے باعث، روسی رنگ میں سب سے زیادہ رنگے گئے۔1991ء تک بہت سے قازق اپنی مادری زبان تک نہیں بول سکتے تھے۔ قازق اور مذہب پسند قازق بھی، وسط ایشیائی لوگوں کی نسبت روسیوں سے باہمی شادی بیاہ کرنے میں زیادہ آسانی اور راحت محسوس کرتے تھے۔ درحقیقت آزادی کے وقت، قازقستان کے 16 لاکھ مربع میل وسیع علاقے میں ___ مشرق سے مغرب تک دو ہزار میل کی وسعت میں ___ صرف ایک کروڑ ستر لاکھ افراد کی آبادی تھی۔ خود قازق یہاں اقلیت میں تھے۔41% روسی آبادی کے مقابلے میں 38% قازق تھے۔ مزید براں سو کے لگ بھگ دوسرے نسلی گروہ بھی آباد تھے، جن میں جرمن، چیچن، کوریائی اور چینی باشندے بھی شامل ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے، انتہائی پیچیدہ سیاسی مسائل، ریاست کو درپیش ہیں۔ آج قازقوں کو معمولی عددی برتری (52%) بھی اس لئے مل گئی کہ روسی اور جرمن نسل کے افراد کی اکثریت اپنے اپنے وطن لوٹ گئی۔ ان کے چلے جانے کے بعد ملکی آبادی میں 8% کمی واقع ہو گئی۔ بہرحال، دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کی نسبت، قازقستان سے روسی نسل کے افراد کا انخلا خاصا کم ہوا ہے۔ اس سلسلے میں صدر نور سلطان نذر بایوف کی متوازن اور مصالحانہ پالیسیوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ تاہم ان کا سب سے متنازعہ کارنامہ ریاستی دارالحکومت کو الماتا جیسے بڑے اور شاندار شہر سے ملک کے

وسط میں واقع آستانہ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں منتقل کرنا ہے- یہ روسی آباد کاروں کے بالکل قریب شمال میں واقع ہے- شاید نذر بایوف روسیوں کے قریب رہ کر ان کی علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنا چاہتے ہیں- یہاں ایک نیا اور جدید شہر بسانے کے لئے بے پناہ مالی وسائل مختص کیئے گئے- انتہا پسند روسیوں اور کاکیشائیوں پر_____ جو آزاد ریاست یا روس سے الحاق کے داعی ہیں_____ ان عنایات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا البتہ قازق معیشت تلپٹ ہو کر رہ گئی- روسی اثر و نفوذ اور روسی زبان کے استعمال کے شدید مخالف قوم پرستوں کو بھی نذر بایوف مطمئن نہیں کر سکے-

نتیجتاً خانہ بدوش قبیلے کے ایک قازق کسان اور سکول ہی میں روایتی پہلوان کی شہرت پانے والے نذر بایوف1989ء میں مقامی کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری اور قازقستان کے پہلے صدر تھے وہ روس سے روایتی تعلقات رکھنے کی کوششوں میں وسط ایشیائی حکمرانوں میں، سب سے آگے آگے رہے ہیں- انہوں نے آزاد ریاستوں کی دولتِ مشترکہ کو مضبوط تر اور فعال بنانے کے لئے روس پر خاصا دباؤ ڈالا اور وسط ایشیائی ریاستوں کے مابین قریبی معاشی اور سیاسی یکجہتی پیدا کرنے کے لئے مختلف منصوبوں کی پرزور وکالت کی- لیکن بالآخر وہ یہ جنگیں ہار گئے- روس وسط ایشیائی ریاستوں کو مساوی پارٹنر سمجھنے کے لئے تیار نہیں جبکہ ازبکستان کے خود غرض اسلام کریموف نے نذر بایوف کو ہر مقام پر زک پہنچانے کی کوشش کی ہے- ذاتی رقابتیں بھی اس کی اہم وجہ ہیں لیکن تیل کے وسیع ذخائر کی وجہ سے قازقستان کی بین الاقوامی اہمیت بھی کریموف کو ذرا نہیں بھاتی-

آزادی کے بعد مغرب کی نگاہ میں اس لئے بھی نذر بایوف کی اہمیت تھی کہ سوویت عہد کے ایک سو چار ایس ایس 19 بیلسٹک میزائل بمع ایک ہزار جوہری ہتھیاروں کے، ان کے قبضے میں تھے اور بائیکونر اور سیمی پلاٹنسک کے ایٹمی تجرباتی مراکز بھی انہی کی سرزمین پر واقع تھے- امریکہ عمومی اقتصادی امداد کے بہانے میدان میں کود پڑا، درحقیقت وہ میزائلوں کو ناکارہ کرنے کے اخراجات ادا کر رہا تھا- نذر بایوف نے انتہائی ماہرانہ انداز میں، امریکہ اور نیٹو ممالک سے قریبی روابط قائم کرنے کے لئے اس مسئلہ کا بڑا صحیح استعمال کیا اور قازقستان کے لئے، بھرپور مالی فوائد حاصل کیئے- ان میزائلوں کے ناکارہ بنائے جانے تک واشنگٹن سے400 ملین امریکی ڈالر کی امداد مل چکی تھی- اگرچہ نذر بایوف نے مزید ایٹمی تجربات پر

پابندی لگادی ہے تاہم بائیکونر کی لانچنگ سائٹ روس کو کرائے پر فراہم کی جاتی رہی۔

قازقستان میں مغربی مفاد یا دلچسپی کی وجہ صرف ان کا خوف ہی نہیں تھا۔ قازقستان قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے اور سوویت دور میں ان سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی کیونکہ سوویت حکمران سائبریا میں موجود توانائی کے ذخائر کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔ قازقستان میں غالباً دنیا کا سب سے بڑا غیر استعمال شدہ توانائی کا ذخیرہ موجود ہے۔ جس کا اندازہ تقریباً سو بلین بیرل پٹرولیم اور پچاس ٹریلین کیوبک فٹ گیس ہے۔ اس زبردست برتری کا فائدہ اٹھانے میں قازقستان کو کافی کامیابی ہوئی۔ نذر بایوف وسط ایشیاء کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے ایک امریکی آئل کمپنی سے چار سال پر محیط مذاکرات کے بعد ایک مشترکہ کاروباری معاہدہ کیا۔ مئی 1992ء میں کئے گئے اس معاہدے کے تحت امریکی شیوران کارپوریشن نے تنگیز آئل فیلڈز کو ترقی دینے اور یہاں سے بحیرہ اسود کی بندرگاہ (روسی شہر نودروسیک) تک پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کر رکھا ہے تاہم 1997ء تک 206 ملین امریکی ڈالر کی مالیت کی پائپ لائن پر کام کی ابتداء نہیں ہو سکی تھی۔ مذاکرات کے تیرہ سال بعد کہیں جا کر 948 میل لمبی پائپ لائن مکمل ہو پائی اور آج کل اس کے ٹسٹ کئے جا رہے ہیں۔ 2001ء کے اختتام تک متوقع افتتاح کے بعد اس کے ذریعے 5 لاکھ ساٹھ ہزار بیرل تیل روزانہ نوووروسیک کو مہیا کیا جا سکے گا۔

شیوران سے معاہدے کے بعد الماتا میں بین الاقوامی آئل کمپنیوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا اور قازقستان نے امریکہ، چین، یورپ، ہندوستان، جاپان اور ترکی کے ساتھ بے پناہ منفعت بخش تجارتی اور برآمدی معاہدے کر ڈالے۔ ان کے نتیجے میں 400 سے 800 ملین ڈالر سالانہ کی غیر ملکی سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ لیکن 1990 کے عشرے کے درمیان آئل سیکٹر میں مغربی دلچسپی اور سرمایہ کاری یکا یک کم ہو گئی۔ ایک تو بین الاقوامی قیمتیں خاصی گر گئیں اور دوسرے روس معترض تھا کہ یورپ جانے والی پائپ لائن، روسی علاقے سے باہر، جنوبی سمت سے کیوں لے جائی جا رہی ہے۔ 1991ء میں تیل کی پیداوار 5 لاکھ 26 ہزار بیرل روزانہ تھی۔ (ابھی قازقستان سوویت یونین کا حصہ تھا) اگلے عشرے میں یہ تیزی سے کم ہوتی چلی گئی کیونکہ روس اپنے علاقے سے گزرنے والی پائپ لائن کے ذریعے، قازق برآمدی تیل کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔ مئی 2000ء میں مغربی سرمایہ کاری قازقستان میں دوبارہ آنا شروع ہو گئی کیونکہ مغربی آئل کنسورشیم نے بحیرہ کیسپین میں واقع مشرقی کشاگن میں ایک

نئی آئل فیلڈ دریافت کر لی تھی- یہ آئل فیلڈ دنیا کے بہت بڑے ذخائر میں سے ایک سمجھی جاتی ہے-

ایشیا پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے امریکہ' روس اور ایک نئے کھلاڑی چین کے درمیان ''نیا عظیم کھیل شروع ہونے کے بعد' روس' قازقستان میں ایک ویلن کا کردار ادا کرنے میں لگا ہوا ہے- اس کا اصرار ہے کہ قازقستان نئی پائپ لائن بچھانے کے بجائے' روسی علاقے میں سے جانے والی پرانی پائپ لائن کے ذریعے یورپ کو تیل برآمد کرے- اس طرح قازقستان بدستور روس کا محتاج رہے گا- روس کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ مغربی کمپنیوں سے ہونے والے تجارتی معاہدوں میں اسے بھی منافع کا شریک ٹھہرایا جائے- وہ بحیرہ کیسپین پر قازقستان کے حق کو بھی متنازعہ سمجھتا ہے- دوسرے ہمسایہ ممالک ترکمانستان' ایران' آذربائی جان بھی تنازعے کے فریق ہیں کیونکہ سبھی بحیرہ کیسپین کے پانی اور تیل کے ذخائر پر اپنا حق جتاتے ہیں- تیل کی مزید دریافت کے بعد یہ تنازعہ اور بھی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے-

بے پناہ روسی دباؤ کے باوجود' قازقستان مشرق میں چین' جنوب میں ایران اور مغرب میں ترکی کی سمت سارے ہی ممکنہ برآمدی راستوں کو استعمال کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے- تاہم تمام تر منصوبہ بندیوں کے باوجود' پچھلے عشرے میں صرف اتنی کامیابی ہوسکی کہ تنگیز پائپ لائن بچھانے کے کام کی ابتدا ہوگئی اور وہ بھی ایک روسی بندرگاہ تک- چین نے 1991ء میں قازق آئل فیلڈ کے حصص خریدے تو قازقستان نے ایک پائپ لائن چین تک بچھانے کا پروگرام بھی بنایا مگر ان کوششوں میں تاحال کوئی خاص کامیابی نہیں ہوسکی- چین نے علاقے میں سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے اور اس طرح1993ء تک روس کے بعد قازقستان کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار بن کر ابھرا ہے- اسی دوران چین اور قازقستان نے اپنی سرحدوں کی حد بندی اور وہاں سے فوجیں ہٹانے کا کام شروع کر دیا- اپریل 1996ء میں شنگھائی فائیو (چین' روس' قازقستان' تاجکستان اور کرغیزستان) کی پہلی کانفرنس کے بعد یہ عمل اور بھی تیز رفتاری سے انجام پانے لگا-

آئل اور گیس کے قیمتی ذخائر ہی قازقستان کی اہمیت کی بنیاد نہیں اس کے ہاں بے پناہ معدنی وسائل ہیں- سوویت دور میں لگ بھگ اسی مختلف معدنیات یہاں سے نکالی جاتی

تھیں- اس کے زرخیز کھیت گندم کی بے پناہ فصل دیتے ہیں- یہ سارے وسائل قازقستان کی دولت اور اس کی معاشی زندگی کی بنیاد ہیں- انہی وسائل کی وجہ سے بین الاقوامی اداروں____ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور ورلڈ بینک نے صنعت اور زمین کو نجی ملکیت میں دینے کے لئے وسیع فنڈز قازقستان کو بطور قرض دیئے ہیں- یہ عمل اپریل1994ء میں ریاستی ملکیت میں 50 بڑی کمپنیوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں منتقل کرنے سے شروع ہوا تھا- تاہم اس خرید وفروخت میں کئی سکینڈل بھی بنے' بہت سی کمپنیاں نذر بایوف کے ذاتی دوستوں کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں- ان کے ذریعے حاصل ہونے والی دولت آزادی کے بعد شروع ہونے والے معاشی بحران کے خاتمے کے لئے ناکافی تھی- بے روزگاری بڑھ رہی تھی اور حکومت کے پاس تنخواہیں اور پنشن ادا کرنے کے لئے مناسب وسائل دستیاب نہیں تھے- روس نے نومبر1993ء میں قازقستان اور دوسرے وسط ایشیائی ممالک کو روبل زون سے نکلنے پر مجبور کیا تو یہ بحران اور بھی شدت اختیار کر گیا- قازقستان نے اپنی کرنسی ''تنجی'' کا اجراء کیا مگر تنجی مسلسل عدم استحکام کا شکار رہی اور ڈالر کے مقابلے میں بری طرح ڈانواں ڈول ہوتی رہی- قازقستان کو آمرانہ اور کرپٹ قیادت جیسے مشکل مسئلے کا سامنا ہے جو اس سرزمین کے قدرتی وسائل کو بے دردی سے لٹا کر'اس کی برآمدی استعداد کو ضائع کرنے پر تلا ہوا ہے- اس قیادت کے کرتا دھرتا صدر نذر بایوف ہیں جنہوں نے آزادی کے فوراً بعد اس عہدے پر قبضہ جما لیا تھا- قازقستان کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری نذربایوف نے انتہائی سعادت مندی سے پارٹی کا خاتمہ کر دیا مگر فوراً ہی یونیٹی پارٹی کے نام سے اپنی جماعت بنا ڈالی- اس پارٹی نے ریاستی دباؤ' وسیع انتخابی دھاندلیوں کے ذریعے اور مخالفوں کو انتخاب لڑنے کی اجازت نہ دے کر مجوزہ صدارتی اور پارلیمانی انتخابات میں مکمل کامیابی حاصل کر لی-

حکمران ٹولے نے اپوزیشن پارٹیوں اور اخبارات کو ہراساں کرنا شروع کر دیا- اخبارات پر پابندیاں لگ گئی ہیں اور اپوزیشن جماعتوں کے رہنما جیلوں میں بند ہیں یا ملک سے فرار ہونے پر مجبور کر دیئے گئے- کرپشن ہر حکومتی سطح پر بری طرح پھیل گئی ہے کیونکہ غیر ملکی آئل کمپنیاں ٹینڈر میں حصہ لینے کے لئے مقامی حکام کے لئے زبردست بونس اور دیگر ترغیبات کا استعمال کرتی ہیں-1995ء کے سیاسی بحران کے عین درمیان جب اپوزیشن رہنما

اعلیٰ سطح پر کرپشن کے متعلق شور وغوغا کر رہے تھے- صدر نذر بایوف نے دوسرے وسط ایشیائی رہنماؤں کا طریقہ اختیار کیا اور عوامی ریفرنڈم کے ذریعے2000ء تک صدارت پر فائز رہنے کا حق حاصل کر لیا- جون2000ء میں نذر بایوف نے پارلیمنٹ کے ذریعے نہ صرف تاحیات اختیارات حاصل کر کے خود کو مزید مضبوط کر لیا بلکہ خود اور اپنے خاندان پر لگائے جانے والے حالیہ الزامات (اور مستقبل کے متوقع الزامات) کے خلاف استثنائی تحفظ بھی حاصل کر لیا-

لگتا یہ ہے کہ نذر بایوف قازقستان میں اپنے خاندان کی سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں- ان کی 37 سالہ بیٹی داریگا ناز کا نام عام طور پر ان کی جاں نشین کے طور پر لیا جاتا ہے- ناز پہلے ہی قومی ذرائع ابلاغ پر قابض ہے- اخبارات اور ٹیلی ویژن کا80% حصہ' ان کی قلمرو میں شامل ہے اور ان کے شوہر راحت علی یوف قازقستان کی داخلی سلامتی کی ایجنسی کے سربراہ ہیں- نذر بایوف کے دوسرے داماد تیمور قلی بایوف اور ان کے بھتیجے قائرت ساتیبالدا کے قازقستان میں وسیع کاروباری مفادات ہیں اور وہ اقتدار کی تگ و دو میں ہیں-

ظالمانہ اور کرپٹ سیاسی عمل نے انتہا پسند اپوزیشن پارٹیوں کو مہمیز دی ہے کیونکہ نوجوان قازق اور ازبک' ازبک اسلامی تحریک جیسی انقلابی اسلامی جماعتوں میں شامل ہونے لگے ہیں- یہ تحریک بظاہر تو ازبکستان کی حکومت کو ہی نشانہ بنائے ہوئے ہے لیکن درحقیقت اس کے کئی محاذ ہیں- (ملاحظہ کریں باب 7 اور 8)- ایک نسبتاً کم سیاسی اور کم تشدد پسند جماعت حزب التحریر ہے جو پورے وسط ایشیا میں شریعت کے نفاذ کی داعی ہے- (چھٹا باب دیکھئے) سیاسی منظر نامے کی دوسری جانب' شمال کے روسی آباد کار علیحدگی کی تحریک چلا رہے ہیں- یہ تحریکیں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والا دباؤ قازقستان کے تحفظ اور سلامتی کے لئے ایک مسلسل خطرہ بن رہے ہیں-2001ء میں قازقستان نے اپنا فوجی بجٹ دوگنا کر کے 171 ملین امریکی ڈالر کر دیا- (داخلی خام پیداوار کا ایک فیصد) تاکہ ازبک اسلامی تحریک کے گوریلا حملوں کے مقابلے کے لئے موبائل جنگی یونٹس تشکیل دیئے جا سکیں-

سیاسی پابندیوں کے ماحول نے انسانی حقوق کی پامالی میں بھی خاصا اضافہ کیا ہے- اس حقیقت کے باوجود کہ قازقستان موت کی سزاؤں پر عملدرآمد کرانے والا' دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے' ملکی جیلیں بیمار اور تباہ حال قیدیوں سے بھری ہوئی ہیں- صرف1995ء میں سو قیدیوں کو

سزائے موت دی گئی۔ افغانستان سے درآمدی سستی ہیروئن کے ہاتھوں' نشے کی وبا بری طرح پھیل رہی ہے۔ 2001ء میں قازقستان میں 37 ہزار لوگوں کو سرکاری طور پر نشے کے عادی افراد شمار کیا گیا جبکہ اندازے کے مطابق یہ تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ منشیات کی عادت اور انجکشن کے مشترکہ استعمال نے ایڈز ایچ آئی وی بحران میں گویا مزید آگ بھڑکا دی ہے۔ موجودہ اندازوں کے مطابق تین لاکھ وسط ایشیائی لوگ ایچ آئی وی کے متاثرین میں شامل ہیں۔ان میں بڑی تعداد قازقستان کے باشندوں کی ہے۔

کرپشن اور نا اہلی کے نتیجے میں نئے دارالحکومت کی تعمیر جیسے فضول پراجیکٹس کا سلسلہ جاری ہے۔ وسیع تعلقات کے حامل مٹھی بھر لوگوں اور عوام کے درمیان معاشی عدم مساوات بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ آزادی کے بعد غریب عوام کی حالت میں ذرا بہتری نہیں آئی۔ قازقستان کے وسیع و عریض قدرتی ذخائر کے مسلسل ضیاع کی بدولت عوامی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تاہم نذر بایوف کی روس اور مغرب کے ساتھ متوازن پالیسی اور ہمسایہ ریاستوں کی نسبت' بہتر امن و امان اور استحکام نے مغربی آئل کمپنیوں کو سرمایہ کاری کے لئے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔2000ء میں قازقستان کی پیداوار 170 بلین کیوبک فٹ گیس اور 6 لاکھ ترانوے ہزار بیرل آئل روزانہ تک آ گئی تھی۔ آئل ایکسپورٹ میں زبردست اضافے کی وجہ سے گزشتہ سال کے 1.7% شرح اضافہ کے بجائے' 2001ء میں داخلی خام پیداوار میں 9.5% کا اضافہ ہوا۔ آزادی کے بعد سے' یہ سب سے بڑی معاشی چھلانگ تھی۔ افراط زر میں 9% کمی ہوئی اور اشیائے ضرورت کی قیمتیں نسبتاً مستحکم ہو گئیں۔ تنگیز پائپ لائن کے ذریعے موجودہ آئل ایکسپورٹ کے عمومی بہاؤ کے ساتھ' مجوزہ امریکی پائپ لائن کے ذریعے باکو آذربائیجان سے جیجون' ترکی تک اور شاید ایک اور نئی پائپ لائن کے ذریعے چین کو بھی ــــــ آئل سپلائی جاری رکھ کر آنے والے سالوں میں قازقستان زرمبادلہ حاصل کرتا رہے گا۔

قازقستان کا مسئلہ یہ ہے کہ اس آمدنی کو کس طرح خرچ کیا جائے۔عوام کی اکثریت کا معیار زندگی انتہائی پست ہے۔حکومت ابھی تک سابقہ پنشنیں اور تنخواہیں ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکی۔ آئل انڈسٹری کے نئے مالدار کرتا دھرتا' الماتا کی سرسبز شاہراہوں پر مرسیڈیز

اور بی ایم ڈبلیو اڑاتے پھرتے ہیں جبکہ عوام بس کا ٹکٹ بھی بمشکل برداشت کر پاتے ہیں- قازقستان کی اس نئی دولت کے اثرات عام آدمی تک نہیں پہنچ پائے- معاشی عدم مساوات عوامی نمائندگی کی غیر موجودگی اور عقیدے کے اظہار پر پابندی سیاسی بے چینی میں اضافہ کئے جا رہی ہے اور عام آدمی انقلابی اسلامی تحریکوں کے قریب تر ہو رہا ہے-

سینڈوچ کرغیزستان

کرغیزستان کے ایک لاکھ پچیس ہزار مربع میل علاقے کا93% حصہ پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے- ان بلند و بالا پہاڑوں نے اپنی قوم کی ایک تلخ تر حقیقت کو ہمیشہ چھپایا ہے- ان کرغیز قبائل کی روز مرہ زندگی ہمیشہ ہی ناقابل یقین حد تک مشکل رہی ہے- کبھی ان خانہ بدوشوں کا چنگیز خان کے سنہری جتھے سے تعلق تھا- ان کا واحد ذریعہ آمدنی ان کے مویشی ہیں- کرغیزستان کی اڑتالیس لاکھ آبادی (جن میں کرغیز صرف52% ہیں) کے پاس اپنی تعداد سے پانچ گنا زیادہ مویشی ہیں- ان پہاڑی قبائل کا قدیم مرکز بشکیک کے شمال مشرق میں واقع طقمان نامی میدانی علاقہ ہے- قبائل کے سربراہ وہاں اپنی کونسل منعقد کرتے تھے- طقماق کے جنوب مشرق میں ایسک کل کی جھیل ہے- یہ تیان شان پہاڑیوں کی پہنائیوں میں واقع ہے____ اندرونِ ملک موجود وہ سمندر جس کے کنارے چنگیز خان اور تیمور نے کبھی پڑاؤ کیا تھا- سوویتوں نے بعد ازاں اسے اعلیٰ کمیونسٹ حکام کے لئے تفریحی مقام کی شکل دے دی تھی-

کرغیز قازق نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں- دونوں ہی سائبریا کے جنوب کی طرف سے آئے- کرغیز پہاری علاقوں میں بس گئے جبکہ قازق میدانی علاقوں میں آباد ہو گئے- 1917ء سے پہلے روسی دونوں کو ہی کرغیز کہتے تھے____ موجودہ جغرافیائی تقسیم سٹالن کے ذہن کی پیداوار تھی- آج بھی کرغیزستان اور قازقوں کی روایات، رسم و رواج اور زبان ملتی جلتی ہیں-

ان خانہ بدوش پہاڑی باشندوں کی تاریخ رزمیہ شاعری اور لوک گیتوں پر مشتمل ہے- ان میں سب سے مشہور اور طویل ترین سرگزشت ایک روایتی کرغیز کردار ''ماناس'' کی ہے، جو اڑن گھوڑے پر سفر کیا کرتا تھا- ماناس نے کرغیز قوم کے لئے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے- ان فلک بوس پہاڑوں اور برفاب جھیلوں کا پس منظر، ان افسانوی روایات کی جنم

بھومی ہے-

کرغیزوں نے وسط ایشیاء کی عظیم تہذیب کے ایک کنارے پر اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے- مقامی قبائل اور چین اور سائبیریا سے ہجرت کر کے آنے والے نئے قبائل ان میں جذب ہو کر ان کی تعداد بڑھاتے رہے ہیں- قازقوں کی طرح' کرغیزوں نے بھی دیر سے اسلام قبول کیا اور قبل از اسلام شامانی تمدن کے اثرات ان خانہ بدوش قبائل کی بہت سی روایات میں آج بھی نمایاں ہیں-

قازقوں کی طرح روسی آباد کاروں نے کرغیزوں کو بھی اپنے گھر بار چھوڑنے اور پہاڑوں کے دور دراز کناروں پر جا بسنے پر مجبور کر دیا تھا- روسی آباد کار یہاں کی چھوٹی چھوٹی وادیوں کی زرخیز زمین کو قابلِ کاشت بنانے آئے تھے-بعض کرغیزوں نے بسماچی باغیوں کے ساتھ شامل ہو کر1929ء تک سوویت یونین کے خلاف مزاحمت جاری رکھی- سٹالن کے پروگرام کے مطابق جب یہ علاقہ سوویت مقبوضہ بن گیا' تب بھی بہت کم مقامی باشندے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے- یہی وجہ ہے کہ آزادی کے وقت حکومتی ڈھانچے یا ٹیکنالوجی کے دائرے میں بمشکل ہی کوئی کرغیز موجود ہوگا کیونکہ سوویت جمہوریاؤں میں انہوں نے کبھی امتیازی عہدوں تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی- سٹالن کی تخلیق کردہ جغرافیائی تقسیم نے کرغیزستان میں خاص طور سے نسلی مسائل کو جنم دیا- شہروں اور شمال میں روسیوں کی اچھی خاصی تعداد لمبے چوڑے حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے- جبکہ اوش اور جنوب میں موجود ایک بڑی ازبک آبادی' کرغیز حکومت کی جانب سے امتیازی سلوک کی شدید شاکی ہے-

سوویت دور کے آخری زمانے میں کرغیزستان میں کمیونسٹ پارٹی پر تین بڑے گروہوں کا قبضہ تھا- طویل عرصے تک برسر اقتدار رہنے والے فرسٹ سیکرٹری ترادا کن یوسفوبلیوف کو جب1985ء میں برطرف کیا گیا تو ان کی جگہ عبدالصمد مثالییف کو مقامی کمیونسٹ پارٹی کا فرسٹ سیکرٹری بنایا گیا- وہ اپریل1990ء میں دوبارہ منتخب کر لئے گئے مگر اس کے فوراً بعد ہی ان گروہوں کے مابین شدید تصادم شروع ہو گیا- ملک میں سب سے زیادہ طاقتور بلاک کے نمائندوں ____ مشرق کی جانب نارین کے اراکین ____ نے سابقہ رہنما یوسفوبلیوف کی حمایت کر دی- مغرب میں تلاس کے علاقے نے معزول ہونے والے مثالئیف کا ساتھ

دینا شروع کر دیا- جنوب میں اوش کے علاقے کے طاقتور معاشی اور کاروباری گروہوں نے ــــــ جہاں ازبک چھائے ہوئے تھے- بشکیک کے مقتدر سیاسی ڈھانچے میں شمولیت سے صاف انکار کر دیا- انہوں نے ایک غیر جانبدار سیاست دان عسکر آقایوف کا ساتھ دیا- عسکر آقایوف پیٹرزبرگ کے ایک نامور تعلیمی ادارے میں محقق تھے اور مشہور ماہر طبعیات اور سوویت دور کے اہم منحرف آندرے سخاروف کے قریبی ساتھی تھے-1990ء کے آخر میں نارین بلاک بھی آقایوف کی حمایت پر آمادہ ہو گیا-

ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا عوامی احتجاج سیاسی بحران اور افراتفری میں روز افزوں اضافہ کرتا رہا- نتیجتاً کمیونسٹ پارٹی کی روایتی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی- مارچ1989ء میں نوجوان کرغیز دانشوروں نے اشر کے نام سے اپوزیشن کی ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی- اس جماعت نے شہر میں رہائشی سہولیات اور ٹرانسپورٹ کی کمی کے خلاف احتجاجاً بشکیک میں خالی زمین پر قبضہ کر لیا- پھر جون1990ء میں اوش میں کرغیزوں اور ازبکوں کے درمیان خون ریز نسلی تصادم شروع ہو گیا- سرکاری طور پر دوسو اموات اور تین ہزار سے زائد افراد کے زخمی ہونے کا اعلان کیا گیا جبکہ مصدقہ ذرائع کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ اموات ہوئیں- امن و امان قائم کرنے کے لئے ازبکستان سے سوویت فوجی دستوں کو طلب کرنا پڑا- جوں جوں کمیونسٹ حکومت پر عوامی تنقید کا دباؤ بڑھا ــــــ انہی دنوں پارٹی شدید اندرونی رقابتوں کے ہاتھوں بھی نقصان اٹھا رہی تھی ــــــ کئی سیاسی گروہوں نے آقا یوف کی حمایت کا اعلان کر دیا- اس طرح آقایوف 28 اکتوبر کے انتخابات میں کرغیزستان کی سپریم سوویت کونسل کے صدر بن گئے-1991ء میں آزادی کے وقت1991ء کے موسم خزاں میں آقا یوف زبردست عوامی حمایت کے بل پر بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے- وہ پہلے غیر کمیونسٹ ہیں جو کسی وسط ایشیائی ریاست کے صدر چنے گئے ہیں-

لیکن آزادی کے ساتھ ہی روسی مالی امداد منقطع ہو گئی اور کرغیزستان وسط ایشیا کے سب سے سنگین معاشی بحران کا شکار ہو گیا- دس سال تک آقایوف ملک کو سنبھالا دینے کی تگ و دو میں لگے رہے ہیں- یہ کوئی آسان کام نہیں تھا-1993ء میں صنعتی پیداوار کے بحران اور مقامی ڈیری اشیاء کے لئے روسی مارکیٹ کھو دینے کے بعد افراط زر میں1200% کا خوفناک اضافہ ہو گیا- ملک میں قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں' اس لئے آقایوف نے غیر

جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور اہم اقتصادی اصلاحات کے ذریعے مغرب کی مالی معاونت کو متوجہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ1993ء میں کرغیزستان وسط ایشیا کا وہ پہلا ملک بن گیا جس نے آئی ایم ایف کے پروگرام پرعمل کرنے اور ریاستی ملکیت میں موجود کاروبار اور زمین کو پرائیویٹائز کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

ایک مختصر سے وقفے کے لئے تو صدر آقایوف کا پروگرام کامیاب ہوتا نظر آیا۔ مغربی ممالک اور جاپان نے ان کے اصلاحاتی ایجنڈے اور نئی کرنسی ''سوم'' کے اجرا کی حمایت کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ کرغیزستان کی کامیابی دوسرے وسط ایشیائی ممالک کے لئے ایک شاندار مثال بن جائے گی اور وہ بھی اس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ مگر کرغیزستان آئل' گیس اور کوئلے جیسی ضروری اشیاء کی فراہمی کے لئے اب بھی ہمسایہ ممالک ازبکستان اور قازقستان کی نوازشات کا محتاج تھا' اسی لئے اس کی معیشت بدستور کمزور اور غیر محفوظ رہی۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں نئے الیکٹرسٹی گرڈز اور آبپاشی کے لئے ڈیم جیسے نئے اور بڑے تحتی ڈھانچوں کے پراجیکٹس میں سرمایہ کاری کرنے سے ہچکچا رہی تھیں' جبکہ آقایوف ـــــ وسط ایشیاء کو اپنی برآمدات کے لئے ـــــ انہی پراجیکٹس پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ کرغیزستان میں خاصے معدنی ذرائع ہیں مگر ان کی ترقی کے لئے بھی بہت کم کمپنیاں سرمایہ کاری کر رہی ہیں کیونکہ پہاڑی علاقے کے دشوار گزار راستوں پر' ان خام معدنیات کی نقل و حمل میں خاصی مشکلات حائل ہیں۔

اس طرح آہستہ آہستہ کرغیزستان نے اپنے داخلی معاشی مسائل میں اضافہ کے لئے بین الاقوامی قرضوں کا ایک کوہِ گراں بھی تعمیر کر ڈالا ہے۔1999ء میں یہ قرضہ 1.27 بلین امریکی ڈالر کا تھا۔ وسط ایشیا کے ممالک میں فی کس قرضے کے اعتبار سے یہ سب سے بڑی مالیت کا قرضہ ہے۔ معاشی صورت حال میں ابتری کی وجہ سے کرغیزستان قرضے کی واپسی کی اقساط ادا کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ بے روزگاری' بھوک اور غربت کے بڑھنے کے ساتھ' معیار زندگی گرتا چلا گیا اور سیاسی مخالفت میں اضافہ ہونے لگا۔ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے آقایوف زیادہ آمریت پسند ہوتے گئے۔1995ء تک کرغیزستان میں آزادانہ کثیر جماعتی الیکشن ہوئے تھے ـــــ یہ وسط ایشیا کا واحد ملک تھا جس نے ایسا کیا ـــــ جس میں زبردست اپوزیشن طاقت پارلیمنٹ میں بھی آ گئی تھی اور صدر آقایوف

کے اپوزیشن سے تعلقات بھی خاصے اچھے رہے' لیکن1996ء کے بعد پارلیمنٹ اور صدر اقتدار کی مسلسل کشمکش میں الجھ کر رہ گئے- آئے دن کے سیاسی بحران اور کرپشن کے سکینڈلز نے حکومت اور آقایوف کی جمہوریت پسندی کی شہرت کو داخلی اور خارجی طور پر شدید نقصان پہنچایا- آقایوف کی مخالفت میں سیاسی جماعتوں کے علاوہ مختلف نسلی گروہ بھی باہر نکل آئے- روسیوں کی ایک بڑی آبادی (1991ء میں22%) نے اپنے مطالبات پورے نہ ہونے کی شکل میں ترک وطن کی دھمکی دے ڈالی- آقایوف نے اعلیٰ تربیت یافتہ افراد کے ملک چھوڑ جانے کے خوف سے ان کے لئے بشکیک میں ایک سلاو یونیورسٹی قائم کر دی تا کہ نوجوان روسی ہجرت کا خیال چھوڑ دیں-1999ء میں انہوں نے روسی زبان کو کرغیزی زبان کے مساوی درجہ دے دیا- لیکن ہر رعایت کے جواب میں روسی نئے مطالبات داغ دیتے جبکہ کرغیز قوم پرست بھی جوابی مطالبات پیش کر رہے تھے- اسی دوران جنوبی کرغیزستان میں ازبک کرغیز نسلی بے چینی پھیلنے لگی- جنوبی شہر ابھی تک دو مختلف برادریوں میں منقسم نظر آتے ہیں- کیونکہ دونوں گروہوں نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ سکول' مساجد اور بازار بنا رکھے ہیں- اوش میں ازبک آبادی سیاسی عمل سے باہر ہے اور کسی انتظامی ادارے یا پولیس میں اس کی کوئی نمائندگی نہیں- اسی دوران ہمسایہ ازبکستان اور قازقستان کے ساتھ بھی کشیدگی بڑھنے لگی کیونکہ یہ دونوں ممالک آقایوف سے جمہوری اصلاحات کے خاتمے____ یہ جمہوری اصلاحات ان کی ظالمانہ حکومتوں کے لئے زبردست خطرہ تھیں____ اور جنوب میں اسلامی بنیاد پرستی سے سختی سے نمٹنے کا مطالبہ کر رہے تھے- آقایوف پر دباؤ کو شدید کرنے کے لئے ازبکستان نے کرغیزستان کو آئل اور گیس کی سپلائی 1999ء کے موسم بہار میں اور دوبارہ 2000ء کے موسم سرما میں بند کر دی- پٹرول کی عدم دستیابی کی وجہ سے ہوائی جہازوں کو کئی ہفتوں تک بشکیک میں گراؤنڈ رکھا گیا- آقایوف نے شدید دباؤ کے آگے سر جھکا دیا اور اسلامی انقلابیوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں اور تمام مساجد اور مدارس کو سرکاری طور پر رجسٹرڈ کرانے کا حکم دے دیا- اسی دوران چین نے____ جو اس وقت تک اشیاء اور امداد مہیا کرنے والا ایک اہم شریک کار بن چکا تھا____ مسلم اوئی غر آبادی کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے حکومت پر زور دینا شروع کر دیا- چین کے بقول یہ مسلمان اوئی غر زن جیانگ صوبے کے چینی اوئی غروں میں بے چینی پھیلانے کے ذمہ

دار تھے- آقایوف نے ان مطالبات کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دیا اور بشکیک میں درجنوں اوئی غر مسلمانوں کو گرفتار کر لیا- کرغیزستان جو کبھی وسط ایشیائی ریاستوں میں مذہبی اعتدال پسندی کا قائد تھا' ہمسایہ ریاستوں کی ظالمانہ پالیسوں میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا-

لیکن انتہا پسند مسلمانوں کی گرفتاریوں کے ذریعے ہمسایہ ممالک کی ناز برداری کے چکر میں آقایوف خود اپنے ملک کو بھی اس آگ سے محفوظ نہیں رکھ سکے- 1999ء کے موسم گرما میں ازبک مسلم تحریک کے چند سو انقلابیوں نے جنوبی کرغیزستان پر حملہ کر کے بہت سے دیہاتوں پر قبضہ کر لیا اور سونا نکالنے والی ایک کمپنی کے چار جاپانی ماہرین ارضیات سمیت بیس افراد کو یرغمال بنا لیا- انقلابی وادی فرغانہ تک پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہاں اسلام کریموف کے خلاف مزاحمتی مراکز بنا سکیں- آٹھ ہزار جوانوں پر مشتمل کمزور سی کرغیزی فوج اور انقلاب پسندوں کے درمیان پورے موسم گرما' اسی طرح آنکھ مچولی ہوتی رہی- یہاں تک کہ انقلابی خود ہی وہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے- جولائی2000ء میں ازبک مسلم تحریک تو پسپا ہو گئی لیکن کرغیزستان اور ازبکستان کے درمیان تصادم کی نئی چنگاڑیاں چھوڑ گئی- لیکن انہی انتہا پسندوں کی بدولت کرغیزستان کو بین الاقوامی برادری میں اہمیت بھی ملی ہے- سالوں تک آقایوف روس اور وسط ایشیائی ممالک کے درمیان زیادہ معاشی تعاون کی وکالت کرتے رہے لیکن مسلم ازبک تحریک کا خطرہ ابھرنے سے پہلے' کریموف ان اپیلوں کو نہ صرف نظر انداز کرتے تھے بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے تھے- مسلم ازبک تحریک نے وسط ایشیا کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب کر دیا ہے- جن دنوں ازبک تحریک نے بیس افراد کو یرغمال بنایا ہوا تھا' آقایوف شنگھائی فائیو کی ایک کانفرنس کی میزبانی کر رہے تھے- اس کانفرنس میں بین الاقوامی دہشت گردی' غیر قانونی ڈرگ ٹریڈ' ہتھیاروں کی تجارت' غیر قانونی مائیگریشن' علیحدگی پسندی اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف باہمی تعاون کا عہد کیا گیا- امریکہ' روس اور چین سے کرغیزستان کو وسیع فوجی امداد ملنا شروع ہو گئی- امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے مارچ2000ء میں بشکیک کا اپنا پہلا سرکاری دورہ کیا- جہاں انہوں نے کرغیز سرحدی گارڈز کو دوبارہ مسلح کرنے کے لئے تین ملین ڈالر دینے کا وعدہ بھی کیا- بہرحال انہی مختلف بحرانوں نے صدر آقایوف کو حوصلہ بخشا کہ وہ اپنے ہمسایہ ممالک کی تقلید میں سیاسی منحرفین کو کچل ڈالیں' مخالفوں کو جیل میں ڈال دیں' میڈیا پر پابندیاں لگا دیں اور اقتدار پر قابض

رہنے کے لئے انتخابات میں دھاندلی بھی کروا ڈالیں- یکے بعد دیگرے ریفرنڈم کے ذریعے انہوں نے آئین سے انحراف کا حق اپنی پالیسیوں کی حمایت اور اپنی سیاسی طاقت میں اضافے کا کام لیا ہے- انہوں نے فروری2000 کے پارلیمانی الیکشن میں مخالف سیاسی پارٹیوں اور امیدواروں پر پابندی عائد کر دی' اہم ترین سیاسی مخالفوں کو جیل میں ڈال دیا یا ملک سے فرار پر مجبور کر دیا- تنقید کرنے والے اخبارات کو یا تو سرے سے بند کر دیا گیا یا انہیں اتنا ہراساں کیا گیا کہ وہ خود ہی اخبار بند کر دیں- آقایوف کی جابرانہ پالیسیاں کوئی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں- امداد دینے والے مغربی ممالک نے2000ء کے الیکشن کو غیر جمہوری قرار دے کر ان کی مذمت کی اور ساتھ ہی پورے ملک میں احتجاج اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا- اپوزیشن مسلسل طاقتور ہو رہی ہے- محبّ وطن عوامی تنظیم کے نام سے دس سیاسی جماعتوں نے اپریل2000ء میں ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا تاکہ آقایوف کے ارتکازِ اختیارات کی بھرپور مخالفت کی جا سکے- این جی اوز نے____ جنہوں نے غربت کے خاتمے اور حکومتی اقدامات اور سرگرمیوں کو مانیٹر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے____ بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے سو مقامی تنظیموں کے اشتراک سے حفاظتی مقاصد کے لئے این جی او متحدہ محاذ بنایا ہے-

ورلڈ بینک کے مطابق60% آبادی غربت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے- ایڈز کا مسئلہ بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے- حکومت اس کا اعتراف تو کرتی ہے مگر اس کے سدباب کے لئے کر کچھ نہیں سکتی- ایڈز کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے2000ء میں صرف 24 ہزار ڈالر رکھے گئے- سیاسی حلقے' مزدور اور دانشور حکومت کو بار بار خبردار کرتے رہے ہیں کہ اسلامی انقلابیت کی بنیادی وجوہ غربت' بے روزگاری اور ایڈز کی بیماری ہیں- ''ایک زبردست معاشرتی دھماکہ ہونے کو ہے- لوگ شدید مایوسی کا شکار ہوئے ہیں اور وہ صورت حال میں بہتری پیدا نہیں کر پا رہے-'' جاپیر جیکشیف' چیئر مین جمہوری تحریک پارٹی نے اپنی رائے دی- نارین' جلال آباد اور بشکیک میں احتجاجی ہنگامے بھی ہوئے ہیں- جنوبی علاقوں میں غربت کے شدید اضافے نے مسلم ازبک تحریک کے لئے مسلم انقلابیوں کی پیداوار کے لئے انتہائی زرخیز زمین مہیا کر دی ہے- خصوصاً باتکن کے اردگرد کے علاقے میں' جہاں مسلم ازبکوں نے مسلسل دو سال تک حملے جاری رکھے ہیں' تمام دیہات شدید معاشی اور سماجی

مشکلات اور تکالیف کا شکار ہیں۔

معاشی بدحالی اور کسمپرسی اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ وہ کرغیز قبائل بھی' جن کا اسلام سے برائے نام ناتا تھا' تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اسلامی انقلاب پسندوں کی صف میں شامل ہو رہے ہیں۔ معاشی طور پر تباہ حال' دفاعی طور پر بے بس اور نسلی تصادم کے مسائل سے دوچار کرغیزستان' دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کے لئے ایک شاندار ماڈل بننے کے بجائے' وسط ایشیا کے میدان جنگ میں محض ایک مہرہ بن کر رہ گیا ہے۔

ترکمانستان: قیادت کے سحر میں

سوویت دور کے بعد وسط ایشیا میں سب سے انوکھا واقعہ' ترکمانستان کے صدر سپر مراد نیازوف کی کرشماتی شخصیت کا اجاگر ہونا ہے۔1991ء کی ابتداء سے ہی جب نیازدف نے خود کو ترکمان باشی (بابائے قوم) قرار دے کر پورے ملک کے چوراہوں پر اپنے مجسمے اور دیواروں پر تصاویر لگوانی شروع کی تھیں' ان کی شخصیت کا جادو اس طرح پھیلایا گیا کہ مختلف عمارات' شاہراہیں یہاں تک کہ شہروں کے نام بھی ان کے نام پر رکھے جانے لگے۔ ان کی و الدہ کو بھی ایک سحر انگیز شخصیت کا درجہ دے دیا گیا اور نیازدف کی جائے پیدائش اور سکول تو مقدس آستانے بن گئے۔ وسط ایشیا کی آمریت پسند حکومتوں کے معیار سے بھی نیازدف کی حکومت علاقے کی انتہائی جابرانہ اور آمرانہ حکومت لگتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندی ہے' ذرائع ابلاغ' جلسے جلوس ـــــ یہاں تک کہ تعلیمی جلسے بھی ـــــ حکومتی کنٹرول سے باہر نہیں۔ ہندو اور عیسائی رہنماؤں کو سیاسی مخالفین کے ہمراہ' ملک سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ (یہاں مسلم اپوزیشن کا وجود ناپید ہے۔)

جنوری1994ء میں نیازدف نے اپنی کٹھ پتلی پارلیمنٹ کو''تجویز'' دی کہ انہیں2002ء تک کے لئے صدر نامزد کر دے۔ پارلیمنٹ نے ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں2001ء میں ایک قرارداد کے ذریعے' نیازدف کو تاحیات صدر رہنے کے لئے کہا گیا۔ نیازدف نے اعلان کیا کہ وہ2010ء میں صدارت کا عہدہ چھوڑ دیں گے اور اس کے بعد صدارتی انتخاب میں ایک سے زائد امیدوار حصہ لے سکیں گے۔1996 میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس حکومت کو''پوشیدہ طور پر جابرانہ اور دہشت انگیز'' قرار دیا۔ آج یوں لگتا ہے جیسے یہ الفاظ اس حکومت کی

فعالیت کا صحیح احاطہ نہیں کرتے۔

سزائے موت کا بلا امتیاز استعمال' قیدیوں پر تشدد' جیلوں کا حد سے زیادہ بھر جانا (جہاں اکثر خونیں ہنگامے ہوتے ہیں) اور منحرفین کا نام و نشان تک پتہ نہ چلنا۔ یہ سب اس حقیقت کے غماز ہیں کہ حکمران ٹولہ اقتدار سے چمٹا رہنا چاہتا ہے۔ جولائی2000ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ وہ تمام غیر ملکی سیاحوں' غیر ملکی ڈاک اور ٹیلی فون کالز کو مانیٹر کرے گی اور انٹرنیٹ مہیا کرنے والوں کو لائسنس جاری کرے گی۔ نیازدف نے انگلش اور دوسری زبانوں کی' اسکولوں میں تعلیم پر پابندی لگا دی تا کہ مقامی لوگ مغربی رجحانات کے بارے میں انجان رہیں۔ ترکمان طلبہ پر غیر ملکی سکالرشپ لینے پر پابندی لگ گئی۔

فروری2001ء میں نیازدف کے احکامات کی نوعیت بہت ہی اوٹ پٹانگ ہو گئی۔ انہوں نے دارالحکومت کی تمام شاہراوں کو عددی نام دے دیئے اور تمام شہریوں کو اپنے گھروں پر قومی پرچم لہرانے کی ہدایت کی اور سب سے اہم یہ کہ انہوں نے ترکمانوں کے لئے ایک نیا روحانی ضابطہ اخلاق متعارف کرایا' جو ان کی اپنی تحریروں پر مشتمل تھا۔ تین گھنٹے طویل اپنی تقریر میں انہوں نے اس ضابطے کا بائبل اور قرآن مجید کے ساتھ تقابلی جائزہ بھی لیا۔

بہرحال آزادی کے وقت ترکمانستان کو کئی فوائد حاصل تھے۔ وسط ایشیا میں سب سے زیادہ نسلی ہم آہنگی یہاں تھی۔ سینتالیس لاکھ آبادی کا72% حصہ ترکمان نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا تعلق بیس سے زیادہ قبائل سے ہے تاہم دو بڑے قبائل ___ تیکی اور یومٹ ___ قومی سیاسی قیادت فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کی طرح' یہاں نسلی تصادم کا کوئی خطرہ نہیں۔ مزید براں اس کے پاس546 ملین بیرل پٹرول اور260 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کے حقیقی ذخائر موجود ہیں۔ یہ دنیا کے ساتویں سب سے بڑے ذخائر ہیں۔

ترکمانوں کی ابتدا مشرقی وسط ایشیا کے القائی علاقے سے ہوئی۔ بعد میں وہ اوغر ترکوں کے ساتھ ساتھ کیپسین کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے۔ کوئی ریاستی تشکیل کئے بغیر' تاہم پورے قبائلی کروفر کے ساتھ' انہوں نے حملہ آور اور جنگجو قوم کی حیثیت سے صحرائی ماحول میں اپنا ایک زبردست مقام بنایا۔ یہ لوگ شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ کاروانوں کو لوٹا کرتے

تھے- پھر انہوں نے ایران' روس اور افغانستان پر زبردست حملے کئے تا کہ وہاں سے غلام بنا کر لا سکیں- ان غلاموں کو یہ عموماً مقامی حکمرانوں کو فروخت کر دیتے تھے- انہوں نے ایرانی' ترکی' افغان اور وسط ایشیائی حکمرانوں کے لئے کرائے کے سپاہیوں کی حیثیت میں جنگیں بھی لڑیں-1881ء میں جیوک تاپی کے مقام پر انہوں نے پوری روسی فوج کا صفایا کر دیا تھا تاہم اسی سال جنرل وان کاف مین کی زیر قیادت روسی فوج نے جوابی حملہ کر کے انہیں تباہ کر ڈالا- وان کاف مین کے بقول دنیا میں سب سے خوفناک لائٹ کیولری ترکمانوں کی ہے- بلا استعجاب' ترکمان گھوڑے اور خصوصاً اخل تکی نسل کے گھوڑے پوری دنیا میں پسند کئے جاتے ہیں- (سکندر اعظم بھی میدانِ جنگ میں اخل تکی گھوڑا استعمال کرتا تھا) روسی انقلاب کے بعد ترکمان (یومٹ قبیلے کے ایک دولت مند زمیندار) محمد قربان جنید خان کی قیادت میں بسماچی باغیوں کے ساتھ شامل ہو گئے- ان کی مزاحمت 1927ء تک جاری رہی-

تین لاکھ پانچ ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے ترکمانستان کا 3/4 حصہ صحرائے کراکم پر مشتمل ہے- دریائے آمو کے اردگرد کا علاقہ صرف کاشتکاری کے لائق ہے- سوویتوں نے یہاں آبپاشی کا نظام بنایا تا کہ یہاں کپاس کی فصل کاشت کی جا سکے- تاہم کسانوں کو غذائی اجناس اگانے کی اجازت نہیں دی گئی- آبپاشی کے اس نظام نے پورے علاقے کو ارضی طور پر تباہ حال علاقے میں بدل ڈالا ہے- بحیرہ آرال کی سمت رواں پانی کو روک لیا گیا- ایک طرف تو سمندر کا پانی کم ہوتا چلا گیا اور دوسری جانب سطح زمین شدید سیم وتھور کا شکار ہو کر رہ گئی- تاہم صحرائی ریت کے نیچے آئل اور گیس کے بے اندازہ ذخائر موجود ہیں- جب ترکمانستان آزاد ہوا تو نیازدف نے اسے ''ایک نیا کویت'' بنانے کا عہد کیا تھا- یہ عہد ابھی ایفا ہونا ہے-

عاشق آباد پچھلی صدی میں دو بار_____1929ء اور 1948ء میں_____ زلزلوں کے ہاتھوں شدید تباہ کاری کا نشانہ بنا ہے- آخری زلزلے نے سارا شہر ہی تباہ کر دیا تھا- ایک لاکھ دس ہزار افراد موت کی گود میں چلے گئے- لیکن ترکمانستان سے باہر دنیا کو اس حادثے کا پتہ بھی نہیں چلا- سٹالن نے یہ تسلیم ہی نہیں کیا کہ یہاں زلزلہ آیا تھا- اس بارے میں کوئی خبر جاری نہیں ہوئی- بعض ترکمان اپنی دانش ورانہ پسماندگی کی ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ تمام تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اس زلزلے کی نذر ہو گیا تھا- نیازدف خود بھی اس حادثے

کی بدولت یتیم ہوئے- وہ کمیونسٹ پارٹی کے یتیم خانوں میں پلے بڑھے-تعلیم یافتہ طبقے کی عدم موجودگی نے ترکمانوں کو روسی انتظامیہ' سرمایہ کاری اور تیکنیکی معاونت کا محتاج بنا دیا- روسی آج بھی مقامی نوکر شاہی پر پوری طرح چھائے ہوئے ہیں- چونکہ ماسکو کو ترکمان قدرتی ذخائر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ سائبیریا کے روسی علاقے کے قدرتی ذخائر سے استفادہ کر رہا تھا' اس لئے ترکمانستان سوویت یونین کی سب سے غریب جمہوریہ بنا رہا- آزادی کے وقت ترکمانسان میں18% بے روزگاری اور شیر خوار بچوں کی موت کی شرح چون فی ہزار تھی ____ مغربی یورپ کے مقابلے میں یہ تعداد دس گنا زیادہ ہے- بچوں کو کپاس کے کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا-غرض بدترین غربت حاوی تھی-

گزشتہ عشرے میں نیازدف نے مغربی آئل کمپنیوں کے ساتھ ترکمانستان سے روس' سے باہر باہر' آئل اور گیس کی پائپ لائن بچھانے کے لئے شدید کوششیں کی ہیں-لیکن ماسکو ہر جگہ کھیل خراب کرنے پر تلا ہوا ہے- اس کا کہنا ہے کہ ترکمانستان کی گیس وسط ایشیا اور دوسرے مغربی ممالک کو روسی پائپ لائن کے ذریعے بین الاقوامی سطح سے کہیں کم ارزاں نرخوں پر فراہم کی جائے- ان پائپ لائنوں کے ذریعے برآمد کی جانے والی گیس معاشی طور پر اتنی فائدہ مند نہیں جتنا کہ اسے ہونا چاہیئے- یوکرائن اور آرمینیا اپنی گیس کی قیمت ادا کرنے کے قابل ہی نہیں اور عدم ادائیگی کی وجہ سے کئی بار ترکمانستان کو پائپ لائن بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے-2000ء تک آزاد روسی دولتِ مشترکہ کے ممالک ترکمانستان کے 1.5 بلین امریکی ڈالر کے مقروض تھے- روس بھی ان ممالک میں شامل ہے-

1990ء کے عشرے کی ابتداء سے ہی نیازدف نے اپنی بے بحر سرزمین سے نئی پائپ لائن بچھانے کے کئی منصوبے پھیلا رکھے ہیں- ان میں ایک ایران اور ترکی کے راستے یورپ تک950 میل لمبی لائن ہے- ایک افغانستان کے راستے پاکستان اور ہندوستان تک کی 1125 میل لمبی لائن ہے اور ایک پائپ لائن5000 میل طویل چین کی جانب جاتا ہے- منصوبہ بندی کے مرحلے سے گزر کر صرف ایک چھوٹی سی پائپ لائن (118 میل طویل) مکمل ہوئی ہے- اسے1996 میں ایرانیوں نے بنایا تھا اور اس کے ذریعے شمالی ایران کو گیس فراہم ہوتی ہے- ایرانیوں نے مشہد اور ترکمانستان کو منسلک کرنے کے لئے ایک نئی ریلوے لائن بھی بچھائی ہے- اس طرح وسط ایشیا کی برآمدات کو پہلی دفعہ اس راستے سے بحیرہ عرب

تک رسائی ہو رہی ہے- لیکن بین الاقوامی کھلاڑیوں نے اس کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہونے دیا- واشنگٹن نے امریکی آئل کمپنیوں کو ایران کے راستے نئی پائپ لائن بچھانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا- جبکہ روس نے ترکی کی سمت جانے والی مجوزہ پائپ لائن کو روک دیا ہے- افغانستان کی خانہ جنگی کی بدولت' پاکستان آنے والی پائپ لائن کا راستہ بھی مسدود ہے- امریکہ اب نیازدف کو قائل کرنے کی کوشش میں ہے کہ وہ امریکی منصوبے کے مطابق باکو (آذربائیجان) سے آئل اور گیس کی ایک لائن ترکی کے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ جیجون تک بچھائے- روس اور ایران اس تحریک کے خلاف مزاحم ہیں-

ترکمانستان کی پائپ لائن کی مشکلات کے نتیجے میں اندرونِ ملک گیس کی پیداوار (اور اس کے ساتھ زرمبالہ کی آمدنی) میں ڈرامائی کمی واقع ہوئی ہے- عاشق آباد نے1989ء میں2.8 ٹریلین گیس فروخت کی تھی جبکہ1998ء میں یہ فروخت صرف480 بلین کیوبک فٹ رہ گئی- تاہم2000ء میں یہ عدد1.6 ٹریلین کیوبک فٹ تک بلند ہو گیا- چند ایک مغربی کمپنیوں نے ترکمانستان میں سرمایہ کاری کی ہے لیکن بڑی کمپنیوں نے سرمایہ کاری سے گریز کیا کیونکہ حکومت معاشی اصلاحات' پرائیویٹائزیشن یا غیرملکی سرمایہ کاری کو پرکشش مراعات کے لئے ضروری قانون سازی کے پروگرام پر عمل درآمد سے انکاری تھی- عاشق آباد نے جب بحیرہ کیسپیئن کے دہانے پر43 ہزار مربع میل طویل اپنا علاقہ1999ء میں ارضی سروے اور تحقیق کے لئے کھولنے کی کوشش کی تو بین الاقوامی طور پر اس کی کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی حالانکہ یہاں اندازے کے مطابق 500 ملین بیرل تیل اور101 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں) بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور دوسرے امدادی اداروں نے بھی ترکمانستان کی اعانت میں ہچکچاہٹ محسوس کی کیونکہ اس نے معاشی اصلاحات پر عملدرآمد شروع نہیں کیا تھا- اپریل2000ء میں تعمیر و ترقی کے لئے یورپی بنک نے حکومتی غیر جمہوری پالیسیوں کے خلاف احتجاجاً پبلک سیکٹر کے لئے290 ملین ڈالر کے قرضے روک لئے- عمومی خیال یہ ہے کہ نیازدف اور ان کے کرپٹ حکمران ٹولے کے تحت معاشی اصلاحات پر عملی جامہ ناممکنات میں سے ہے-

ترکمانستان غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی پر کاربند ہے جس کی وجہ سے اسے روس اور دوسری وسط ایشیائی ریاستوں سے مناسب فاصلہ برقرار رکھنے میں مدد ملی ہے لیکن اس کے

نتیجے میں ترکمانستان تنہائی کا شکار بھی ہوا ہے- نیازدف نے نہ صرف آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ (معاشی اور فوجی معاہدوں) میں شرکت سے انکار کیا بلکہ تاجکستان میں وسط ایشیائی امن فوج میں شمولیت بھی نہیں کی- اس نے طالبان یا افغانستان کی مذمت میں بھی وسط ایشیا کا ساتھ نہیں دیا- یہ آخری بات تو بہرحال سیاسی طور پر قابل فہم ہے کیونکہ ترکمانستان کے طالبان اور ان کے مخالفین دونوں سے ہی تعلقات ہیں- اسی وجہ سے ترکمان منحرفین اور اسلام پسند افغانستان میں پناہ نہیں لے سکے- ترکمان اپوزیشن کے زیادہ تر لوگ ماسکو میں پناہ گزین ہیں- دوسری جانب ترکمانستان میں کوئی زیر زمین اسلامی تحریک بھی موجود نہیں- تاہم اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی کے باوجود ترکمانستان کے روس سے قریبی فوجی روابط موجود ہیں- روسی دستے ترکمان ایران سرحد کے محافظ ہیں اور ترکمانستان میں روسی شہری دوہری قومیت کے حامل ہیں ___ اسی اقدام کے ذریعے آزادی کے بعد تعلیم یافتہ روسی شہریوں کا ترکمانستان سے انخلاف روکا جا سکا تھا- ترکمانستان کے پاس بے پناہ اقتصادی استعداد ہے اور اس کی مخصوص جغرافیائی حیثیت' مغرب' مشرق اور جنوب میں وسط ایشیائی گیس کی ترسیل کے لئے انتہائی مثالی اہمیت رکھتی ہے- بہرحال حکمرانوں نے قومی سماجی صورتِ حال کو بہتر بنانے اور معاشی اصلاحات کو متعارف کرانے اور خود کو بامعنی اور قانونی بین الاقوامی شریک کار بنانے کے لئے کوئی خاص تگ و دو نہیں کی-

ازبکستان: طوفان کے مرکز میں

بخارا' سمرقند اور وادی فرغانہ' اسلامی تہذیب اور قدیم ترین شہری تمدن کے مراکز' ازبکستان میں واقع ہیں- سمرقند' تیمور کا دارالحکومت' پانچ صدی قبل از مسیح میں تعمیرا ہوا تھا- سوگدین بادشاہ افراسیاب اس کا بانی تھا- جدید ازبکستان کے یہ شہر وسط ایشیاء کی کئی سلطنتوں کے دارالحکومت رہ چکے ہیں- وادی فرغانہ آبادیوں کے اعتبار سے ہمیشہ ہی بھرا پرا علاقہ اور بیک وقت بزرگان دین اور مسلم بغاوتوں کا ثقافتی مرکز رہا ہے- روسیوں نے بھی تاشقند کو وسط ایشیا کا سیاسی' صنعتی اور تجارتی مرکز بنا کر اسی تاریخی روایت کی پیروی کی- 22 لاکھ کی آبادی کا یہ شہر' کھلی اور سایہ دار شاہراہوں' سوویت طرزِ تعمیر اور زبردست صنعتی پارکوں ___ جہاں کبھی سوویت اسلحہ بنا کرتا تھا ___ کی وجہ سے اپنی مخصوص شان وشوکت کا آئینہ دار

ہے-

آج ازبکستان وسط ایشیاء کا سب سے بڑا اور طاقتور ترین ملک ہے- دو لاکھ اسی ہزار مربع میل رقبے پر محیط اس کی سرحدیں تمام وسط ایشیائی ممالک سے ملتی ہیں- 25 ملین کی آبادی میں69%لوگ ازبک نسل سے تعلق رکھتے ہیں- اس طرح ملک میں ایک مناسب نسلی ہم آہنگی موجود ہے- وسط ایشیا کے نسلی گروہوں میں سب سے زیادہ تعداد جنگ جویانہ فطرت اور اثر ونفوذ کے حامل ازبک تاجکستان (23%) ترکمانستان (13%) اور کرغیزستان (13%) میں بھی موثر اقلیت کے طور پر موجود ہیں- علاوہ ازیں 25ہزار ازبک چین کے صوبے زن جیانگ میں اور بیس لاکھ ازبک افغانستان میں بھی آباد ہیں- صدر کریموف ان بکھرے ہوئے ہم وطنوں سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں- اپنے اپنے ملکوں میں نسلی استحکام کے لئے مستقل خطرہ بن کر' یہ لوگ انہیں ہمسایہ ممالک پر اثر انداز ہونے کی قوت بہم پہنچا رہے ہیں-1992ء میں کابل کے مجاہدین کے قبضے میں چلے جانے کے بعد کریموف نے ازبک فوجی رہنما رشید دوستم کی____ روایتی پشتون دارالحکومت کابل کا مقابلہ کرنے کے لئے____ علاقے میں مزارِشریف کے اردگرد ازبک زون بنانے میں بھرپور معاونت کی-

خانہ بدوش قازقوں' کرغیزوں اور منتشر تاجک قبائل کے مقابلے میں وسط ایشیا میں ازبکوں کی جڑیں بہت ہی گہری ہیں- شیبانی ازبکوں نے1500ء میں تیمور شاہی کو شکست دے کر نہ صرف اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی بلکہ زبان و ادب کو بھی رواج دینا شروع کر دیا تھا- سولھویں صدی کا ایک مورخ محمود ابن ولی ازبکوں کے متعلق کہتا ہے: ''اپنی بدفطرتی' بہادری' پھرتیلے پن اور جرات مندی کے لئے مشہور ہیں-'' بقول اس کے ایک جانب تو ازبک انتہائی جنگلی اور کھردری شخصیت کے مالک ہیں اور دوسری جانب اپنی مہمان نوازی کی روایت کے لئے مسلم دنیا میں مثال بن گئے ہیں-

شیبانی سلطنت کے زوال کے بعد علاقے پر آہستہ آہستہ روسیوں کا قبضہ ہوتا گیا- ان کی جبری جدید پسندی کے ہاتھوں شہروں میں مرتکز جدید اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا- اس میں زیادہ تر ازبک اور تاتار مسلمان شامل تھے-1917ء کے انقلاب کے بعد بعض جدید پسندوں نے اسلام اور کمیونزم کو مجتمع کرنے کی کوشش کی' لیکن انہیں سٹالن نے بری طرح کچل دیا-1991ء کے بعد جدیدیت کی یہ تحریک دوبارہ قومی اپوزیشن پارٹیوں کی صفوں میں

اجاگر ہوئی لیکن براک اور ارک نامی دونوں جماعتوں پر کریموف نے فوراً ہی پابندی لگا دی- اس طرح کریموف نے اسلامی احیاء اور مسلم قوم پرستی کے اظہار کے لئے کوئی جمہوری راستہ باقی نہیں چھوڑا- روسیوں نے ازبکستان کو معاشی طاقت کا مرکز بنا دیا تھا- سوویتوں نے بھی یہ کام جاری رکھا- تاشقند وسط ایشیا کا عظیم صنعتی اور تجارتی مرکز بن گیا- ہزاروں روسی فوجی اور سول انتظامیہ کے افراد نئی سرحدوں کو آباد کرنے کے لئے یہاں پہنچ گئے- سوویت دور میں ازبکستان کو زرعی بنیاوں پر زبردست ترقی دی گئی- کپاس کی کاشت کے ذریعے زرعی معیشت کو استوار کیا گیا-1940ء اور1980ء کے درمیان کپاس کی پیداوار چار گنا ہو کر 2.4 ملین ٹن سے9.9 ملین ٹن تک بڑھ گئی- اس طرح ازبکستان کپاس کی پیداوار میں دنیا کا تیسرا سب سے بڑا ملک بن کر ابھرا- کپاس کی زراعت نے ارضیاتی صورتِ حال پر تباہ کن اثرات مرتب کئے- بحیرہ آرال اپنے رقبے کا55% حصہ اور35% پانی کا حجم صرف اس لئے کھو بیٹھا ہے کہ اس میں آ گرنے والے دریاؤں کا پانی آبپاشی کے لئے پہلے ہی استعمال ہو جاتا ہے- نتیجتاً فضائی اور سطحی آلودگی سے بھرپور گرد کے طوفانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے-1989ء میں کپاس کی پیداوار4.9 ملین ٹن تک رہ گئی تھی اور پھر اس میں بہتری پیدا نہیں ہوئی-لیکن ازبکستان میں گیس کے 70ٹریلین کیوبک فٹ ذخائر اور تیل میں خود کفالت کے علاوہ قیمتی معدنی وسائل بھی موجود ہیں- یہ سب ذخائر اس کی معاشی تقویت کا باعث ہیں-

ازبک کمیونسٹ پارٹی کی صفوں سے ابھرنے والے ازبکوں نے1920ء کے بعد سے ماسکو کے ساتھ بہترین تعلقات قائم رکھے ہیں- فرماں بردار کمیونسٹ ہوتے ہوئے بھی وہ ماسکو کی بالادستی کے خلاف مزاحمت کرتے رہے- سٹالن نے ان کی حرکتوں پر سخت برہمی کا اظہار کیا- ازبک کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ (83-1959ء) شریف رشیدوف نے کپاس کی پیداوار کے جعلی اعداد و شمار کے ذریعے روس میں صدی کے سب سے بڑے مالیاتی فراڈ کا ارتکاب کیا- ازبک' کمیونسٹ پارٹی میں اس طرح کی گڑبڑ کر کے' روسیوں کو بری طرح تنگ کیا کرتے تھے- اسی روایت کی بنا پر رشیدوف کو ہیرو سمجھا گیا- یہ روایت آج بھی قائم ہے اور ازبکستان کی معیشت کو ماڈرن بنانے کی راہ میں مسائل پیدا کر رہی ہے-مختلف ازبک علاقوں کے پارٹی لیڈروں کی سرپرستی اور ان پر اثر قائم رکھنے کے لئے ازبک کمیونسٹ پارٹی

کو ان کے کلیمز میں توازن بھی رکھنا پڑتا تھا- یہ اپنی جگہ ایک اہم مسئلہ ہے- سمرقند سے تعلق رکھنے والے کریموف کو تاشقند اور وادی فرغانہ کی اشرافیہ کی مخالفت کا مسلسل سامنا ہے- وسط ایشیا کے دوسرے رہنماؤں کی طرح کریموف بھی کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری تھے- انہوں نے آزادی کے فوراً بعد اس عہدے کو ختم کر کے ملکی صدارت سنبھال لی- وہ انہی کی طرح کلی اختیارات کے حامل ہیں- مزاحمت کو برداشت نہیں کرتے' سیاسی پارٹیوں پر پابندی ہے- ذرائع ابلاغ مکمل کنٹرول میں ہیں- وسط ایشیا کے دوسرے علاقوں سے منگوائے گئے محافظوں کے ذریعے اپنے سیاسی مخالفین کو اغوا تک کرا لیتے ہیں-1991ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگانے کے بعد انہوں نے پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی قائم کی- اس پارٹی کا ڈھانچہ اور کیفیت بعینہ ازبک کمیونسٹ پارٹی سے مماثل ہے- انتخابات میں وہ اپنے مقابلے میں صرف ایک اور امیدوار کو کھڑا ہونے کی اجازت دیتے ہیں- تاہم یا تو وہ کریموف کے وفاداروں میں سے ہی کوئی ہوتا ہے یا اُسے میڈیا پر اپنی رائے کے اظہار کی اجازت ہی نہیں ملتی-250 اراکین پارلیمنٹ (اولی مجلس) مقامی نوکر شاہی یا ریاستی اداروں کی جانب سے نامزدگی کے محتاج ہوتے ہیں- کریموف کی پالیسیوں کی منظوری دینے کے لئے سال بھر میں اس کے چند ہی اجلاس ہوتے ہیں- مارچ1995ء میں کریموف نے ریفرنڈم کے ذریعے اپنی صدارت کی مدت میں2000ء تک توسیع کر لی تھی- اس کے بعد ری الیکشن کے ذریعے ان کی صدارت میں مزید توسیع ہوگئی-

درشت مزاج' بے کشش اور انتہائی آمرانہ مزاج کے مالک کریموف کے والد ازبک اور والدہ تاجک تھیں- لیکن وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے- ترکمان صدر نیازدف کی طرح ان کی پرورش بھی ایک ریاستی یتیم خانے میں ہوئی- پارٹی میں نئے افراد کی فراہمی کے لحاظ سے یتیم خانے' سوویتوں کی انتہائی پسندیدہ جگہ تھے- بعد ازاں انہوں نے مکینکل انجینئر کی تربیت حاصل کی- دوسرے تمام وسط ایشیائی لیڈروں کی طرح کریموف بھی حالیہ برسوں میں آہستہ آہستہ عوامی اور سیاسی سرگرمیوں سے کٹ کر رہ گئے ہیں- کرپٹ لوگوں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے- مشکلات کی حقیقی وجوہات نہ سمجھنے کی بنا پر وہ اپنے ملک کے شدید مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ناکام ہو رہے ہیں-

دوسرے وسط ایشیائی رہنماؤں کے برعکس انہوں نے معاشی ری سٹرکچرنگ اور بین

الاقوامی اقتصادی برادری سے ممکنہ میل ملاپ کے لئے پہلے دن سے ہی معاشی اصلاحات اور پرائیویٹائزیشن کے خلاف مزاحمانہ رویہ رکھا ہے۔ چنانچہ ازبکستان کو آزادی کے بعد سے ہی شدید معاشی بحران کا سامنا ہے۔1992ء میں خوراک کے شدید بحران کی بدولت' ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنہیں بالآخر فوجی طاقت کے ذریعے دبایا گیا۔ 1994ء میں جب ازبکستان کو اپنی کرنسی ازبک سوم کا اجراء کرنا پڑا۔ (یہ کرغیز سوم سے مختلف ہے۔) تو افراطِ زر1500% تک پہنچ گیا۔ (95-1991ء کے درمیان افراط زر کی سالانہ شرح 465% تھی) لیکن کریموف ازبک کرنسی کے استحکام اور اس کی اصطلاح کے لئے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے دباؤ کی مسلسل مزاحمت کر رہے ہیں۔ اپریل2001ء میں آئی ایم ایف نے حکومت کی ناکافی اصلاحات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے تاشقند میں اپنا دفتر بند کر دیا۔ غربت اور بے روزگاری کی بلند سطح ــــ وادی فرغانہ میں80% تک بلند ــــ حکمرانوں کا زبردست دردِ سر بن گئی ہے۔لیکن وہ ان مسائل کے حل کے لئے کچھ بھی کرتے نظر نہیں آتے۔ 4 لاکھ افراد ہر سال روزگار کی تلاش میں بھٹکنے آ نکلتے ہیں۔ اس وقت25 سال سے کم عمر کے افراد آبادی کا60% ہیں۔ یہ نوجوان لوگ بے روزگار' غیر مطمئن اور بھوک کے مارے ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ازبک پلاننگ ایجنسی کے اندازے کے مطابق2015ء میں آبادی 36 ملین تک پہنچ جائے گی۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔ بین الاقوامی سرمایہ کار اس کی جغرافیائی اہمیت' بے پناہ قدرتی وسائل اور ہنرمند افرادی قوت سے پوری طرح واقف ہیں مگر معاشی اصلاحات سے ازبک حکومت کا مسلسل انکار' ان کی راہ میں اہم رکاوٹ ہے۔ آئی ایم ایف نے اپنے مقامی دفاتر بند کرنے سے پہلے1995ء میں ورلڈ بینک کے ساتھ دو سال تک ازبک حکومت سے کئے گئے قرضوں کے معاہدے معطل کر دیئے تھے تاکہ حکومت کو معاشی اصلاحات پر مجبور کیا جا سکے۔ بین الاقوامی نگرانی کی غیر موجودگی میں کرپشن' بے جا نوازشات اور تجارتی غیر مستعدی میں شدید اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود بھی غیر ملکی سرمایہ کاری مکمل بند نہیں ہوئی۔ ترکی نے چار سو مشترکہ منصوبوں میں ہزاروں ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ امریکہ کان کنی اور توانائی کے شعبے میں اس کا ایک بڑا شریک کار ہے۔ جنوبی کوریا اور جرمنی کی کئی کمپنیاں آٹو موبائل کی پیداوار میں مصروف ہیں۔ یہ تمام معاہدے براہِ راست صدر کریموف کے ساتھ صدارتی دفتر ہی میں طے پائے

ہیں کیونکہ غیر ملکی سرمایہ کاری کو منضبط کرنے کے لیے کوئی منظّم ریاستی محکمہ موجود ہی نہیں۔

ابتداء میں امریکہ کریموف کے انسانی حقوق کی پامالی سے متعلق ریکارڈ کی بنا پر ان کا شدید مخالف تھا مگر1996ء سے اس نے اس پہلو کو نظر انداز کر کے علاقے میں اپنی سرمایہ کاری خاصی بڑھا دی ہے۔ اس کی وجوہ میں افغانستان کے متعلق اس کی تشویش' ایران کو تنہا کرنا اور وسط ایشیا میں روسی اثر ونفوذ کے اضافے کا خوف شامل ہیں۔1997ء میں امریکی کان کن کمپنیوں نے ازبکستان میں بے پناہ سرمایہ کاری کی۔ ازبک امریکی تجارت1996ء کی 50 ملین ڈالر مالیت سے بڑھ کر 420 ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ جواباً ازبک حکومت نے بھی روس سے تعلقات میں مناسب فاصلہ قائم رکھا۔ تاہم روس سے متعلق پالیسی حقائق پر استوار ہونے کے بجائے محض کریموف کے ذاتی موڈ پر منحصر ہے۔ ازبکستان پہلا وسط ایشیائی ملک تھا جس نے نیٹو کے امن فوج پروگرام میں شمولیت اختیار کی۔ بعد میں کرغیزستان اور قازقستان بھی اس میں شامل ہو گئے۔1998ء سے ازبک فوجی دستے امریکی اور نیٹو افواج کے ساتھ مشترکہ مشقیں کر رہے ہیں۔ تاہم2000ء کے موسم بہار میں روس اور ازبکستان نے فوجی تعاون کے ایک خفیہ معاہدے پر دستخط کیے۔ (جسے کریموف نے موسم خزاں میں مسترد کر دیا) کریموف ازبکستان میں رہائش پذیر روسیوں کو دوہری شہریت دینے سے بھی انکاری ہیں' حالانکہ ترکمانستان نے ان کی دوہری شہریت کا حق تسلیم کر لیا تھا۔

کریموف کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کی وجہ سے' جن میں نوکر شاہی کا مشورہ عموماً شامل نہیں ہوتا' ازبک اشرافیہ اپنے مستقبل کے بارے میں خاصی متفکر ہے۔ ''ہمارے حکمران حقائق کا سامنا نہیں کر سکتے۔ وہ درپیش مسائل کی وجہ سے بری طرح مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔'' یہ بات مجھے ایک ازبک افسر نے تاشقند میں بتائی۔ اس کا کہنا تھا۔ ''ہمیں قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ بدلتی ہوئی خارجہ یا داخلی پالیسی میں' آج یا کل' صدر ہمیں کس قسم کے احکامات دینے والے ہیں۔ کل کے دشمن آج کے دوست ہیں۔ کسی مشورے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہم سے پوچھا ہی نہیں جاتا۔ پالیسی بغیر کسی وجہ یا دلیل کے تبدیل ہو جاتی ہے۔'' نوکر شاہی کی جانب سے یہ برملا اعتراف انتہائی حیران کن ہے کیونکہ پچھلے دس سال میں' تنہائی میں بھی' کسی نے صدارتی ناکامیوں کے بارے میں لب کشائی نہیں کی تھی۔ کریموف کی پالیسیوں نے ہمسایہ ریاستوں کو بجا طور پر پریشان کر رکھا ہے۔ کریموف وسط ایشیا میں ازبکستان کے

اہم کردار کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ کرغیزستان اور تاجکستان جیسی چھوٹی مگر فوجی طاقتیں اس کی حمایت کر کے قازقستان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھیں۔ کریموف نہیں چاہتے کہ مغربی آئل کمپنیاں قازقستان میں زیادہ سرمایہ کاری کریں۔ ازبکستان بسا اوقات قازقستان کرغیزستان اور تاجکستان کی گیس سپلائی روک لیتا ہے تاکہ ان پر اپنا دباؤ قائم رکھ سکے۔ حالانکہ 2000ء میں ازبکستان نے ہمسایہ ملکوں کو 1.9 ٹریلین گیس برآمد کر کے 310 ملین ڈالر کا زرمبادلہ کمایا ہے۔ ازبکستان کی جارحانہ خارجہ پالیسی کے تحت تاجک خانہ جنگی کے دوران تاجکستان کو بھرپور فوجی مدد دی گئی اور شمالی افغانستان میں طالبان کی پیش قدمی روکنے کے لیے افغان ازبکوں کی مزاحمت کا بھرپور ساتھ دیا گیا۔ لیکن اس طرح کی پالیسیاں عموماً ناکام ہی رہی ہیں۔ تاجکستان میں صدر رحمانوف نے 1997ء میں اسلام پسندوں کے ساتھ متحدہ محاذ تشکیل دے لیا۔ کریموف کو یہ صورت حال بہت ناگوار لگی۔ ادھر طالبان نے افغان ازبک رہنما جنرل دوستم کو شکست دے دی۔ تاہم کریموف روس اور امریکہ دونوں کو ہی اپنی علاقائی اہمیت کے متعلق قائل کرنے میں کامیاب رہے۔ اب دونوں ممالک ان کی مدد کر کے ان کے لائحہ عمل پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں ہیں۔ ادھر وسط ایشیائی ممالک کے دوسرے رہنما ان کے ارادوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

کریموف کے حقیقی مسائل دراصل داخلی نوعیت کے ہیں۔ گمبھیر معاشی صورت حال کے علاوہ کریموف کو اپنے آمرانہ طرز عمل کی وجہ سے شدید سیاسی مخالفت کا سامنا ہے۔ آزادی کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے اس علاقے میں ازبکستان کی مخالف سیاسی پارٹیاں انتہائی مضبوط اور منضبط تھیں۔ برلک (اتحاد) سب سے مقبول پارٹی تھی جس کے سیاسی جلوسوں میں پولیس کے وسیع دباؤ کے باوجود ہزارہا لوگ شریک ہوتے تھے۔ (میں نے خود ایسے جلوس تاشقند میں بارہا دیکھے)۔ 1988ء میں ازبک دانش وروں نے یہ جمہوری قوم پرست پارٹی قائم کی تھی۔ بہت سے قومی ایشوز پر یہ حکومت کی شدید مخالف تھی۔ روس کی مخالفت اس کا دوسرا اہم پہلو تھا۔ اپریل 1990ء میں ارک (آزادی) نامی ایک گروہ نے شاعر صالح مدامینوف کی قیادت میں پارٹی بنا لی۔ ارک پارٹی حکمرانوں کے لیے نسبتاً نرم گوشہ رکھتی تھی چنانچہ صالح کو دسمبر 1991ء کے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جبکہ برلک پارٹی کے ابو رحیم پولاٹ کو انتخاب لڑنے نہیں دیا گیا۔ لیکن 1992 میں کریموف نے

دونوں پارٹیوں پر پابندی لگا دی اور ان کے لیڈروں کو جبراً جلا وطن کر دیا۔ بعدازاں دونوں پارٹیوں نے انسانی حقوق کے گروپ تشکیل دے لیے۔ برلک ہیومن رائٹس سوسائٹی اور ارک انڈپنڈنٹ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن چلا رہی ہے۔1992ء میں جمہوری اپوزیشن کو کچل دینے کے بعد' کریموف نے فرغانہ وادی میں مرتکز مسلم بنیاد پرستوں کو نشانہ بنا لیا۔ 1992 - 93ء کے مسلسل کریک ڈاؤن میں اور1997ء کے بعد' سینکڑوں عام دیندار لوگوں کو' مسلم بنیاد پرستی اور وہابی خیالات کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی مساجد اور مدارس کو بند کر دیا گیا۔ مولویوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا یا زبردستی جلاوطن کر دیا گیا۔ سودیت دور میں قائم ہونے والی جماعت احیائے اسلام...... جس کی وسط ایشیا کے ہر ملک میں علیحدہ اور آزاد برانچ تھی- ازبکستان میں قانونی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کبھی رجسٹر نہیں ہو سکی۔ 1998ء میں حکومت نے آزادی ضمیر اور مذہبی تنظیموں کا بدنام زمانہ قانون پاس کیا' جس کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف ظلم و جبر کے نت نئے طریقے اختیار کیے گئے۔ (دوسری مذہبی جماعتوں پر یہ قانون غیر موثر تھا)۔ 16 فروری1999ء کو نامعلوم ازبک انتہا پسندوں کے ہاتھوں' کریموف کو ختم کر ڈالنے کی کوشش کے بعد...... جس میں تاشقند میں چھ زبردست کار بم دھماکے کئے گئے جس سے تیراہ افراد ہلاک اور سو زخمی ہوئے...... کریموف نے وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ پولیس نے کئی ہزار افراد کو گرفتار کر لیا۔ حکومت نے ارک اور اسلامی انقلاب پسندوں' دونوں کو ہی' ان دھماکوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

ان جابرانہ پالیسیوں کے نتیجے میں' کریموف کے سر پر سوار اسلامی انتہا پسندوں کا خوف ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے۔ ازبک مسلم تحریک' وسط ایشیا میں کام کرنے والی سب سے مضبوط اسلامی انقلابی جماعت ہے جس کی کارروائیاں وادی فرغانہ میں' ازبکستان' تاجکستان اور کرغیزستان میں' ہر جگہ مسلسل جاری ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے' مذہبی اور سیاسی اظہار رائے کے حق کا' کریموف کے ہاتھوں استرداد اور ان کا انتہا پسندانہ رویہ ازبک تحریک کی تقویت اور عروج کا باعث بنا ہے۔ وسط ایشیا میں تحریک کا اثر و نفوذ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیڈر جمعہ نعمان غنی نے افغانستان میں طالبان اور اسامہ بن لادن سے بھی تعلقات استوار کر لیے ہیں تا کہ انقلاب پسندوں کو نہ صرف تقویت بلکہ وسعت بھی دی جا سکے۔

ہمہ مقتدر ہونے کے شوق میں' کریموف نے ازبکستان کی علاقائی اشرافیہ میں بھی اپنے

دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ طاقت کے ارتکاز نے روایتی توازن اقتدار کو درہم برہم کر دیا ہے۔ ملازمتوں کی فراہمی' عمومی سر پرستی' اور علاقائی اثر ونفوذ' جس کے وہ ہمیشہ سے عادی ہیں' ان کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ تاشقند میں بہت سے ازبکوں کے خیال میں یہ دھماکے مسلمان انقلابیوں نے نہیں بلکہ حکمران ٹولے نے کریموف سے جان چھڑانے کے لیے خود ہی' یہ دھماکے کرائے تھے۔ جنوری 2000ء میں کریموف 92% ووٹوں کے ساتھ' صدارتی انتخاب جیت گئے۔ ان کے مقابل امیدوار' عبدالحفیظ جلالوف نے برملا یہ کہا کہ ''ملک کی سلامتی' امن' قومی آزادی اور ترقی کی خاطر' انہوں نے اپنا ووٹ بھی کریموف کو دیا تھا۔'' جلالوف کے اس بے محل اعتراف نے کریموف کے مینڈیٹ کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی۔ غیر ملکی مبصرین کے مطابق یہ انتخاب محض مزاحیہ ڈرامہ تھا۔ سیاسی اقتدار قائم رکھنے اور امن وامان بحال رکھنے کے لیے' حکمرانوں نے عوامی جمود کے علاوہ جابرانہ قوانین اور ریاستی تحفظ کے ذمہ دار محکموں کی بے مہا باطاقت پر زیادہ انحصار کیا ہے۔ ''معاشی اور سیاسی بحران کو آمرانہ رویوں کے ذریعے ممکنہ حد تک روکا ضرور گیا ہے مگر اسے ختم نہیں کیا جا سکا۔'' بین الاقوامی بحران گروپ کی 2001ء کی رپورٹ میں یہ رائے دی گئی ہے۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ ازبکستان پہلے ہی بحرانوں کی لپیٹ میں ہے۔ وسط ایشیا میں اسلامی مزاحمت اور انتہا پسندی کا مرکز' ازبکستان بن چکا ہے اور علاقے میں پھیلتے ہوئے عدم استحکام کے گنبد کی سب سے کمزور کڑی بھی یہی ہے' آمریت کے تسلسل نے لوگوں کو سرکش بنا دیا ہے۔ اگرچہ دانش وروں کے خیال میں زیادہ جمہوری حکومت کے لیے پر امن راستہ ممکن ہے مگر اسلامی انقلاب پسندوں کے علاوہ' عام لوگ بھی کریموف کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔

تاجکستان: ایک گم شدہ موقع

کسی بھی وسط ایشیائی ملک کی نسبت تاجکستان...... کیا ہوسکتا ہے اور کیا ہونا چاہیے...... دونوں اعتبار سے ایک حقیقی ماڈل ہے۔ آزادی کے فوراً بعد' تباہ کن خانہ جنگی (1992-97) کا شکار تاجکستان جھلستی آگ سے نکل کر' ایک جمہوری منتخب کولیشن حکومت کی شکل میں ابھرا۔ اس حکومت نے مذہبی اور غیر مذہبی' دونوں عناصر میں موافقت پیدا کی۔ بعض مبصرین اس حکومت کو داخلی سلامتی اور بین الاقوامی مواقع کی فراہمی کے حوالے سے مثالی قرار دیتے

ہیں۔ آج کل، بہرحال، جوں جوں معاشی بحران بڑھتا جا رہا ہے، انقلابی انتہا پسند اس سر زمین کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور ازبک صدر کریموف بھی، خاصی بڑی ازبک اقلیت کی ذریعے سیاسی بے چینی پیدا کر کے کبھی امداد کی پیش کش کرتے ہیں اور کبھی اسے روک لیتے ہیں۔ اس وقت تاجکستان کی صورت حال خطرے کی گھنٹی کی طرح ہے کہ غربت، ظلم و جور اور افغانستان کی جانب سے منشیات کی بڑھتی ہوئی تجارت کس طرح بہترین توقعات پر بھی پانی پھیر سکتی ہے۔

تاجکستان کی آبادی بمشکل 5.2 ملین ہے۔ جن میں 60% تاجک جبکہ 23% ازبک ہیں۔ ایک ملین تاجک ازبکستان میں اور تقریباً دو لاکھ تاجک چینی صوبے زن جیانگ میں رہتے ہیں۔ افغانستان میں بھی 4.5 ملین تاجک آباد ہیں اور یہ سبھی طالبان کے شدید مخالف ہیں۔ طالبان مخالف مزاحمت کے رہنما احمد شاہ مسعود، جنہیں نومبر 2001ء کو قتل کر دیا گیا، بھی کابل کے شمال میں واقع پنج شیر وادی کے تاجک تھے۔ تاجکستان اور افغانستان کی مشترکہ سرحد 650 میل لمبی ہے۔ شمالی پاکستان کی جانب سے تاجک سرحد...... واخان کے افغان کوریڈور کی وجہ سے...... صرف چھ میل دور ہے۔ انیسویں صدی میں روس اور برطانیہ نے ایک معاہدے کے ذریعے افغانستان کو یہ پتلی سی کوریڈور (چھ میل چوڑی) اس لیے دی تھی تاکہ ان دونوں ممالک کا براہ راست سرحدی آمنا سامنا نہ ہو۔ چین کے صوبے زن جیانگ سے بھی تاجکستان کی 265 میل طویل سرحد ملتی ہے۔ تاجکستان کے مشرقی صوبے گورنو بدخشاں کے 30% علاقے پر...... جہاں سونے اور دوسری معدنیات کے بے پناہ ذخائر ہیں...... چین کا دعویٰ بھی ہے۔ یہ سرحدی تنازعہ پچھلے عشرے سے ابھی تک طے نہیں پا سکا۔

پامیر کی پہاڑیوں نے تاجکستان کا 93% رقبہ گھیر رکھا ہے چنانچہ ذرائع رسل و رسائل، صنعت اور زراعت کے مواقع زیادہ وسیع نہیں۔ اپنی ارضی مشکلات کے باوجود (تجارت اور کشورکشائی کے اہم راستوں کی وجہ سے) یہ علاقہ ہمیشہ تہذیب و تمدن کی دولت سے مالا مال رہا ہے- شاہراہ ریشم یہیں سے گزرتی ہے۔ قدیم ایرانی سلطنت کے وارث ہونے کے باعث تاجک ثقافتی اور لسانی طور پر فارسی ہیں۔ صدیوں تک وسطِ ایشیا کے شہروں کی تجارت اور کاروبار پر ان کا غلبہ رہا۔ یہ لوگ فارسی اور مقامی ترکی زبان، دونوں ہی، بولتے تھے۔ بادشاہتیں آتی جاتی رہیں مگر یہ لوگ ازبکوں اور دوسرے ترکی النسل گروہوں کے ساتھ امن و

آشتی سے رہتے رہے۔ روسیوں نے ان قدیم تہذیبوں کے سلسلے میں خاصی تحقیق وجستجو کی' لیکن تاجکوں کو ان سے لاعلم رکھنے کی کوشش کرتے رہے تاکہ وہ اپنی نسلی تاریخ سے ناواقف رہیں۔ ان تہذیبوں کے آثار اب دوشنبہ کے نوتعمیر شدہ میوزیم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری صدی کی کشان سلطنت کے مہاتمابدھ کے شہکار مجسمے انتہائی اثر انگیز ہیں۔ سب سے مشہور مجسمہ سوئے ہوئے مہاتمابدھ کا ہے' چالیس فٹ طویل یہ مجسمہ وسط ایشیاء میں ان کا سب سے بڑا مجسمہ ہے۔ (بامیان میں موجود' حالت قیام میں بدھ کے مجسمے اس سے بھی بڑے تھے لیکن طالبان نے انہیں 2001 میں تباہ کر دیا تھا)۔

انیسویں صدی میں' وسط ایشیا کا آخری علاقہ تاجکستان بھی روسی صوبے ترکستان کا ایک حصہ بن گیا۔ تاہم افغانستان اور تاجکستان کی سرحدیں اسی طرح کھلی رہیں۔ قبائلی سردار اور مذہبی پیشوا عام طور پر ایک دوسرے کے علاقے میں پناہ لیتے رہتے تھے' جبکہ وسط ایشیائی خان افغانوں کو اپنے محلات کے محافظ کے طور پر بھرتی کیا کرتے تھے۔ بعدازاں تاجکستان بسماچی باغیوں کا اہم مرکز بن گیا۔ یہ مسلمان باغی بھی افغانستان میں ہی پناہ حاصل کرتے تھے۔ ستمبر 2001ء تک احمد شاہ مسعود کی زیر قیادت جاری رہنے والی موجودہ مزاحمت کا رسدی مرکز بھی تاجکستان میں تھا' جہاں روس' ایران اور بھارت انہیں اسلحہ فراہم کرتے تھے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان وادیاں مختلف دیہاتوں اور آبادیوں کو جدا جدا کئے ہوئے ہیں' اس وجہ سے بھی تاجکستان میں قبائلی اور علاقائی دشمنیاں موجود تھیں۔ سٹالن نے ان رقابتوں اور تلخیوں کو اور زیادہ بڑھایا۔ نسلی اور جغرافیائی بنیادوں کو مکمل نظر انداز کر کے' نئی ریاستوں کی تشکیل کے ذریعے' سٹالن نے 1920ء میں وسط ایشیا کے دو سب سے بڑے نسلی گروہوں ازبکوں اور تاجکوں کے درمیان تفریق پیدا کر دی' جس کا زیادہ نقصان تاجکوں کو ہوا۔ تاجک ثقافت کے مراکز بخارا اور تاشقند ازبکستان کو دے دئے گئے اور پیچیدہ پہاڑی علاقوں پر مشتمل تاجکستان کے لیے غیر پیداواری پہاڑ...... پامیر...... اور معمولی زرعی زمین باقی بچی۔ بڑی شہری آبادی تو تھی نہیں۔ 1925ء میں تاجکستان کا دارالحکومت دوشنبہ صرف چھ ہزار افراد کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر سوموار (دوشنبہ) کو دیہاتی منڈی لگا کرتی تھی۔ ماسکو کی بے نیازی کی بدولت تاجکستان میں فی کس آمدنی انتہائی کم تھی۔ بے روزگاری اور شرح پیدائش سب سے زیادہ تھی۔ چند ایک صنعتیں تھیں۔ 1979ء اور 1989ء کے درمیان' آبادی

کی تعداد میں 34% (دنیا میں سب سے زیادہ شرح افزائش) اضافہ ہوا۔

کئی اور پیچیدگیاں بھی تاجکستان کی نسلی مشکلات میں اضافہ کا موجب تھیں۔ ازبکوں اور تاجکوں پر مشتمل دس لاکھ آبادی کا شہر خوبند (سابقہ لینن آباد) صنعتی مرکز بننے کے بعد، تاجک کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے لیے ریکروٹنگ بیس بھی بن گیا تو ملک کے مرکز میں واقع وادیاں نظر انداز ہونے لگیں۔ غیر تاجک ایرانی نسل اور آغا خانی اسمعیلیوں کی آبادیوں کا مرکز گورنو بدخشاں کا صوبہ، بدستور شدید غربت کا شکار رہا۔ نتیجتاً ازبکوں اور تاجکوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ مختلف تاجک قبائل اور اہل پامیر کے مابین بھی رقابتیں سر اٹھانے لگیں۔ یہ شدید بحران بعد میں خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گیا۔ جنوب مشرقی قلاب کے تاجک قبائل کے خوبند کے سابقہ کمیونسٹوں سے گہرے تعلقات تھے۔ یہی وجہ کرگاں طیب کے قبائل سے ان کی سخت دشمنی کا باعث بن گئی کیونکہ کرگان طیب قبائل اسلامی انقلابیوں کے زبردست حامی تھے۔ ان میں سے کچھ قبائل کا تعلق گارم سے تھا اور کمیونسٹوں نے انہیں کپاس کے کھیتوں میں کام کرانے کی خاطر، زبردستی جنوب میں لا کر آباد کر دیا تھا۔ تاجک کمیونسٹ پارٹی میں اہل خوبند اور روسی نسل کے آبادکاروں کی اکثریت تھی۔ اس اختلاف نسل، علاقائیت اور قبیلہ پرستی نے، غربت کے ساتھ مجتمع ہو کر، خانہ جنگی کے امکانات کو یقینی بنا دیا۔ 1991ء میں آزادی کے وقت، تاجکستان میں قومیت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ آزادی کے ہاتھوں تاجکستان کو روسی سب سڈی، خوراک اور امداد سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس نقصان سے شدید بحران پیدا ہوگیا اور دوشنبہ میں ہنگامے شروع ہوگئے۔ 92-1990ء کے دوران تاجکستان میں قیادت تین دفعہ تبدیل ہوئی۔ دوسری وسط ایشیائی ریاستوں میں، ان کے رہنماؤں کی قبل از آزادی طاقت بعد میں بھی قائم رہی لیکن اس کے مقابلے میں تاجکستان میں ہونے والی تبدیلیاں سیاسی عدم استحکام اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کی کمزوری کی علامت ہیں۔ تاجک پارٹی کے آخری فرسٹ سیکرٹری اور ملک کے پہلے صدر رحمان نبی یوف کو، کئی ہفتوں کے شدید ہنگاموں اور احتجاج کے نتیجے میں ستمبر 1992ء میں استعفیٰ دینا پڑا۔ ان ہنگاموں میں، دوشنبہ کی سڑکوں پر کوئی دو سو افراد مارے گئے۔ سودیت فوج نے آ کر ہنگاموں پر قابو پایا مگر وہ بھی رحمان نبی یوف کو دوبارہ اقتدار نہیں دلا سکی۔ فی الحال نبی یوف، وسط ایشیا کے واحد رہنما ہیں جنھوں نے عوامی احتجاج کے نتیجے میں اقتدار چھوڑ دیا۔ روسی

عدم تحفظ کی وجہ سے 1992ء میں دو لاکھ روسی تاجکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

کمیونسٹوں اور بنی یوف کے مخالف سیاسی گروہوں نے اسلام پسندوں کی زیر قیادات نئی جماعت، جماعت احیائے اسلام تشکیل دے لی۔ یہ مقبول اپوزیشن، وسط ایشیا میں اسلامی بنیاد پرستی کا پہلا عوامی اظہار تھا۔ دریں اثنا، خوہند اور گورنو بدخشاں کی طاقتور قبائلی جماعتوں نے تاجکستان سے علیحدگی اور اپنی نئی ریاست تشکیل دینے کی دھمکی دے دی۔ بنی یوف کی رخصتی کے بعد تاجکستان افراتفری کے دور میں داخل ہوگیا۔ جماعت احیائے اسلام اور دوسرے جمہوری اور قوم پرست گروہوں نے اکٹھے ہو کر، مخلوط حکومت قائم کر لی لیکن یہ امن و امان بحال کرنے میں ناکام ہوگئی۔1992ء میں خوہند اور قلاب کی جدید کمیونسٹ افواج نے شدید خون ریزی کے بعد، اس حکومت کا تختہ الٹ دیا اور دوشنبہ میں ایموما لی رحمانوف کو صدر بنا دیا۔ جماعت احیائے اسلام کے اپنے مضبوط مراکز کرگان طیب، گورنو بدخشاں اور وادی کراتیجن کی جانب پسپائی کے ساتھ، زبردست خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اگلے پانچ سالوں میں پچاس ہزار (ممکن ہے ایک لاکھ ہوں) افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ تاجکستان کی کل آبادی 5 ملین ہے۔ ڈھائی لاکھ افراد نے افغانستان میں پناہ لی یا پاکستان، ایران اور دوسری روسی آزاد ریاستوں میں چلے گئے اور پانچ لاکھ افراد بے گھر ہوگئے۔

جماعت احیائے اسلام نے دوسری قوم پرست پارٹیوں کے ساتھ مل کر، متحدہ تاجک اپوزیشن کے نام سے ایک وسیع البنیاد اتحاد بنا لیا جس کے مراکز پامیر کے پہاڑوں اور افغانستان میں تھے۔ یہیں سے اس جماعت نے حکومت کے خلاف اپنی گوریلا سرگرمیاں جاری رکھیں۔ احمد شاہ مسعود نے ...... جو افغانستان میں سودیت افواج سے ٹکرا چکے تھے...... اس اتحاد کے شمالی افغانستان پہنچنے پر، اس کی بھرپور مدد کی۔

دریں اثناء، غیر منظم حکومتی ملیشیا، قبائلی جنگی سرداروں کی زیر سرپرستی، دیہاتوں میں لوٹ مار اور عام انسانوں کے خون سے ہاتھ دھوتی رہی۔ آٹھ ہزار روسی سرحدی محافظ دستے افغان تاجک سرحد پر اسلحہ اور منشیات کی ترسیل کو چیک کر کے، داخلی طور پر حکومت کی معاونت ضرور کرتے رہے مگر انہوں نے کسی بھی بڑی لڑائی میں حصہ لینے سے اجتناب کیا۔ تنازعے کے

پھیلاؤ کے خوف سے، دوسری وسط ایشیائی ریاستوں نے بھی کچھ دستے روسی فوجوں کی مدد کے لیے بھیجے۔ دوشنبہ قتل و غارت اور بمباری کا شکار ہوا تو غیر ملکی سفارت کار یہاں سے رفو چکر ہوگئے۔ معیشت کا تختہ ہوگیا اشیائے خوراک کی پیداوار تک رک گئی۔ حکومت نے روسی امداد، ہتھیاروں، غذائی اشیاء اور ایندھن کی ادائیگی کے لیے مجبوراً صنعتی اثاثوں تک کو روس کے پاس گروی رکھ دیا۔

روس، ایران اور وسط ایشیائی ریاستوں نے حکومت اور متحدہ اپوزیشن کے مابین امن مذاکرات کے لیے اقوام متحدہ کی کوششوں کی بھرپور حمایت کی۔ پہلی دفعہ یہ مذاکرات اپریل 1994ء میں ماسکو میں ہوئے۔ یہ مذاکرات تین سال تک گھسیٹے گئے اور اس دوران شدید جنگ بھی ہوتی رہی۔ بالآخر فروری 1997ء میں، یہ مذاکرات، ایران میں، نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور رحمانوف اور اپوزیشن رہنما عبداللہ نوری قومی مصالحتی کمیٹی کی تشکیل اور اپنے اپنے مسلح دستوں کو مجتمع کر کے، ایک نئی اور قومی فوج کی شکل دینے پر متفق ہوگئے۔ حکومت نے عام معافی اور تمام اپوزیشن پارٹیوں کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جون میں، ماسکو میں اس معاہدے پر دستخط ہوئے اور نوری سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ نومبر میں دوشنبہ واپس آئے۔ تاہم جنگ پھر بھی جاری رہی کیونکہ معاہدے سے باہر رہ جانے والے قبائلی جنگجو سرداروں نے اپنے گوریلا حملے ختم نہیں کیے۔ معاہدے پر حتمی عمل درآمد بہرحال فروری 1998ء میں ہوا۔ جب پارلیمانی انتخابات منعقد ہوئے اور اس میں مختلف سیاسی پارٹیوں بشمول جماعت احیائے اسلام نے بھی حصہ لیا۔ رحمانوف کی عوامی جمہوری پارٹی 64.5% ووٹ لے کر یہ الیکشن جیت گئی۔

دونوں نے دباؤ کے تحت یا مجبوراً ہی یہ معاہدہ کیا تھا۔ باغی احیائے اسلام والے مذاکرات کے طویل عمل کے دوران، مزاحمت کے حلقے کو پھیلاتے رہے۔ ادھر روس اور وسط ایشیائی ممالک کے شدید دباؤ کے تحت اور افغانستان کے طالبان کا ایک نیا خطرہ سامنے آنے کی وجہ سے رحمانوف کو معاہدے کو تسلیم کرنا پڑا۔ 1996ء میں طالبان نے کابل پر قبضہ

کر لیا تھا اور اب افغان ازبکوں تاجکوں اور ہزارہ قبائل کے زیر قبضہ شمالی افغانستان کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ طالبان کو روکنا اور طالبان مخالف طاقتوں کا...... افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں کے درمیان...... ایک بفر زون قائم رکھنا' روس اور وسط ایشیائی رہنماؤں کے لیے وسیع تر تحفظ وسلامتی کا اہم ایشو بن گیا۔ رحمانوف نے احمد شاہ مسعود کو قلاب کا ہوائی اڈہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ طالبان مخالف مزاحمت کے لیے انہیں یہیں سے فوجی ساز وسامان مہیا کیا جاتا تھا۔

تاہم' تاجکستان کا امن معاہدہ اپنی جگہ انتہائی اہم پیش رفت ہے۔ وسط ایشیاء کے جدید کمیونسٹوں کو پہلی دفعہ نہ صرف مخالف سیاسی گروہوں بلکہ مقامی اسلامی قوتوں کے ساتھ شراکت اقتدار پر مجبور ہونا پڑا۔ تاجکستان کا معاہدہ' ایک ماڈل کے طور پر وسط ایشیائی ممالک کے لیے اس وقت انتہائی اہمیت اختیار کر گیا' جب1999ء اور2000ء میں ازبک اسلامی تحریک نے ازبک حکمران ٹولے کا تختہ الٹنے کی کوشش میں' وادی فرغانہ پر حملہ کیا۔

چار سالہ قتل وغارت' سماجی اور شہری بے چینی' انسانی بنیادوں پر امداد کی کمی' تعمیر نو کی راہ میں اہم رکاوٹ یعنی غربت کی چکی کے باوجود'1997ء کا امن معاہدہ برقرار ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ ہے کہ وسط ایشیا کے ممالک میں سب سے زیادہ خسارے میں تاجکستان ہی رہا ہے۔ معیشت تباہ ہو چکی ہے حکومت کا اپنے وسیع وعریض علاقوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ یورپ روانگی کے لیۓ افغانستان سے منشیات کی سمگلنگ' ملکی عدم استحکام کی ایک اہم وجہ بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک نے تعمیر نو کے لیے کئی چھوٹے چھوٹے قرضے دیئے ہیں اور آغا خان فاؤنڈیشن نے بھی گورنو بدخشاں کے علاقے میں انتہائی موثر ترقیاتی پروگرام شروع کئے ہوئے ہیں' پھر بھی تاجکستان کو بہت کم بین الاقوامی اقتصادی تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ مخلوط حکومت کی کامیابی اور وسط ایشیا کے لیے سیاسی اختلاط کا بہترین نمونہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے بھرپور تعاون فراہم کیا جائے۔ کئی اعتبار سے تاجکستان وسط ایشیا میں امن اور استحکام کی حقیقی کنجی ہے...... یہی وہ بات ہے جسے بین الاقوامی برادری جتنی جلدی سمجھ جائے' اتنا ہی بہتر ہے۔

دوسرا حصہ

1991 سے وسط ایشیا میں

اسلامی تحریکیں

باب 5

جماعت احیائے اسلام اور تاجکستان میں خانہ جنگی

تاجکستان کی خونیں خانہ جنگی میں جس تعداد میں انسانی جانیں ضائع ہوئیں' آبادی کے تناسب کے اعتبار سے پچھلے پچاس سال میں ہونے والی کسی بھی خانہ جنگی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس خانہ جنگی کے نتیجے میں' مقامی اسلامی تحریک کے ہاتھوں' وسط ایشیا میں کامیاب سیاسی بغاوت کا پہلا تجربہ ہوا۔ وسط ایشیائی اسلامی گروہوں میں' بسماچیوں کے وارث اسلام پسند تاجک انتہائی ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ مقامی مسلمان فرقوں اور گروہوں کو باہم متحد کر کے' اس تحریک نے اپنے جواز کو ہر شک وشبہ سے بالا تر کر لیا ہے جبکہ وسط ایشیا کے دوسرے مسلمان انقلابی گروہوں مثلاً ازبک مسلم تحریک پر زیادہ تر سعودی عرب کے وہابی عقیدے اور طالبان کے دیوبندی مسلک کا گہرا اثر ہے۔ تاجک اسلام پسند سودیت دور میں روپوش ہو جانے والے ''غیر سرکاری'' عالموں سرکاری مذہبی پیشواؤں' پامیر کے پہاڑوں میں آباد صوفی پیروں اور ان کے پیروؤں' افغان جنگ سے متاثر نئی نسل اور سودیت یونین کے خاتمے کے بعد ابھرنے والے قوم پرستوں......غرض سب حلقوں کو...... اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔1991ء کے بعد تاجکستان میں تیز رفتار اسلامی احیاء کے جلو میں یہ سب گروپ مجتمع ہوگئے۔ اس لہر نے وسط ایشیا کے سارے حکمرانوں کو ہلا کر رکھ

دیا۔1990ء اور1992ء کے دوران' تاجکستان میں ایک ہزار نئی مساجد کا افتتاح کیا گیا......
روزانہ ایک نئی مسجد...... ان میں سے بہت سی گھروں' سکولوں اور دفتروں میں واقع تھیں۔
خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد' ان گروہوں کی حمایت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

اسلامی احیا کا تاجک قوم پرستی سے بھی گہرا تعلق تھا۔1920 ء میں بپا ہونے والی بسماچی بغاوت' جسے سودیت حکمرانوں نے انگریزی ریشہ دوانیوں سے جنم لینے والی مولویوں کی رجعت پسند تحریک قرار دیا تھا' ابھی تک تاجکوں کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ تاجکوں نے آزادی ملتے ہی قومی یکجہتی اور تشخص...... جن کا وجود ہی نہیں تھا...... کو بھرپور طریقے سے ابھارنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ازبکستان میں روس مخالف ازبک قوم پرستی سب سے بڑی سیاسی تحریک تھی جس سے آزادی سے پہلے عظیم ازبک قومی تشخص کو اجاگر کرنے میں مدد ملی مگر تاجکستان میں تاریخی قومی بنیادیں موجود ہی نہیں تھیں کیونکہ تاجک پورے وسط ایشیا میں منتشر تھے۔ اور انکا قبائلی کلچر' اجتماعی کاشت کاری کے ہاتھوں' تباہ ہو چکا تھا۔ درحقیقت' تاجکستان کی آبادی کا23% ازبکوں پر مشتمل ہے۔ شمالی اور جنوب مشرقی علاقوں میں انہی کا غلبہ ہے۔ تاہم ازبکوں نے ماضی میں تاجک کمیونسٹ پارٹی میں غیر متناسب شرح سے نمائندگی لی ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت سے تاجکوں نے اسلامی احیاء کو اپنا تشخص مستحکم کرنے اور تاجکستان کی ترقی کو یقینی بنانے کا واحد ذریعہ سمجھا۔

سودیت دور میں تاجکستان کی انتہائی غربت' کپاس کی جبری کاشت کی معیشت پر اس کا انحصار' بلند و بالا پامیر پہاڑوں کے درمیان وادی میں بکھرے ہوئے اکادکا دیہات...... جو وسطی علاقوں اور اپنے ہمسایوں سے مکمل طور پر کٹے رہتے تھے____ کا کٹھن جغرافیہ' یہ سب وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے تاجک کسی قومی تشخص کے بجائے' اپنے علاقوں اور قبائل کے زیادہ وفادار تھے۔ قومی تشخص کی کمی کی وجہ سے ہی خانہ جنگی کے سیاسی مقاصد' دونوں فریقوں میں ہی' انتہائی محدود نوعیت کے تھے۔ جنگجو قبائلی سردار اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے تھے اور ''نسلی صفائی'' یا ''یکتائی'' کے نام پر' ان مقبوضہ علاقوں میں قتل و غارت گری کرتے رہتے تھے۔ لیکن خانہ جنگی کے بعد' جب بہتر قومی تشخص اجاگر ہونے لگا تو اس نے واضح طور پر روسی مخالفت کے بجائے ازبک مخالف رخ اختیار کر لیا۔ ازبکستان کے صدر کریموف کی تاجکستان کے خلاف سخت پالیسیوں اور تاجک قوم پرستی کو دبانے کے فیصلوں کے نتیجے میں

ازبکستان کے خلاف تاجک مزاحمت کو مزید مہمیز ملی۔

جماعت احیائے اسلام کے مبداء

سودیت دور میں، کسی بھی دوسری وسط ایشیائی جمہوریہ کی نسبت، تاجکستان میں زیرزمین اسلامی سیاسی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں، اسی لیے تاجک قومیت کے احیا کا فطری راستہ صرف اسلام تھا۔ ملا محمد رستموف ہندوستانی انتہائی معروف اور بااثر، روپوش روحانی پیشوا تھے۔ انہوں نے دیو بند ہندوستان میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بعدازاں1970ء کے عشرے میں انہوں نے دوشنبہ میں ایک خفیہ مدرسے کی ابتداء کی۔ وہ اپنے ساتھ اسلامی دنیا کی تشکیل کے نئے تصورات اور پاکستان، ہندوستان اورعرب ریاستوں میں اسلامی بنیاد پرستی کی تحریکوں کے نظریات وسط ایشیا میں لائے اور وادی فرغانہ میں تاجک اور ازبک، دونوں سے، ان نظریات کا تعارف کرانے لگے۔ اس تحریک کا تاریخی ریکارڈ تو موجودنہیں تاہم اتنا ضرور پتہ ہے کہ1982ء میں، مُلاّ ہندوستانی کے مدرسے سمیت بائیس مدرسے غیر قانونی طور پر، چل رہے تھے۔ سودیت حکومت نے ان سب کو بند کر دیا۔ ملا ہندوستانی کو پندرہ سال سزا دے کر، سائبیریا بھیج دیا گیا، جہاں1989ء میں وہ انتقال کر گئے۔

ملا ہندوستانی کے ایک شاگرد عبداللہ سیدوف تھے۔ یہ سید عبداللہ نوری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ نوری1947ء میں طویل ڈیرہ کے قصبے میں پیدا ہوئے۔ وادی کے دوسرے قبائل کے ساتھ،1953ء میں، ان کے خاندان کو بھی جنوب میں واقع وخش وادی کے کپاس کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے...... جبراً وہاں سے لے جایا گیا۔1974ء تک نوری نے سروے انجینئرنگ کی تربیت لینے کے ساتھ ساتھ، نحضر اسلامی نامی ایک غیر قانونی اسلامی تعلیمی ادارہ قائم کرنے میں بھی بھرپور مدد کی۔ مارچ198ء میں افغانستان کی سرحد کے ساتھ پنج کے مقام پر، نوری نے افغان مجاہدین کی حمایت میں پہلی عوامی ریلی کی قیادت کی- کچھ ہی ہفتے بعد گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی کے گوریلوں نے، افغان سرحد سے شہر پر حملہ کر دیا۔ چالیس دوسرے افراد کے ساتھ، نوری کو غیر قانونی اسلامی لٹریچر پھیلانے اور افغانستان پر سودیت قبضے کے خلاف احتجاج منظّم کرنے کے الزامات لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔1988ء میں رہائی کے بعد نوری نے اپنی خفیہ سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اور بالآخر

جماعت احیائے اسلام کے بانی رکن اور قائد بن گئے۔

ملا ہندوستانی کے ایک اور شاگرد محمد شریف ہمت زادہ تھے۔ وہ دسمبر1991ء میں اسی جماعت کے فوجی ونگ کے رہنما بن گئے۔ دوشنبہ کے نواح میں' میری ہمت زادہ سے' ان کی روپوشی ہی کے دوران' ان کے چھوٹے سے مکان میں ملاقات ہوئی۔ طویل قامت' باریش اور خوش شکل ہمت زادہ کا تعلق کسان گھرانے سے تھا اور انہوں نے مکینک کی تربیت لی ہوئی تھی۔ وہ مجاہدین کی ہمراہی میں افغان جنگ میں حصہ لے چکے تھے۔ ان کے افغان اور پاکستانی اسلام پسندوں...... حکمت یار اور قاضی حسین احمد...... سے گہرے تعلقات تھے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے انہوں نے پندرہ سال خفیہ اسلامی سرگرمیوں میں گزارے۔ بعض لوگ انہیں وسط ایشیا کا گلبدین حکمت یار بھی کہتے تھے۔ کیونکہ سوویت افواج کے خلاف برسر پیکار مجاہدین میں حکمت یار کو متشدد اور انتہا پسند افغان رہنما سمجھا جاتا تھا۔ ''پچیس سال تک' کمیونسٹوں نے اللہ کا نام ہمارے حافظے سے نکالنے کی کوشش کی لیکن آج بھی ہر تاجک اللہ کو یاد کرتا ہے اور اللہ کی جماعت کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہے۔'' ہمت زادہ نے مجھے بتایا۔

جماعت احیائے اسلام کی تاجک شاخ کی بنیاد رکھتے وقت نوری اور ہمت زادہ کی باہمی دوستی خاصی پرانی تھی۔ استراخان (روس) میں تاتاری دانش وروں نے یہ جماعت 1990ء میں قائم کی تھی۔ وہ سوویت یونین میں مسلمانوں کو مجتمع کر کے' روس میں نفاذ شریعت کی مہم چلانا چاہتے تھے۔ اس کے ابتدائی اجلاس میں طے کیا گیا کہ ہر سوویت جمہوریہ میں پارٹی کی آزاد و خود مختار شاخ قائم کرنی چاہیے۔ صدر میخائیل گورباچوف کے تحت گلاس ناسٹ کے عروج کے زمانے میں جماعت احیائے اسلام روس میں ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے رجسٹر ہوئی جبکہ وسط ایشیائی جمہوریاؤں میں' حکمران کمیونسٹ پارٹیوں نے اس پر پابندی لگائے رکھی۔ تاجک نمائندوں نے جماعت کے ابتدائی اجلاس میں شرکت کے بعد یہ ٹھان لی کہ وطن واپس لوٹتے ہی تاجکستان میں جماعت کی تنظیم کریں گے لیکن اس پر فوری پابندی عائد ہوگئی۔

بہرحال نوری کی نوجوان تنظیم' وادی کراتے جن کے قبائل اور وادی وخش کے شہر کرگان طیب کے اردگرد جبراً آباد کئے گئے کراتے جنوں کی حمایت اور تعاون سے جماعت احیائے

اسلام کی ایک خفیہ تاجک برانچ قائم کر دی گئی۔ جماعت کے افتتاحی غیر قانونی اجلاس میں' 26 اکتوبر 1991ء کو لگ بھگ چھ سو پچاس مندوبین نے شرکت کی۔ ہمت زادہ کو پارٹی کا پہلا چیئر مین منتخب کیا گیا۔ اسلامی اخبار جاری کیا گیا۔فوجی نشان اور پارٹی پرچم کی منظوری دی گئی۔ جماعت نے خود کو اسلام کی تبلیغ' روحانی احیاء کا ارتقاء اور تاجکستان کی سیاسی اور معاشی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ ہمت زادہ نے' ایک پریس کانفرنس میں' اہل وطن کو یقین دہانی کرائی کہ پارٹی کا مقصد اسلامی ریاست کے بجائے' قانون کی بالادستی کی محافظ' ایک جمہوری ریاست کا قیام ہے۔ آرمینیا کے مہاجرین' اپنی جمہوریہ میں شدید لڑائی کی وجہ سے' تاجک دارالحکومت کی طرف امڈے آرہے تھے۔ ان کی دارالحکومت میں آباد کاری کی افواہ نے پورے دوشنبہ میں شدید ہنگاموں کی آگ بھڑکا دی چنانچہ فروری 1990ء میں جماعت منظر عام پر آ گئی' اور اس کے سرگرم کارکن' تاجک کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر کو گھیرے میں لینے والے' جم غفیر میں شامل ہوگئے اور مختلف اسلامی مطالبات کا نعرہ لگا دیا۔ کئی دنوں تک انہوں نے وہاں کا گھیراؤ کئے رکھا اور اپنے مطالبات پر مبنی بینرز لگا دیئے...... زیادہ مساجد بنائی جائیں۔ سُور اور شراب بیچنے والے سٹور بند کئے جائیں اور ملکی شاہراہوں کے روسی نام تبدیل کر دیئے جائیں۔

1991ء کے آخر میں' جوں جوں سیاسی صورت حال (تیسرے باب میں تفصیل ہے) بگڑنے لگی' کمیونسٹ پارٹی میں اندرونی رقابتیں سر ابھارنے لگیں' اس کے نتیجے میں قیادت میں بھی کئی تبدیلیاں آئیں۔ تاجک پارلیمنٹ میں شدت پسند کمیونسٹوں نے بالآخر' الیکشن کے ذریعے 62 سالہ رحمان نبی یوف کو ستمبر میں صدر بنا دیا۔ دوشنبہ زبردست عوامی احتجاج کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہزاروں افراد نے لینن سکوائر میں احتجاجی کیمپ لگا دیئے۔ اس کا نام بدل کر آزادی سکوائر کر دیا گیا۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ جوں جوں میں مظاہرین کے جم غفیر میں سے گزرتا گیا' مجھے ان کے جوش و جذبۂ حکمرانوں سے ان کی ظاہری نفرت اور روز بروز آزادی سکوائر میں بیٹھنے کی خواہش...... بھوک اور پیاس کی شدت کے باوجود...... متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ سیاسی جبر کے شکار' اس علاقے میں کوئی نہ کوئی بات رونما ہونے والی ہے۔ جماعت کے لیے بھی یہ ایک خاص کٹھن مرحلہ تھا۔ لوگ اس کی زیر قیادت اور تحفظ میں شہر کی گلیوں اور بازاروں میں پڑے ہوئے تھے اور وہ پہلی دفعہ اس عمل میں وسیع

تحرک اور سیاسی ہنگامہ آرائی کا مزا چکھ رہے تھے۔ تاجک جماعت احیائے اسلام کو اس زمانے میں جتنے قریبی عوامی رابطے کا موقع ملا' وہ وسط ایشیا میں کبھی کسی اسلامی تحریک کو نصیب نہیں ہوا۔ تاجک حکومت نے جماعت کو سیاسی پارٹی کے طور پر دوشنبہ میں رجسٹر کیا اور چند ہی روز بعد...... سودیت یونین کے خاتمے کے ساتھ...... اس کے اراکین کی تعداد بیس ہزار ہو چکی تھی۔

دریں اثناء نبی یوف کو نئی جمہوریہ کے صدارتی الیکشن کرانے پر مجبور کر دیا گیا۔ 24 نومبر کے ان انتخابات میں' نبی یوف 58% ووٹ لے کر' ایک معمولی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ روس اور وسط ایشیائی رہنماؤں کو یہ جان کر شدید دھچکا لگا کہ اپوزیشن لیڈر دولت ہدیٰ نذر وف' جنہیں جمہوریت پسندوں' قوم پرستوں اور اسلام پسندوں کے ارتقاء پذیر محاذ کی مکمل حمایت حاصل تھی' نے 34% ووٹ لئے۔ وسط ایشیا میں یہ مشاہدہ پہلی دفعہ کیا گیا کہ اعلیٰ طور پر منظّم اور متحرک اپوزیشن (بشمول اسلامی تحریک) کس طرح اور کتنی تیزی سے عوامی حمایت کو متحرک کر سکتی ہے۔ واضح طور پر اسلامی احیاء صرف ثقافتی تشخص اور پارسائی تک ہی محدود نہیں تھا۔ اگر یہ تحریک تاجکستان کے ریاستی ڈھانچے کو سیاسی چیلنج کر سکتی تھی تو بلاشبہ وسط ایشیاء کی دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کے لیے بھی یہ زبردست خطرہ بن سکتی تھی۔ متنازعہ انتخابی نتائج نے مارچ 1992ء میں مزید ہنگاموں اور جلسے جلوسوں کی راہ کھول دی۔ جواباً حکومت نے شدید کریک ڈاؤن شروع کر دیا' جس میں بہت سے لوگ جاں بحق ہو گئے۔ قتل و غارت' لوٹ مار اور اغوا روز مرہ کا معمول بن گئے' غرض دوشنبہ میں مکمل لاقانونیت کا راج تھا۔ خانہ جنگی سے بچاؤ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ جماعت احیائے اسلام کے اہم رہنما...... دوشنبہ کے شمال میں کراتے جن اور طویل دارا کی وادیوں میں فوجی مراکز قائم کرنے کی غرض سے...... پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔

دوشنبہ میں برسرکار اسلام پسندوں کے نیٹ ورک کا...... خاندانی' قبائلی اور علاقائی بندھنوں کی وجہ سے...... حکومتی کفالت میں ''سرکاری' اسلام سے بھی قریبی رابطہ تھا۔ سودیت یونین کے آخری برسوں میں' تاجک مسلمانوں کے مفتی اعظم قاضی اکبر طورا جانزادہ' ان کے اہم ہمدردوں میں تھے۔ وہ 1954ء میں دوشنبہ کے قریب پیدا ہوئے اور بخارا کے سرکاری مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعدازاں' اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ 1970ء کے عشرے

میں اردن چلے گئے۔ واپسی کے بعد' انہوں نے کچھ عرصہ تاشقند کے وسط ایشیائی مسلم بورڈ میں کام کیا۔1988ء میں انہیں تاجکستان کا پہلا مفتی اعظم مقرر کیا گیا۔1990ء میں انہیں ماسکو میں' سپریم سودیت کا رکن چنا گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ روسی ان پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ دوشنبہ میں ان کا اپنا ٹی وی شو بھی تھا۔تنومند' خطرتاً ہنگامہ پسند' بیک وقت خوش مذاق' درشتی اور موقع پرستی کے حامل' طورا جان زادہ کے ذاتی تعلقات بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے1990ء میں دارالحکومت میں مسجدوں کی تعمیر میں مذہبی جوش وخروش کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی۔ مسجدوں کی افتتاحی تقریب کے موقع پر...... چاہے وہ ان کی علاقائی حدود سے باہر ہی کیوں نہ ہوں...... وہ دعا کی تقاریب میں ضرور شریک ہوتے۔

1991ء میں جب میری جان زادہ سے ملاقات ہوئی تو وہ مقبولیت کے عروج پر تھے۔ دوشنبہ کی مرکزی مسجد میں' ہزارہا لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ جماعت احیائے اسلام سے بھی ان کے خفیہ رابطے تھے انہوں نے واضح الفاظ میں بنی یوف حکومت کے زوال اور حکومت اور اپوزیشن کے مابین موجودہ لڑائی کی پیش گوئی کی ''اسلام مضبوط ہے جبکہ کمیونسٹوں پر لوگ اعتماد نہیں کرتے۔'' انہوں نے فخریہ انداز میں کہا' حالانکہ وہ بنی یوف کی کابینہ کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ طورا جان زادہ نے بعدازاں یہ دعویٰ بھی کیا کہ جماعت کو حکومت سے مقابلے یا اسلامی ریاست کے قیام میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ حکومتی جبر وتشدد کے سامنے' جماعت محض مدافعت پر مجبور ہوگئی ہے۔ (نوری نے بھی کچھ ایسا ہی دعویٰ کیا تھا)۔

خانہ جنگی شروع ہوتے ہی' طورا جان زادہ حکومت سے علیحدہ ہوگئے۔ ایران میں جلاوطنی کاٹتے ہوئے' وہ اپوزیشن اتحاد کے اہم رہنما بن گئے۔ خانہ جنگی کے دوران' جماعت احیائے اسلام کی حمایت کے حصول میں' انہوں نے دنیا کے کونے کونے کا سفر کیا۔ ان کے سرکاری مرتبے اور اسلامی علم اور ذاتی مقبولیت نے جماعت کو ایسا حقیقی جواز عطا کیا جس کی وسط ایشیا میں پہلے کوئی مثال نہیں ملتی...... یوں لگا جیسے پوپ ویٹیکن سے نکل کر گوریلوں کے لیڈر بن گئے ہیں۔ انہی دنوں طورا جان زادہ کو محسوس ہوا کہ جماعت انکی مقبولیت اور مرتبے کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ پارٹی میں طورا جان زادہ کے حمایتیوں کا کہنا تھا کہ تاجکستان میں کوئی ایک پارٹی اسلامی انقلاب بپا نہیں کرسکتی اور معاشرے کی نچلی سطح سے' آہستہ آہستہ

اسلامائزیشن کا عمل شروع ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ رویہ 1997ء کی خانہ جنگی کے بعد اختیار کیا۔ اسی وجہ سے بالآخر' انہیں جماعت احیائے اسلام سے نکال دیا گیا۔

جونہی تاجک جماعت نے' دوسرے قبائل اور نسلی گروہوں سے اتفاق و اتحاد کی بنیاد ڈالی' وسط ایشیا کی دوسری شاخوں کا...... آزادی کے بعد...... تاجکوں کا ساتھ دینا محال تر ہوتا گیا۔ قازقستان میں جماعت کے اراکین کی اکثریت کا تعلق قازق نسل سے نہیں جبکہ کرغیزستان میں صرف جنوب کے باشندوں...... ازبک اور دوسرے نسلی گروہوں میں ان کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جماعت احیائے اسلام ترکمانستان میں کبھی بھی غلبہ حاصل نہیں کر سکی۔ ازبکستان میں' وادی فرغانہ میں اسکی مقبولیت بہت تیزی سے پھیلی' تاہم اس کے رہنما عبداللہ عطائیف کی 1992ء میں اچانک گم شدگی کے ساتھ ہی جماعت کی مقبولیت بری طرح متاثر ہوئی۔ عام تاثر یہ ہے کہ عبداللہ کو ازبک خفیہ ایجنسی نے اغوا کر کے مار ڈالا۔ دوسرے زیادہ انقلابی گروپ' اسی کے بطن سے' وادی فرغانہ میں 92-1991ء کے دوران پیدا ہوئے۔ ان میں توبہ' اسلام لشکر لاری اور عدالت قابل ذکر نام ہیں۔

وادی فرغانہ' اس طرح اسلامی احیاء کا ازبکستان میں اہم ترین مرکز بن گئی۔ سعودی عرب' پاکستان اور ترکی کے مبلغین' اپنا اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے کے لیۓ ڈالروں سے بھرے سوٹ کیس لئے یہاں آن پہنچے۔ ایران نے فارسی بولنے والے تاجکوں کے ذریعے' جماعت احیائے اسلام میں جگہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن سنی تاجکوں کے دل میں' زبان اور ثقافتی تعلق کے باوجود' شیعہ ایران کے لیے کوئی خاص ہمدردی جنم نہیں لے سکی چنانچہ اسلام پسندوں میں ایرانی اثر نہ ہونے کے برابر ہی رہا۔

خانہ جنگی

1992ء کے دوران' دوشنبہ میں سیاسی جدوجہد نے تاجکستان میں ہر جگہ بے چینی اور شورش کی انتہاء کر دی۔ کہیں کوئی زیادہ خودمختاری کا طلبگار تھا اور کہیں جمہوریہ سے علیحدہ ہو جانے کی کھلم کھلا دھمکیاں تھیں۔ پامیری باشندوں نے گورنو بدخشاں کو اپریل میں خودمختار جمہوریہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ ادھر جنوب مشرق میں قلاب اور شمال میں خوبند کے نیوکمیونسٹ لیڈروں نے یہ دھمکی دی کہ اگر صدر بنی یوف جماعت احیا کو کچلنے میں ناکام رہے

تو وہ اپنی جمہوریائیں بنا کر' آزادی کا اعلان کر دیں گے۔ قلاب میں موجود فوجی ملیشیا نے کرگان طیب میں جماعت کے حامی دیہاتیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ غرض تاجکستان شدید بدامنی کا شکار ہوگیا اور صدر بنی یوف بے یار و مددگار ہوتے چلے گئے۔ تشدد اور ہنگامے حد سے بڑھ گئے تو صدر کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ وسط ایشیا کے کسی لیڈر کو عوامی دباؤ اور ہنگاموں کے نتیجے میں اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔ کریموف نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی کو لکھا کہ ''انتشار اور ہنگامہ آرائی کی فضا نے پورے وسط ایشیاء کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔'' حکومت کے دعوؤں کے مطابق 1992ء کے ابتدائی چھ ماہ میں' لگ بھگ چالیس ہزار افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

روسی فوجی دستوں نے دوشنبہ ایر پورٹ اور افغان سرحدوں کا کنٹرول سنبھال لیا کیونکہ لاکھوں روسی نسل کے افراد تاجکستان سے نکلنے کی کوشش میں تھے۔1992ء میں دو لاکھ سے زایدہ روسیوں نے یہاں سے ہجرت کی۔ جنوب میں لڑائی خوفناک شکل اختیار کر گئی۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہونے لگے اور مہاجروں نے ہر جانب سے دوشنبہ پر یلغار کر دی۔ اجتماعی کاشت کاری کے تجربے کے بعد' وسط ایشیا میں انتقال آبادی کا یہ سب سے بڑا واقعہ تھا۔ جماعت احیائے اسلام کے بہت سے حامی افغانستان فرار ہوگئے۔ اکتوبر میں قلاب کے نیوکمیونسٹوں کی جانب سے بغاوت کی کوشش کے بعد' تاجک پارلیمنٹ نے' قلاب کے کمیونسٹ رہنما امام علی رحمانوف کو نیا صدر چن لیا۔ انہوں نے تمام فوجی اور سول محکموں میں قلابیوں کو بھرتی کر لیا۔ قلابیوں کے مکمل غلبے کے بعد' جماعت احیائے اسلام سے اتفاق داشتراک کی راہ بالکل ہی معدوم ہوگئی۔

جماعت احیائے اسلام نے کراتے جن' طویل دارا کی وادیوں' کرگان طیب اور افغانستان کو اپنے مراکز بنا کر حکومتی فوج اور قلابی ملیشیا پر حملے شروع کر دیئے اور اس طرح خانہ جنگی گوریلا جدوجہد کی شکل اختیار کر گئی۔ جماعتی رہنما ایران' پاکستان' روس اور افغانستان کی طرف نکل گئے جہاں پہلے اسی ہزار مہاجرین موجود تھے۔ انہوں نے افغان حکومت کی اجازت سے قندوز اور طالقان کے شمال مشرق میں مراکز قائم کر لئے۔ (یہ علاقے ان دنوں صدر برہان الدین ربانی اور افغان تاجک لیڈر احمد شاہ مسعود کے کنٹرول میں تھے)۔ دریں اثنا تاجک اپوزیشن کے سیکولر رہنماؤں نے ماسکو میں جماعت کے ساتھ مل کر' سیاسی

سرگرمیوں کے لیے اپنے دفاتر بنا لئے۔ اس طرح تاجک تنازعہ بین الاقوامی صورت اختیار کر گیا۔ افغانستان مین مہاجرین کی جنگی تربیت کی جارہی تھی' انہیں اسلحہ دے کر واپس تاجکستان بھیج دیا جاتا تھا۔ ان کے رہنما مالی اور فوجی تعاون کے لیے ایران' پاکستان اور سعودی عرب کے سفر کر رہے تھے۔ روس اور ازبکستان کی مکمل حمایت تاجک حکومت کو حاصل تھی۔ فوجی دستے' ہوائی جہاز' اور فوجی سازو سامان بھیجا جا رہا تھا' تاہم ساتھ ہی ساتھ' اپوزیشن سے مذاکرات بھی چل رہے تھے۔

تنازعے کے دوران' جماعت نے دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد بنانے اور اشتراک کرنے میں انتہائی لچکدار رویئے کا مظاہرہ کیا۔ ان جماعتوں میں دوشنبہ کا ایک چھوٹا سا دانش ور' جمہوریت کا حامی...... رستخیز پاپولر فرنٹ تھا' تاجکستان ڈیموکریٹک پارٹی اور اسماعیلی پامیری مسلمانوں کی لعل بدخشاں تھی۔ جو اس وقت پورے گورنو بدخشان پر قابض تھی۔ 1995ء میں ان پارٹیوں نے جماعت احیائے اسلام کی زیر قیادت (ماسکو اور طالقان میں اپنے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ) متحدہ تاجک اپوزیشن تشکیل دی۔ لیکن تاجک معیشت میں ابتری اور انتشار کے ساتھ ساتھ حکومت روسی امداد کی محتاج ہوتی چلی گئی۔ قتل و غارت رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دونوں جانب یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ فوجی ذرائع سے ایک دوسرے پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بازی بری طرح پھنس کر رہ گئی۔ متحدہ اپوزیشن گرمیوں میں افغانستان سے گوریلا حملے جاری رکھتی اور سردیوں میں حکومت اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کی کوشش کرنے لگتی۔ بالآخر دونوں امن مذاکرات کی جانب بڑھنے لگے۔

1996ء میں' طالبان کے کابل پر قبضے کے بعد' علاقائی صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ وسط ایشیائی لیڈروں کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں پشتون نژاد طالبان' اپنے مخصوص مسلک کے لیۓ ان کے علاقوں میں دراندازی شروع نہ کر دیں۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں کو ہی یہ احساس ہوگیا کہ خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے مذاکرات کی جانب پیش رفت ان کے مفاد میں ہے۔ مذاکرات میں معاونت کے لیے اقوام متحدہ نے اپنا خصوصی نمائندہ مقرر کیا۔ مذاکرات کے دو طرفہ راؤنڈ بھی ہوئے لیکن حقیقی پیش رفت صدر رحمانوف اور نوری کے مابین' خوس دہ' افغانستان میں' دسمبر کی بالمشافہ ملاقات کے بعد ہی ممکن ہوئی۔

اگرچہ دونوں کے فوری مقاصد مختلف نوعیت کے تھے لیکن خانہ جنگی کے اہم عناصر اب

واضح حل کی تلاش میں تھے۔ جماعت جان گئی تھی کہ روس اور ازبکستان اسے عوام سے کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ وہ جماعت اور اسلام کی مقبولیت کو گھٹانے کے لیۓ غربت اور ناداری کو بدترین شکل تک لے جائیں گے۔ صدر رحمانوف کو بھی احساس ہوگیا کہ وہ قلابیوں کے (طاقت کے مختصر سے مرکز کے) ساتھ ملک کو کنٹرول نہیں کر سکتے اور انتشار اور افراتفری کا تسلسل ملک کو کہیں کا نہیں رکھے گا۔ طالبان کے خلاف، احمد شاہ مسعود کی حمایت میں روس اور ایران سعودی عرب اور پاکستان کے کردار کو محدود کرنا چاہتے تھے، کیونکہ یہ دونوں ممالک طالبان کے زبردست موئید اور حامی تھے۔ ازبکستان نے بھی اندازہ لگا لیا کہ اس کی فوجی امداد کے باوجود رحمانوف، تاجکستان مین ازبک اکثریت کے تحفظ یا ملکی سطح پر صحیح کنٹرول کے سلسلے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ربانی اور احمد شاہ مسعود کا اپنا مفاد یہ تھا کہ تاجکستان میں ان کے مراکز محفوظ اور مضبوط ہوں تاکہ روس اور ایران سے آنے والی فوجی امداد میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو۔ ان وجوہات کی بنا پر تاجکستان میں امن کا قیام ضروری ہوگیا تھا۔ انہی دونوں ممالک نے مذاکرات کے عمل میں اہم کردار بھی ادا کیا۔

جنگ کے خاتمے اور مسلح گروہوں کو مذاکرات تک لانے کے لیے سلامتی کونسل نے یکے بعد دیگرے کئی نمائندوں کا تقرر کیا۔ ''امن کے عمل کی کامیابی اقوام متحدہ کی شمولیت اور پڑوسی ممالک کی حمایت کے بغیر ناممکن تھی۔ پڑوسی ممالک اس امن معاہدہ کے ضامن بنے۔ تاجکوں مین جنگ کے خاتمے کی خواہش بھی اس تصفیے کا ایک موثر عامل بنی۔'' اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے خصوصی نمائندے آئیوو پٹروف نے2001ء میں مجھے بتایا۔ ''لیکن بعض عوامی اور اہم گروہ مذاکرات سے باہر رہ گئے۔ ان میں سابق وزیراعظم عبدالملک عبداللہ جانوف کی زیر قیادت خوبند باشندے اور ایک باغی فوجی افسر کرنل محمود ہدیٰ بردیف کا ازبکی گروپ شامل تھے۔ انہوں نے بارہا امن مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ نومبر1998ء میں خوبند پر حملے تک کر ڈالے۔

اگرچہ اس معاہدے کو سبھی نے مجبوراً قبول کیا تاہم فائنل امن معاہدہ دوسرے وسط ایشیائی ممالک کے لیے بھی ماڈل کی شکل اختیار کر گیا۔ عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آیا اور وسط ایشیا میں پہلی دفعہ، دو متحارب گروہوں نے باہم مل کر کولیشن حکومت قائم کی۔ جماعت احیاء کے باغیوں کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں، قومی فوج میں

شامل کیا گیا اور مہاجرین کو واپس اپنے اپنے علاقوں میں لا کر آباد کیا گیا۔ جماعت اور دوسری پارٹیوں کو قانونی حیثیت دی گئی۔ فروری2000ء میں پارلیمانی انتخابات کرائے گئے' جن میں آزادانہ مقابلہ ہوا...... یہ مظاہرہ بذات خود' مکمل آمریت کے خاتمے کی جانب بے مثال واقعہ تھا۔ بین الاقوامی مبصرین نے الیکشن میں دھاندلی پر شدید تنقید کی۔ مقامی طور پر احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے۔ تاہم رحمانوف کی عوامی ڈیموکریٹک پارٹی64.5% ووٹ لے کر انتخابات جیت گئی۔ کمیونسٹ دوسرے نمبر پر رہے اور غریب جماعت7.5% ووٹ لے کر تیسرے نمبر پر رہی۔ تاہم نوری نے واشگاف انداز میں...... تمام تر انتخابی دھاندلیوں کے باوجود...... نتائج کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ ''امن کے عمل کو کسی قیمت پر نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔'' اس انداز کے سمجھوتے اور اتفاق رائے کے بارے میں...... تاجکستان میں کیا' پورے وسط ایشیا میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سوائے کرغیزستان کے' کثیر جماعتی انتخابات کہیں بھی ممکن نہیں ہو پائے تھے۔

جماعت احیائے اسلام کا زوال

تاہم امن و امان کی صورت حال خطرناک ہی رہی۔1991ء میں معاہدہ کئی بار ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ متحدہ اپوزیشن معاہدے پر فوری عمل درآمد چاہتی تھی جبکہ رحمانوف کے پشت پناہ شدت پسند اس کی راہ میں مزاحم تھے۔ دھماکوں' قتل و غارت اور اغوا کی وارداتیں دوشنبہ کا معمول تھیں جبکہ دارالحکومت سے باہر حکومتی فوج اور جماعت کے باغیوں کے مابین مسلح تصادم جاری تھا۔ ان تمام ہنگاموں کے دوران اقوام متحدہ کے ایلچی گرد میرم نے دوطرفہ مذاکرات کے عمل کو جاری رکھنے کا نازک کام مسلسل سرانجام دیا۔

قومی معیشت کی خطرناک صورت حال بھی معاہدے پر عمل درآمد میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ زراعت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ فیکٹریاں بند پڑی تھیں اور وسیع پیمانے پر بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی۔ امن کی بحالی اور اس کے حقیقی فائدے' فریقین اسی وقت اپنے حمایتیوں تک پہنچا سکتے تھے جبکہ قومی تعمیر نو کا عمل باقاعدگی سے شروع ہو جاتا۔ تاہم امدادی سرگرمیاں اور منتشر آبادیوں کی از سر نو بحالی کا کام' کئی سال تک' فنڈز کی کمی اور بین الاقوامی عدم توجہ کی وجہ سے رکا رہا۔

امداد کے وعدوں کے باوجود بین الاقوامی برادری نے تعمیر نو کی کوششوں میں خاصی سرد مہری دکھائی۔ اقوام متحدہ نے2000ء کے لیۓ انسانی ریلیف کے لیے34.8ء ملین ڈالر کی امداد مانگی، سال کے آخر تک بمشکل آدھی امداد اکٹھی ہوسکی۔2001ء میں اقوام متحدہ نے85 ملین ڈالر امداد کے لیے کہا لیکن چھ ماہ بعد بھی صرف اس کا1/4 حصہ تاجکستان پہنچ سکا۔ تاجکستان مین روزمرہ زندگی مزید تکلیف دہ ہوتی چلی گئی۔ بجلی، پانی اور خوراک کی قلت نے غربت کی سطح اور زیادہ بڑھا دی۔2001-1991ء کے عشرے کے دوران آبادی5.2 ملین سے بڑھ کر6.5 ملین ہوگئی۔2001ء میں ایک اعلیٰ تاجک سفارت کار کی تنخواہ بمشکل آٹھ ڈالر فی ماہ تھی، جبکہ وزیر خارجہ کی تنخواہ بیس ڈالر تھی۔2000ء میں ہونے والی شدید خشک سالی نے اگلے سال کی زرعی پیداوار پر اور بھی تباہ کن اثر ڈالا۔ حالانکہ اسی دوران اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے تحت کئی ملین ٹن گندم1.2 ملین سے زیادہ متاثرہ افراد مین تقسیم بھی کی گئی۔

نہ روزگار تھا اور نہ ہی تحفظ۔ چنانچہ تاجکوں نے ملک سے باہر جا کر روزی کمانے کا سوچا۔ بین الاقوامی ادارہ ہجرت کے مطابق، ہر سال دو لاکھ سے زیادہ تاجک افراد جزوقتی یا موسمی کام کاج کے لیے روس کا رخ کرنے لگے۔

''یوں لگتا ہے کہ ہر گھرانے کا کوئی نہ کوئی آدمی غیر ممالک......خصوصاً روس میں...... مزدوری کی غرض سے گیا ہوا ہے۔'' یہ الفاظ بین الاقوامی ادارہ ہجرت کے ایک افسر ایگور بوس نے کہے ہیں۔ بعض لوگوں نے افغانستان سے باہر کام کرنے والی منشیات کی تنظیموں میں شمولیت اختیار کر لی۔1998ء میں شمالی افغانستان کے طالبان کے قبضے میں چلے جانے کے بعد تاجکستان، افغان ہیروئین کو روس اور یورپ لے جانے کا، ایک اہم روٹ بن گیا۔ مئی2000ء میں تاجک افسروں کے مطابق، پچھلے سالوں کی نسبت افغانستان سے دس گنا زیادہ ہیروئین تاجکستان لائی جا رہی تھی۔ منشیات کی معیشت سے پیدا شدہ آمدنی سے وسیع کرپشن پھیلنا شروع ہوگئی۔ معاشی اصلاحات کی طرف توجہ پہلے ہی کم تھی، امن و امان کے مسائل اور زیادہ الجھنے لگے کیونکہ تھوڑی بہت ترقی ڈرگ مافیا اور سیکیورٹی فورسز کے مابین تصادم کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ یہ بات خود معجزے سے کم نہیں کہ مخلوط حکومت اس بدتر صورت حال میں بھی قائم رہی۔ شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ تاجکستان کی جنگی

درماندگی کا ایک سادہ ساعکس تھا۔

امن اپنے دامن میں، جماعت احیائے اسلام کے لیے کچھ اور مسائل لے آیا۔ اس دوران جماعت کے سیاسی مستقبل کی بقا اور وسط ایشیا میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں اہم بحث شروع ہوگئی۔ تاجکستان کے غیر مساوی نسلی، علاقائی اور قبائلی خدوخال ہیں، جماعت کی مسلح حمایت ذاتی قبائلی یا علاقائی حدود سے، کسی بھی طرح، باہر نہیں جاپائی، خانہ جنگی اسلامی جہاد کی شکل اختیار کرنے کے بجائے فوراً ہی مختلف قبائل کے مابین جنگ کا روپ دھار گئی۔ چنانچہ بعض جگہ جماعت کی شدید حمایت موجود تھی اور بعض جگہوں پر جماعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ ایسی جگہوں پر حکومت نے جماعت کے مخالف جنگی سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جماعت اس علاقائیت پسندی کے مسئلے پر کبھی قابو نہیں پا سکی۔ خانہ جنگی کے بعد، جب جماعت پورے ملک میں اپنی جڑیں نہ پھیلا سکی تو یہ مسائل اور بھی شدید ہوگئے۔ تقسیم در تقسیم اور گروہ بندی نے ڈرامائی طور پر اس کا اثر ونفوذ بہت کم کر دیا اور اس کا نتیجہ 2000ء کے انتخابات میں جا کر واضح ہوگیا۔

قاضی طورا جانزدہ کو......جنہیں رحمانوف نے1998ء میں نائب وزیراعظم اول مقرر کیا تھا...... رحمانوف کی انتخابی حمایت پر جماعت احیائے اسلام سے نکال دیا گیا۔ فروری 2000ء میں دوشنبہ میں اپنے ہی مسلح محافظوں کے ہاتھوں، قاتلانہ حملہ سے وہ بال بال بچے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس میں بھی جماعت کے انتہا پسندوں کا ہاتھ تھا۔ طورا جانزادہ اعتدال پسند رہنما تھے اور ان کا کہنا تھا کہ کوئی ایک جماعت ملک میں اسلام کا اداراتی نظام قائم نہیں کر سکتی۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے عوام کو آہستہ آہستہ اسلام کی طرف راغب کرنے کی پالیسی اپنائی جائے۔ جماعت کے بعض رہنما حکومت کے متعلق نوری کی پالیسی کو انتہائی نرم سمجھتے تھے جبکہ بعض دوسرے رہنما رحمانوف کے ساتھ نوری کی سمجھوتہ آمیز پالیسی کو درست خیال کرتے تھے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں جماعت مزید تقسیم کا شکار ہوگئی۔ مزید براں، جماعت کے بعض اعلیٰ فوجی کمانڈروں نے حکومتی فوج میں شمولیت کے جماعتی فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بعض لوگ خانہ جنگی کے دوران جماعت کے ایک نمایاں کمانڈر جمعہ نعمان غنی کے ساتھ مل گئے۔ انہوں نے امن معاہدہ مسترد کر کے، جہاد کا سلسلہ جاری رکھا اور ازبک حکومت کو اپنی مسلح کارروائیوں کا نشانہ بنا لیا۔ نعمان غنی نے ازبک تحریک اسلامی قائم کر لی۔

افغانستان اور تاجک علاقہ طویل دارا' ان کی حربی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ ازبکستان کے خلاف 2001-1999ء کے دوران ان کی مسلح کارروائیوں اور دوشنبہ حکومت کے خلاف شدید ہنگامہ آرائیوں نے جماعت احیائے اسلام میں شکست وریخت کا عمل اور بھی تیز کر دیا۔ رحمانوف نے اس صوت حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جماعت کے بعض دوسرے مسلح گروہ ڈاکوؤں اور قزاقوں کی شکل اختیار کر گئے۔ انہوں نے اغوا اور بینک ڈکیتیوں کے ذریعے حکومت کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا شروع کر دیئے۔2000ء کے موسم گرما تک جماعت کے ایک اقلیتی کمانڈر رحمان سینگنوف کی قیادت میں تقریباً سو افراد نے دوشنبہ کے قرب و جوار میں بے پناہ اودھم مچا رکھا تھا۔ بالآخر تاجک فوج کی مداخلت اور تقریباً ایک ماہ کی لڑائی کے بعد' اگست میں باغیوں کو گھیرے میں لے لیا گیا اور سنگینوف اپنے پنتالیس ساتھیوں کے ہمراہ مارا گیا۔

نوری کی زیر قیادت جماعتی اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ جماعت اور ازبک تحریک اسلامی کے ابتدائی تصور کے مطابق جہاد ہی وسط ایشیاء میں اسلامی تحریک کا واحد راستہ نہیں۔ ''ازبک تحریک اسلامی کے فلسفے کے برعکس یہاں جہاد واحد لائحہ عمل نہیں۔ضرورت ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی ہے جو اسلامی مقاصد کے پھیلاؤ میں معاون ہو سکے۔'' یہ الفاظ نوری کے معتمد خاص اور جماعت کے ایک اہم لیڈر محی الدین کبیر کے ہیں۔ ان کے یہ الفاظ دراصل جماعت کی حقیقت پسند نوجوان نسل کے تصورات کے عکاس ہیں۔ بعض دوسرے رہنما مثلاً شریف ہمت زادہ' جو پہلے جماعت کے فوجی ونگ کے کمانڈر تھے' حکومت میں شامل ہو گئے...... ہمت زادہ سے میری ملاقات کوئی دس سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب وہ انڈر گراؤنڈ تھے____ اب وہ پارلیمنٹ کے رکن بن گئے تھے۔ کسی زمانے کی طویل داڑھی بھی مختصر اور خوش شکل نظر آنے لگی تھی اور اب وہ خوش وضع سوٹ اور ٹائی بھی پہننے لگے تھے۔ ''اگر تمام جماعتیں' ہماری طرح امن کی تعمیر کی واقعی خواہاں ہوں تو وسط ایشیاء کے لیے تاجکستان کا امن پروگرام ایک بہترین ماڈل بن سکتا ہے۔'' انہوں نے بڑے اصرار سے یہ بات کہی۔ ''لیکن اس کے لیے علاقائی حکومتوں کو اسلامی جماعتوں کے بارے میں اپنا رویہ بدلنا ہوگا اور انہیں اظہار رائے اور ریاست کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے قانونی اور آئینی راستہ دینا پڑے گا۔ اگر موجودہ حکمران ایسا نہیں کرتے تو لوگ انتہا پسندوں سے جا

ملیں گے۔'' ان کی رائے خطرناک حد تک مناسب اور درست تھی۔ اس وقت ازبک اسلامی تحریک اور حکمران ٹولہ ایک خونین جنگ میں بری طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ جماعت احیائے اسلام نے اپنی سیاسی حمایت کھو دینے کے بعد' نوری کی زیر قیادت' حکومتی ڈھانچے میں پارلیمانی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جماعت نے محسوس کیا کہ اسے اور ملک کو انتہا پسند اسلامی جماعتوں اور نظریات کی وجہ سے زیادہ سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ خانہ جنگی کے خاتمے کے باوجود تاجکستان وسط ایشیا اور افغانستان کے درمیان عدم استحکام کا مرکز بنا ہوا تھا اور بین الاقوامی برادری اس صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ دوشنبہ مسلسل طالبان کے خلاف احمد شاہ مسعود کی مزاحمت کو سپلائی مراکز فراہم کرتا رہا۔ لیکن ستمبر 2000ء میں طالقان ہاتھ سے نکل جانے کے بعد مسعود کے لیے اور زیادہ نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔ اب طالبان کا افغان تاجک طویل سرحد پر مکمل کنٹرول ہو گیا اور پہلی دفعہ وہ تاجک سرحد پر موجود روسی سرحدی محافظوں کے بالکل آمنے سامنے کھڑے تھے۔

مسعود کی حامی علاقائی ریاستوں کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ اگر طالبان کے خلاف مسعود کی مزاحمت کو قائم رکھنا ہے تو اسے کہیں زیادہ فوجی مدد درکار ہوگی۔ چنانچہ اکتوبر 2000ء کی ایک اہم میٹنگ میں' دوشنبہ میں روسی وزیر دفاع ایگور سرگیف' ایرانی وزیر خارجہ کمال خرازی اور صدر رحمانوف نے مسعود سے گفتگو کے دوران انہیں مکمل اور بھرپور امداد دینے کا وعدہ کیا۔ مسعود کے طالبان مخالف متحدہ محاذ نے اگلے موسم گرما تک طالبان کو بدخشاں پر قبضہ کرنے سے روکے رکھا۔ مسعود کے قبضے میں افغانستان کا یہ آخری شمالی علاقہ تھا جو عین تاجکستان کی سرحد پر واقع تھا۔ لیکن اس صورت حال نے پہلے سے کہیں زیادہ تاجکستان کو افغانستان کے خلاف فرنٹ لائن سٹیٹ بنا دیا۔ طالبان تاجکستان کو مستحکم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ انہی خارجی خطرات کی موجودگی اور ہزارہا افغان مہاجرین کے تاجکستان میں گھس آنے کے خوف کی بدولت تاجک حکومت قومی معاشی ترقی کے پروگرام آگے بڑھا نہیں پا رہی تھی۔

طالبان ہی واحد خطرہ نہیں تھے۔ اسلامی ازبک تحریک کے وادی فرغانہ میں داخلے کا راستہ بھی تاجکستان ہی تھا۔ وادی طویل دارا میں اس کا مرکز موجود تھا اور وہ پورے وسط ایشیا

سے مذہبی گروہوں کو اکٹھا کر رہی تھی تاکہ 2001ء کے موسم گرما تک' وہ پورے وسط ایشیا کی اسلامی تحریک کی شکل اختیار کر سکے۔ ازبک اسلامی تحریک کی تاجک سرزمین میں موجودگی ازبکستان اور کرغیزستان کے ساتھ دوشنبہ کے مسائل کو اور الجھائے جا رہی تھی۔ جماعت احیائے اسلام میں بھی اس کی وجہ سے تقسیم کا عمل تیز ہوگیا۔ نعمان غنی کو مرزا ضیاؤف جیسے سابقہ فوجی کمانڈروں...... ضیاؤف اس وقت تاجک حکومت میں شامل تھے...... کی مکمل خفیہ حمایت حاصل تھی۔ ضیاؤف کا خیال تھا کہ ازبک تحریک کے ذریعے ازبکستان پر بھرپور دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ تاجکستان کو ایک اور پین اسلامک تحریک کا سامنا کرنا پڑ گیا جو ساری وسط ایشیائی ریاستوں میں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی۔ یہ تھی حزب التحریر اسلامی' جماعت احیائے اسلام کے برعکس اس کے زیادہ تر حامی شہری تعلیم یافتہ اشرافیہ سے متعلق افراد تھے۔ اگرچہ حزب التحریر انتہائی پرامن جماعت تھی پھر بھی حکومت نے ایک اور اسلامی تحریک کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے خلاف زبردست کریک ڈاؤن کی ابتدا کر ڈالی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کولیشن حکومت میں موجود جماعت احیائے اسلام نے بھی اس کی حمایتکی۔ رحمانوف نے اسے امن وامان کا مسئلہ سمجھا جبکہ جماعت احیائے اسلام نے اسے اپنی اسلام حمایتی بنیاد کے لیے حریفانہ خطرہ سمجھا۔ ایک انقلابی اسلامی قوت بلاوجہ دوسری اسلامی قوت سے نبرد آزما ہوگئی۔ تاجکستان بری طرح روسی امداد کا محتاج تھا مگر روس' خانہ جنگی سے تباہ حال تاجکستان کو بھرپور مدد مہیا کرنے سے قاصر تھا۔ مغرب نے تاجکستان کو بدستور نظر انداز کئے رکھا۔ معاہدہ امن ہونے کے پانچ سال بعد' 2001ء میں بین الاقوامی برادری کو دوشنبے کی کولیشن حکومت کی سٹریٹجک اہمیت اور مادی امداد مہیا کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ بالآخر بین الاقوامی برادری کو طالبان' ازبک اسلامی تحریک اور حزب التحریر کے ہاتھوں تاجکستان کو پیش آمدہ خطرات کے متعلق صحیح اندازہ ہوگیا۔ انہیں یہ ادراک بھی ہوگیا کہ ان کے اپنے مفادات بھی ان خطرات سے بری طرح متاثر ہو سکتے ہیں۔

امریکہ نے طالبان اور اسامہ بن لادن کو تنہا کرنے کی کوششوں کے دوران' اپنے مقاصد کے حصول کے لیئے' تاجکستان میں امن واستحکام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ امریکی سنٹرل کمانڈ فورسز کے جنرل ٹامی فرینکس نے مئی 2001ء میں دوشنبہ کا اپنا پہلا دورہ کیا اور پہلی دفعہ امریکی افسروں نے تاجکستان کو ''سٹریٹیجی کے اعتبار سے اہم ملک'' قرار دیا۔ وسط ایشیاء میں امن وتحفظ یقینی بنانے کے لیے تاجکستان کا استحکام بہت ضروری تھا۔

چنانچہ تاجکستان کے تحفظ کو مستحکم کرنے کے لیے' انہوں نے امریکی فوجی امداد کا وعدہ کیا۔ جواباً' تاجک حکومت نے وسط ایشیاء میں امن وتحفظ کے پروگرام کے لیے نیٹو اور تاجکستان کے لیے مشاورتی گروپ کے ممالک میں شمولیت کی حامی بھر لی۔ اس کے مرکزی عطیہ کنندگان ممالک میں امریکہ' جاپان اور یورپی یونین شامل تھے۔ انہوں نے قرضہ اور توازن ادائیگی کی مدد میں 430 ملین ڈالر کی امداد کا وعدہ کیا۔ یہ امدادی پیکج صدر رحمانوف کو مئی میں ٹوکیو میں پیش کیا گیا جہاں وہ دس عطیہ کنندہ ممالک اور پندرہ بین الاقوامی اداروں...... آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جن میں سرفہرست تھے...... کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ امدادی پیکج گذشتہ سال کی امداد 280 ملین ڈالر کے مقابلے میں دو گنا تھا۔ اتفاقاً' میں ان دنوں ٹوکیو میں تھا۔ بنی یوف کے سینئر عہدیداروں سے ملاقات ہوئی تو وہ بے پناہ خوش نظر آئے کہ بالآخر دنیا تاجکستان کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے۔ افغان خانہ جنگی کی طرح تاجک خانہ جنگی نے بھی وسط ایشیا میں بہت سے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا کہ ''سٹیٹس کو'' کو بدلنے کی خواہاں قبائلی اور علاقائی بنیادوں پر قائم اسلامی تحریکیں انتہائی خطرناک اور تباہ کن نوعیت کی حامل ہیں اور علاقائی معاشی تباہ حالی کی بنیادی وجہ بھی ہیں۔ میں نے 2001ء کے موسم بہار میں کراتے جن اور طویل دارا کی وادیوں کا طویل دورہ کیا اور وہاں کے ان مقامی قبائلی لیڈروں سے گفت وشنید کی جو کبھی جماعت احیائے اسلام کا مضبوط گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ یہ حقیقت اب واضح ہو چکی تھی کہ جماعت کا اثر اور خانہ جنگی کے دوران اسلامائزیشن کا جذبہ حیرت انگیز طور پر مفقود ہوتا جا رہا تھا۔ وادیوں میں مدارس اور اسلامی تعلیم کے دوسرے مراکز نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور ان سے منسلک مولوی حضرات اپنی پرانی مساجد یا کھلیان آباد کرنے واپس جا چکے تھے۔ پاکستان اور افغانستان کے مقابلے میں...... جہاں مدارس سے لاکھوں اسلامی مزاج رکھنے والے افراد نکلتے ہیں...... تاجکستان بالکل ہی سیکولر نظر آ رہا تھا۔ جماعت مدارس کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی' نتیجتاً' مدارس کے خاتمے کے ساتھ ہی' جماعت کے مستقبل کی پرداخت کی بنیاد ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ ان مدارس کو پاکستان اور سعودی عرب سے امداد ملتی تھی اور انہیں...... جماعت کی طالبان مخالف سرگرمیوں اور احمد شاہ مسعود کی حمایت کی وجہ سے...... جماعت سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ چنانچہ ان میں سے کسی بھی ملک نے تاجکستان میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانے

کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ ساتھ ہی1993ء میں حکومت نے مدارس کو ملنے والی غیر ملکی امداد پر مکمل پابندی عائد کر دی۔

خانہ جنگی کے دوران مقامی مولویوں کا اپنے علاقوں پر خاصا اثر تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اثر زائل ہو گیا۔ ووٹ ڈالنے یا زندگی کے رویوں کے بارے میں' ان کی عوامی اثر پذیری ختم ہوتی چلی گئی۔ نوجوانوں نے مساجد میں جانا چھوڑ دیا اور سودیت دور کی طرح' پھر مسجدوں میں صرف بوڑھے لوگ ہی نظر آنے لگے۔ نوجوان یا تو گھروں سے کام کی تلاش میں نکل گئے تھے یا فارغ اوقات میں مادی فنون سیکھنے یا ویڈیوز دیکھنے لگے تھے۔ تعلیم اسلامی کے بجائے دوبارہ سیکولر رنگ اختیار کر رہی تھی۔ صوفیا کے مزاروں پر دعاؤں اور زیارتوں کا سلسلہ دوبارہ زور وشور سے شروع ہو گیا۔ خانہ جنگی کے دوران' جماعت کے انتہا پسند حلقوں میں اسے بہت معیوب سمجھا جاتا تھا مگر ان کی گرفت ہلکی ہوتے ہی مزاروں پر حاضری کا سلسلہ عوامی مقبولیت حاصل کرنے لگا۔ بعض جگہوں پر دیہاتی چودھریوں کو واڈ کا اور برانڈی کے ساتھ زائرین کی تواضع کرتے بھی دیکھا گیا۔ ایسی ایک جگہ میں نے شراب پر پابندی کے اسلامی احکام کے متعلق پوچھا تو دیہاتیوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ اب ایسی پابندیاں ختم ہو چکی ہیں۔ ''جب جماعت والے یہاں تھے تو ہم بوتلیں چھپا کر رکھتے تھے۔ لیکن اب وہ جا چکے ہیں تو ہم نے بھی انہیں باہر نکال لیا ہے اور آزادی سے پیتے پلاتے ہیں۔'' طویل دارا...... جو کبھی جماعت کا فوجی مرکز ہوا کرتا تھا...... کے ایک کسان نے وضاحت سے بتایا۔

دیکھنے میں یہ آیا کہ خانہ جنگی کے دوران شدید نقصانات اٹھانے کے بعد' جماعت نہ تو اپنے آپ کو صحیح طرح منظم رکھ سکی اور نہ ہی قومی معاشیات یا سیاسی ڈھانچے کے احیاء کے لیے مناسب منصوبہ بندی کر سکی چنانچہ اسلام کی اداراتی تشکیل تو دور کی بات رہی' وہ عوام میں اپنی موجود مقبولیت بھی قائم نہ رکھ سکی۔ جماعت کی عوامی جڑیں اور اس کی سیاسی استعداد دن بدن کم ہوتی چلی گئی۔ خانہ جنگی کے پانچ سال کے دوران' نوجوانوں میں جماعت کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ زائل ہوتا چلا گیا' ساتھ ہی علاقائی اور قبائلی سیاست زور پکڑنے لگی کیونکہ حکومت کی جانب سے مہیا کردہ ترقیاتی وسائل...... جو پہلے ہی ضرورت سے بہت کم تھے...... کے حصول میں سخت مقابلہ تھا اور انہیں بہرحال غربت کے

سیلاب میں، اپنے سروں کو پانی کی سطح سے اونچا رکھنے کی کوششیں جاری رکھنا تھیں۔ جنگی تباہ کاریوں نے کسی بھی قسم کی انقلابی تبدیلی کی خواہش کو بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔ لیکن روسی دور کے رہن سہن اور طور طریقوں کی جانب لوگوں کے جانے کے باجوذ پورے ملک میں اسلامی تصورات کے بارے میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ خانہ جنگی کے دوران اور اس کے مابعد، تاجک اور زیادہ پختہ مسلمان ہوگئے، تاہم انقلابی اور سیاسی انتہا پسند، آہستہ آہستہ منظر سے غائب ہونے لگے۔ لوگ پھر سے اپنے پرانے طور طریقوں کی طرف راغب ہونے لگے۔ دل کی گہرائی سے اسلام کی محبت رکھنے کے باوجوذ وہ اس کی انتہا پسندانہ سیاسی سوچ کی حمایت کے لیے تیار نہیں تھے۔ جہادی اسلام تاجکستان میں ناکام ہوگیا لیکن اسے شکست نہیں دی جاسکی۔ اور غربت کے دھندلکوں میں، تاجکوں کو آج بھی اس سنگین مسئلے کا سامنا ہے کہ وہ قبائلی اتحاد، ہم آہنگی اور عظیم تر جمہوریت کی جانب سفر کے لیے کس طرح قومی اتفاق رائے پیدا کریں۔

باب 6

حزب التحریر: خلافت کے احیاء کی جدوجہد

وسط ایشیا میں موجودہ اسلامی تحریکوں کے بارے میں سوچتے ہوئے' یہ سوال بری طرح ذہن میں چبھنے لگتا ہے کہ مشرق وسطیٰ سے جنم لینے والی' انتہائی خفیہ پین اسلامک تحریک' جو عموماً وسط ایشیاء کے روزمرہ مسائل سے غیر متعلق لگتی ہے' کس طرح ازبکستان' تاجکستان اور کرغیزستان کی انتہائی مقبول زیر زمین تحریک بن گئی ہے؟ حزب التحریر اس علاقے کے حکمرانوں کے لیے کتنا بڑا چیلنج بن گئی ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ازبک اسلامی تحریک سمیت کسی بھی تحریک کی نسبت' حزب التحریر کے قیدیوں کی تعداد' وسط ایشیاء کی جیلوں میں سب سے زیادہ ہے۔ حزب التحریر کے خلاف حکومتوں نے زبردست اور وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن شروع کر رکھا ہے مگر اس تحریک کی تیز رفتار مقبولیت ان کی سمجھ سے بھی بالاتر ہے۔

یہ تصور اس لیے بھی زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ حزب التحریر کے مقاصد' موجودہ دور کی کسی بھی اسلامی انقلابی تحریک کی نسبت انتہائی دقیق اور بے وقت کی راگنی محسوس ہوتے ہیں۔ حزب التحریر وسط ایشیاء چینی صوبے زن جیانگ اور بالآخر تمام امت (بین الاقوامی اسلامی

برادری) کو اسلامی خلافت کے تحت متحد کرنے کی خواہاں ہے' جس کی مثال رسول اللہﷺ کے انتقال کے بعد' 632ء میں خلافت راشدہ کے قیام سے ملتی ہے۔ یہ خلافت 661ء تک قائم رہی تھی اور اس کے دوران مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک میں فتوحات اور تبدیلی مذہب کے ذریعے' اسلام انتہائی طوفانی رفتار سے پھیلتا گیا۔ بہت سی اسلامی انقلابی تحریکوں کے مطابق (طالبان سمیت) دراصل اسی دور میں حقیقی اسلامی معاشرہ موجود تھا۔ تاہم حزب التحریر خلافت کے قیام کے سلسلے میں انتہائی بے مثال جرات کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کے تصورات کے مطابق' ایک دو مسلمان ممالک جونہی حزب کے کنٹرول میں آ جائیں گے' تو باقی اسلامی دنیا کو جیتنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔ حزب التحریر کے رہنماؤں کے خیال میں' وسط ایشیا ''نقطہ کھولاؤ'' پر آ گیا ہے اور وہاں خلافت کا آغاز ہو سکتا ہے۔ حزب کے موجودہ رہنما اور انتہائی بالغ النظر مصنف شیخ عبدالقدیم ظلوم کا صورت حال کے بارے میں خیال ہے۔ ''اس سرزمین کو اسلام کا گہوارہ بنانے اور باقی اسلامی ممالک کے ساتھ متحد کرنے کا عظیم مقصد بہرحال مسلمانوں کو حاصل کرنا ہے اور اس مقصد کا حصول خلافت کے از سر نو قیام کے بغیر ممکن نہیں۔''

ابتداء' ڈھانچہ اور نظریات

حزب التحریر 1953ء میں شیخ تقی الدین النبہانی فلسطینی کی زیر قیادت' بے خانماں فلسطینیوں کے ہاتھوں سعودی عرب اور اردن میں تشکیل پذیر ہوئی۔ شیخ تقی الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے گریجویٹ تھے۔ وہ فلسطین میں ایک سکول کے استاد اور مقامی قاضی بھی تھے لیکن اسرائیل کی نئی مملکت کے قیام کا راستہ صاف کرنے کے لیے انہیں بھی جلاوطنی کا شکار ہونا پڑا۔ وہ 1953ء میں اردن میں مقیم ہوگئے اور وہیں انہوں نے اس تحریک کا آغاز کیا۔ دوران زندگی انہوں نے بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے۔ حزب التحریر کا بنیادی فلسفہ انہی کی تحریروں سے ماخوذ ہے۔ ''عصر حاضر کی صورت حال نے مسلمانوں کے ذہنوں کو شدید پراگندگی کا شکار کر دیا ہے۔ بدچلن جمہوریت کے سوا' کوئی اور طرز حکمرانی ان کے تصور میں ہی نہیں آتا کیونکہ ان کے حکمرانوں نے' اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اسے بگاڑ یا سنوار کر' اپنے عوام پر مسلط کیا ہوا ہے...... زیر نظر نکتہ یہ نہیں کہ بہت سی اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں

بلکہ ساری اسلامی دنیا میں ایک ریاست کا قیام مقصود نظر ہے۔'' یہ بات انہوں نے1962ء میں ایک معروف کتاب ''اسلامی ریاست'' میں کہی تھی۔ اس کتاب میں' انہوں نے رسول اکرمﷺ کی زندگی کا تجزیاتی جائزہ لیا ہے کہ انہوں نے ابتداء میں کس طرح اسلام کی اشاعت خفیہ طور پر کی۔ پھر اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کھل کر سامنے آ گئے اور بالآخر جہاد کا حکم فرما دیا۔ رسول اکرم کی زندگی کی جدید تعبیر اور ان کی رہنمائی میں اشاعت اسلام کے تین مراحل کا تذکرہ کر کے' النبہانی حزب التحریر کے پیغام کو وسعت دینے اور اسلام کی ابتدائی تبلیغ کے سلسلے میں سیاسی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے' اپنی جماعت کو ایک واضح لائحۂ عمل دیتے ہیں۔

چنانچہ نبی اکرمﷺ اور ان کے پیروکاروں کی مکہ سے مدینہ ہجرت' اسلامی تاریخ کا ایک تاریخی سفر...... ان کے مطابق وہ وقت ہے جب ''دعوت اسلام کا ابتدائی مرحلہ'' اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام کے مرحلے کی جانب بڑھا۔'' اور اس کے بعد کا مرحلہ ''جہاد کے ذریعے توسیع کا مرحلہ'' تھا۔ یہی وہ عمل ہے جسے حزب التحریر وسط ایشیا میں دھرانا چاہتی ہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے اپنے غیر مسلم مخالفین کے ہاتھوں جو تشدد اور ظلم برداشت کیا اسے شیخ تقی ''ٹارچر' داخلی اور بیرونی پراپیگنڈہ اور پابندیوں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہی وہ حقیقی ردعمل ہے جس کا وسط ایشیا کے حکمرانوں کے ہاتھوں حزب التحریر کو آج سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شیخ تقی ' ابتدائی اسلام کی تاریخ اور پیغام کو' انتہائی' چابک دستی سے' اپنی تحریروں میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق' جہاد کے انقلابی پیغام کی شکل دے دیتے ہیں۔

اگرچہ حزب التحریر جہاد کو غیر مسلموں کے خلاف مسلمانوں کو متحرک کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہے تاہم دوسری انتہا پسند تنظیموں مثلاً اسامہ بن لادن کے القاعدہ گروپ وغیرہ کی طرح' حزب مسلمان حکومتوں کو تشدد اور ہنگامہ آرائی کے ذریعے ہٹانے کی قطعی حمایت نہیں کرتی۔ وہ عوامی مقبولیت جیتنا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن پرامن احتجاج کے ذریعے' اس کے حمایت کار وسط ایشیا کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیں گے۔ وسط ایشیا کے جابرانہ ماحول میں یہ خوف...... اور حزب التحریر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت' دونوں مل کر...... حکمرانوں کو تحریک کے خلاف مسلسل کریک ڈاؤن کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسلام

کریموف نے ازبکستان میں حد درجہ ناروا تشدد کا سہارا لیا ہوا ہے۔

اسلامی ریاست کے آئینی ڈرافٹ میں' شیخ تقی بڑے اعتماد سے یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ بالآخر پارٹی اسلامی دنیا میں مکمل غلبہ حاصل کرے گی اور غیر مسلم دنیا میں اسلام کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔ شیخ کے ''مستقبل کی اسلامی ریاست'' کے تصور میں ایک مکمل سیاسی ڈھانچہ کارفرما ہے جس میں اسلامی شوریٰ کا منتخب کردہ خلیفہ' انتہائی مرتکز نظام میں مکمل اختیارات کا حامل ہوگا۔ اسے افواج' سیاسی نظام' معیشت اور خارجہ امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہوگا۔ شریعت کی بالادستی ہوگی۔ عربی ریاستی زبان ہوگی اور خواتین کا کردار خاصا محدود ہو جائے گا۔ وزیر دفاع...... جسے امیر جہاد کا لقب دیا جائے گا......عوام کو غیر مسلم دنیا کے خلاف جہاد کے لیے تیار کرے گا۔ اس جہاد کی غرض سے ضروری فوجی تعلیم و تربیت پندرہ سال سے زیادہ عمر کے ہر مسلمان کے لیے لازمی ہوگی۔

وسط ایشیا میں تحریک کے لیڈروں نے مجھے بتایا کہ وہابی تحریک کے احیاء کے دوران ہی' سعودی عرب میں حزب التحریر کی ابتداء ہوئی تھی۔ لیکن بعض ایشوز میں اختلاف کی وجہ سے حزب وہابی تحریک سے علیحدہ ہوگئی تھی۔ ''وہابیوں کے ساتھ ہمارا ایک مشترکہ منصوبہ تھا مگر جلد ہی ہم میں اختلافات پیدا ہوگئے اور یوں ہم علیحدہ ہوگئے۔ حزب التحریر ہر ملک مین لوگوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کام کرنا اور پر امن ذرائع سے نفاذ شریعت چاہتی تھی۔ لیکن وہابی انتہا پسند تھے اور وہ گوریلا جنگ اور اسلامی فوج تشکیل دینا چاہتے تھے۔'' یہ بات مجھے ازبکستان میں تحریک کے ایک رہنما...... جسے میں علی کا فرضی نام دیتا ہوں...... نے2000ء کے موسم خزاں میں بتائی۔ اگرچہ حزب کے نظریات اب بھی وہابیوں کے بہت قریب ہیں تاہم وسط ایشیاء کی تمام اسلامی تحریکوں کو' ازبکستان اور دوسری وسط ایشیائی ریاستیں کندہ ناتراش وہابی کا نام ہی دیتی ہیں۔ ایک زمانے میں حزب التحریر اخوان المسلمین کے بھی خاصا قریب تھی۔ اخوان نے سب سے پہلے1930ء میں مصر میں' سامراج کے خلاف اسلامی جدوجہد اور جدید اسلامی ریاستوں کی تشکیل کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اخوان کے پیغام کو پاکستان کی جماعت اسلامی' افغانستان کے احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمت یار اور تاجکستان کی جماعت احیائے اسلام نے مزید پروان چڑھایا۔

مشرق وسطیٰ میں پابندی لگنے کے بعد' اس کے بعض رہنماؤں نے مغرب کا رخ کیا اور

یورپ میں، خصوصاً جرمنی اور برطانیہ میں اپنے دفاتر قائم کر لیے۔ کہا جاتا ہے کہ لندن حزب التحریر کا اہم تنظیمی مرکز ہے۔ حزب یہاں فنڈز کی فراہمی اور کارکنوں کی تربیت کا انتظام کرتی ہے تاکہ وسط ایشیا میں تحریک کو تقویت دی جا سکے۔ حزب التحریر، برطانوی یونیورسٹیوں میں موجود مسلمان طلبہ میں بے پناہ مقبول ہو رہی ہے۔ جب 26 اگست 2001ء کو لندن کے علاقے ڈاک لینڈ میں، حزب نے پاکستان کے سیاسی بحران پر بحث کے لیے کانفرنس بلائی تو تمام برطانیہ سے اس کے ہزارہا حمایتی وہاں اکٹھے ہوگئے۔ اس کانفرنس میں موجود سہولتوں کی وجہ سے حزب التحریر کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور مالی وسائل کا اندازہ ہوا۔ معذور لوگوں اور بچوں کے لیے، موقع پر طبی سہولتیں موجود تھیں۔ بک سٹال لگائے گئے تھے۔ نماز کے لیے جگہ مخصوص کی گئی تھی۔ اور انٹرنیٹ پر براہ راست ویب سائٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ حزب التحریر کی مقبولیت کا دائرہ ترکی، مصر اور شمالی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے اور اب یہ پاکستان میں بھی اپنی جڑیں پھیلا رہی ہے۔

حزب کے موجودہ رہنما شیخ ظلوم نسلاً فلسطینی ہیں اور جامعہ از ہر میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بھی تحریک کے فلسفے اور طریق کار پر کافی کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے ہیں۔ ان کا موجودہ ٹھکانہ غالبًا یورپ میں ہے تاہم وہ بھی سربستہ راز ہے۔ وسط ایشیا میں حزب کے رہنماؤں کی تصاویر تک منظر عام پر نہیں آئیں اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ وہ لوگ کون ہیں، ان کی رہنمائی کا طریق کار کیا ہے اور کہاں انہوں نے اپنے مراکز قائم کئے ہوئے ہیں۔ ازبکستان میں ''علی'' سے میرا طویل انٹرویو غالبًا وسط ایشیا کی حزب التحریر کے رہنما سے میرا پہلا پبلک انٹرویو تھا۔ انتہائی خفیہ طریقے سے اس کا انتظام کیا گیا اور یہ شرط عاید کی گئی کہ میں ان کا نام اور ان کے ٹھکانے کا راز قطعاً ظاہر نہیں کروں گا۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ مشرع شکل وصورت کا نوجوان علی روایتی ازبک لباس میں ملبوس...... ازبکستان کے بعض صوبوں میں قائم حزب کے مراکز میں...... ایک سینئر رہنما ہے۔ دوسری اسلامی انقلابی تحریکوں کے موازنے، حزب کی تاریخ، فلسفے، حکمت عملی اور سیاسی اٹھان پر اس کا حقیقی عبور ان کے دعوے کی واضح تصدیق ہے۔

علی نے حزب کی خفیہ اور غیر مرتکز کارروائیوں کی وضاحت کی۔ پورے وسط ایشیاء میں پانچ سے سات افراد پر مشتمل چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیئے گئے ہیں تاکہ حکمرانوں کے

لیے جماعت تک رسائی کے امکانات کم سے کم رہیں۔ ان گروہوں کو دائرہ کا نام دیا گیا ہے اور یہ اسلام اور حزب کے پیغام کی توسیع کے لیے وقف سٹڈی گروپس ہیں۔ دائرے کا سربراہ ہی پارٹی تنظیم کی اگلی سطح سے واقف ہوتا ہے۔ وہ اراکین کے ذمے ہفتہ وار فرائض سونپتا ہے اور وہ لوگوں میں گھل مل کر نئے دائروں کی تشکیل کا کام کرتے ہیں۔ ازبک پولیس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے بعض ایجنٹ حزب کی ابتدائی صفوں میں شامل کر دیئے تھے اور اس طرح دائروں کے کئی اراکین کو گرفتار بھی کر لیا- تاہم وہ رہنماؤں کے سلسلوں تک نہیں پہنچ پائی۔29 مئی2001ء کو ماسکو میں روسی پولیس کے ہاتھوں نادرعلی یوف کی گرفتاری' آج تک کی سب سے اہم کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ نادرعلی کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ ازبک حزب التحریر کے اہم رہنما ہیں۔ انہیں ازبکستان کی تحویل میں دے دیا گیا۔

لیکن حزب التحریر ایک تصور کے طور پر ابھری ہے۔سودیت یونین کے خاتمے کے وقت' یہ تحریک وسط ایشیا میں سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ پہلے پہل آنے والے ایشیائی اور عرب مشنریوں میں حزب شامل نہیں تھی۔ ازبک حکام کے مطابق1995ء تک کسی کو حزب کے نام کا بھی پتہ نہیں تھا۔ انہی دنوں صلاح الدین نامی ایک اردنی باشندہ تاشقند آیا اور اس نے دو ازبک ساتھیوں کی مدد سے پہلے حزبی دائرے کی بنیاد رکھی۔ حزب کے پمفلٹ پہلی بار 96-1995ء میں ازبکستان میں خفیہ سرگرمی کے طور سامنے آئے۔حکمرانوں نے انہیں بےضرر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ (ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عربی زبان میں تھے اور بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکتے تھے) لیکن جیسے ہی اس تحریک کے مراکز تاشقند اور فرغانہ کی وادیوں میں قائم ہوئے اور وہاں سے پورے ازبکستان' تاجکستان اور کرغیزستان میں ان کا حلقہ وسیع ہونے لگا' علاقائی حکمرانوں نے ان کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔علی کے دعوے کے مطابق صرف تاشقند میں حزب کے ساٹھ ہزار حامی موجود ہیں' دوسرے شہروں میں بھی ان کے ہزارہا حامی ہیں۔2000-1999ء کے درمیان حزب کے حامیوں کی بڑے پیمانے پر' پورے وسط ایشیا میں' گرفتاریاں ان کے دعوے کی سچائی کا ثبوت ہیں۔حزب التحریر کا لٹریچر اب ازبک' تاجک اور کرغیز زبانوں میں باقاعدہ ترجمہ ہو رہا ہے۔ پارٹی میگزین الوائی (ضمیر) اور اسلامی ریاست' اسلام کا معاشی نظام' خلافت کو کس طرح تباہ کیا گیا (النبہانی اور ظلوم کی تصانیف) جیسی ساری کتابوں کے ان تینوں زبانوں اور روسی زبان میں ترجمے موجود

ہیں۔

جزوی طور پر حزب التحریر کا غیر معمولی پھیلاؤ ٹیکنالوجی کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حزب چودہ سو سال پہلے کے دور سے روحانی تقویت حاصل کرتی ہے لیکن وہ ازمنہ وسطیٰ کی ریاست کی تشکیل نو کی ہرگز خواہاں نہیں۔ ازبک اسلامی تحریک کے برعکس، حزب غیر مسلم معاشروں اور ثقافتوں کی کامیابیوں کو تسلیم کرتی ہے اور مستقبل کی خلافت کے لیے انہیں اپنانا بھی چاہتی ہے۔ درحقیقت، حزب اپنے پیغام کو پھیلانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کے بھرپور استعمال پر یقین رکھتی ہے۔ حزبی دائروں کے اراکین کی گرفتاری سے یہ راز فاش ہوا کہ وہ کمپیوٹر ڈسک، وڈیوز، سی ڈیز، جدید پرنٹنگ اور فوٹو کاپی مشینیں اور ای میل کا بے اندازہ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب اشیاء وسط ایشیا میں ابھی عام مروج نہیں اور عام لوگوں کی اس ٹیکنالوجی تک قطعی رسائی نہیں۔ حزب کا زیادہ تر سامان بیرونی ممالک سے ہی لایا گیا تھا۔ غالباً بعض سینئر کسٹم حکام کی خفیہ معاونت بھی اس میں شامل تھی۔ شب نامہ، حزب التحریر کا سب سے پسندیدہ انداز پراپیگنڈہ ہے۔ راتوں رات اسے چھاپ کر، اخبار کی طرح، لوگوں کے گھروں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ 1980ء کے عشرے میں، سودیت قبضے کے دوران، سب سے پہلے یہ طریق کار افغان مجاہدین نے اپنایا تھا۔ رات کے وقت گاؤں کی دیواروں پر پوسٹر بھی چسپاں کر دئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ پوسٹرز پولیس تھانوں کی دیواروں پر بھی آویزاں نظر آتے ہیں۔

حزب التحریر گلوبلائزیشن کے تمام تر طریقوں اور ٹیکنالوجیز سے بھرپور استفادہ کرتی ہے۔ دراصل ایک عالم گیر اسلامی حکومت کی تشکیل کے حزبی مقصد کو گلوبلائزیشن کے مغربی تصور سے ملتے جلتے اسلامی انقلابیت پسند تخیل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم حزب جدید سیاسی ریاست...... جس کی بنیادیں قوم پرستی، جمہوریت، سرمایہ داری یا سوشلزم جیسے مغربی نظریات پر استوار ہوں...... کو مکمل طور پر مسترد کرتی ہے۔ وہ ثقافت کی مختلف شکلوں اور لہو ولعب کی بھی مخالف ہے۔ عورتوں کی تعلیم کی حامی ہونے کے باوجود، انہیں گھروں تک محدود کرنے کی قائل ہے۔ طالبان اور وہابیوں کے استدلال کی طرح، ان کا بھی کہنا ہے کہ شریعت کا نفاذ لوگوں کے تمام نسلی، سماجی اور معاشی مسائل کو حل کر دے گا۔ فرانسیسی سکالر اولیور رائے ایسی تحریکوں کو ''نو بنیاد پرست'' کا نام دیتا ہے کیونکہ یہ پہلی قسم کی تحریکوں کی

نسبت کم سیاسی ذہن کی مالک ہوتی ہیں۔ اولین قسم کی تحریکیں شریعت کے نفاذ پر زور دیتی ہیں اور انہیں ایک حقیقی اسلامی ریاست کی تعریف سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔''

جہاں اخوان سے متاثر تحریکیں ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنے اور پھر ہر ملک کو اسلامی ریاست کی شکل دینے کی کوششیں کرتی ہیں' وہاں طالبان' حزب التحریر اور اسلامی ازبک تحریک جیسی تحریکیں نئی دیوبندی وہابی روایت کا حصہ ہیں' جو اقتدار پر قبضے کو شریعت کے نفاذ اور سماجی رویوں کی تبدیلی کا محض ایک راستہ تصور کرتی ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اقتدار پر کنٹرول کے بعد' اسلامی سیاسی ریاست خود بخود تشکیل پا جائے گی۔ خلافت کی تشکیل کے بعد' وسط ایشیا کے خطرناک معاشی اور سماجی مسائل سے کس طرح عہدہ براء ہوا جائے گا' اس موضوع پر حزب کے حلقوں میں کوئی خاص بحث و مباحثہ نظر نہیں آتا۔ حزب کا لٹریچر جہادی فوج کے قیام کو بے پناہ اہمیت دیتا ہے۔ لیکن اس کی تنخواہوں کی ادائیگی یا معاشی اور سماجی خدمات کی انجام دہی کے پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ عام لوگ عثمانی خلافت سے اپنی عقیدت کی وجہ سے بھی حزب میں کشش محسوس کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حزب التحریر ایسی عظیم خلافت کا احیاء چاہتی ہے۔ عثمانی خلافت کا دارالخلافہ استنبول تھا اور ازمنہ وسطیٰ کی ساری اسلامی دنیا بشمول مشرق وسطیٰ اور بلقان پر اس کی حکمرانی تھی۔ وہ عثمانی حکومت کے تحت تمام مسلمان قوموں کے اتحاد کی داعی تھی اور ترک نسل ازبکوں کو یہ نظریہ بہت پر کشش لگتا ہے۔ ترکی افواج کے مصلح اور جدت پسند کمال اتاترک نے1925ء میں خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ حزب کو یقین ہے کہ خلافت کے خاتمے میں عالمی صیہونی تحریک کے ساتھ مغربی سازش پوری طرح کارفرما تھی۔ وسط اور جنوبی ایشیا میں' اسی وقت سے بشمول حزب التحریر بہت سی تحریکیں خلافت کے احیا کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حزب اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ عثمانی خلافت نے نہ صرف مختلف اسلامی مکاتب فکر کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا تھا بلکہ بلقان جیسے علاقوں میں غیر مسلم قومیتوں کو بھی خاصا برداشت کیا تھا۔ یہ حقیقت حزب کے نظریات کے بالکل برعکس ہے۔

حزب التحریر نے اسلامی حکومت کا نظریہ تو بے شک اختیار کر لیا ہے مگر اس کے تصورات انتہائی سادہ اور تاریخی تناظر سے بالکل عاری ہیں۔ انہیں وسط ایشیا کی اسلامی روایات کو اجاگر کرنے سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ حزب تصوف یا اس کے کسی قسم کے

اظہار کی بھی شدید مخالف ہے۔ مثلاً وسط ایشیا میں مزاروں اور وہاں پر عبادات کا اہتمام صدیوں پرانی روایت ہے اور حزب اسے پسند نہیں کرتی۔ اگرچہ اس کے رہنماؤں کا دعوی ہے کہ وہ جدت پسندوں کی فکر سے خاصے متاثر ہیں لیکن ان کے تصورات میں جدت پسندی کا ذرا سا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ جدید ٹیکنالوجی کو اپنا لینے کا یہ مفہوم نہیں کہ اسلام کے متعلق جدید تصورات کو بھی تسلیم کر لیا جائے- وہابیوں کی طرح' حزب التحریر بھی یہودیوں اور اسرائیل کی کھلم کھلا مخالف ہے۔ حزب کے لٹریچر میں کریموف کو ایک یہودی ''اسرائیل کا پٹھو'' اور ''عالمی صیہونی سازش'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حزب کے رہنما یہ بھول جاتے ہیں کہ خاصی بڑی یہودی کمیونٹی پچھلے دو ہزار سال سے وہاں آباد ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں وسط ایشیا میں دو لاکھ یہودی موجود تھے۔ انہیں آج بھی بخاران کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ''ہم یہودیوں کو جان سے نہیں مارنا چاہتے لیکن انہیں وسط ایشیا سے نکل جانا چاہیے کیونکہ ان کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں۔'' علی بصد اصرار کہتے ہیں۔

وہابیوں ہی کی طرح' حزب بھی شدید شیعہ مخالف جذبات رکھتی ہے۔ اگر وہ اقتدار میں آ گئی تو وسط ایشیا سے سارے شیعہ مسلمانوں کو نکال دے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ جنوبی ازبکستان اور مشرقی تاجکستان میں شیعہ برادری کو نہیں رہنے دیا جائے گا۔ بقول علی ''ہم شیعوں اور شیعہ عقیدے کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ اسلامی مسلک نہیں ہے۔'' وہابیت سے مماثل ان انتہا پسند نظریات کا وسط ایشیائی اسلام کے مرکزی دھارے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں کے لوگ دوسرے نظریات وعقاید اور مذہبی اقلیتوں کے متعلق ہمیشہ سے خاصے وسیع القلب اور روا دار رہے ہیں۔ حزب نے عرب دنیا کے نظریات کی درآمد کے ساتھ ساتھ' مقامی اسلامی انقلابی کیمپ میں بھی بحث ومباحثے اور تنازعات کو خاصی ہوا دی ہے۔ وسط ایشیا میں ان نظریات کی پذیرائی مشکل نظر آتی ہے۔ حزب کے رسالے مقامی دباؤ یا عوامی مسائل کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ لگتا ہے کہ یہ تحریریں مقامی طور پر تقسیم کئے جانے کے بجائے' بین الاقوامی تناظر کو مدنظر رکھ کر' بیرون ملک ہی لکھی جاتی ہیں۔ وہ اسرائیل فلسطینی تنازعے یا ''اسلام کے خلاف نام ونہاد یہودی سازش'' جیسے اسلامی دنیا کے بین الاقوامی مسائل کی طرف بھرپور توجہ دے رہے ہوتے ہیں اور وسط ایشیا کے لوگوں کی حقیقی تکالیف...... آسمان سے باتیں کرتی قیمتیں' بے روزگاری اور تعلیمی سہولتوں کے

فقدان...... کے بارے میں ایک اچٹتی نگاہ بھی نہیں ڈالتے۔

حزب کا بظاہر عجیب وغریب مگر انتہائی قوی عقیدہ ہے کہ ماضی میں سرگرم اسلامی انقلابی تحریکیں یا حزب کی ہم عصر تحریکیں بالآخر ''غلط'' ثابت ہو جائیں گی اور حزب ہی حقیقی اسلامی تحریک کے طور پر نمودار ہوگی۔ ''قرآن اور حدیث کے مطابق دنیا کے خاتمے کے وقت تہتر اسلامی تحریکیں موجود ہونگی جن میں سے صرف ایک جماعت حق پر ہوگی۔ یہ بات صرف اللہ کے علم میں ہے کہ کونسی جماعت حق پر ہوگی۔'' علی نے وضاحت کی۔ حزب کے دعوے کی بنیاد قرآن کی یہ آیت ہے۔ ''تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دے۔ اچھے کاموں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ اور یہی لوگ بلاشبہ کامیاب ہونے والے ہیں۔''

وسط ایشیائی ریاستوں میں حزب التحریر

عمومی علاقائی مفادات سے لاتعلقی اور دوسرے اسلامی عقائد کے خلاف عدم رواداری کے باوجود' حزب التحریر وسط ایشیا میں تیزی سے مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حزب ایک پرامن تحریک ہے۔ ازبک اسلامی تحریک سے اظہار ہمدردی کرنے کے باوجود' وہ گوریلا کارروائیوں پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کے بجائے حزب اس لمحے کی منتظر ہے جب اس کے لاکھوں حامی اٹھ کھڑے ہوں گے اور عوامی اکثریت کے بل پر وسط ایشیا کے حکمرانوں کا تختہ الٹ دیں گے...... خصوصاً کریموف کی حکومت کا۔ اس طرح کے تصورات ماضی کی عیسائی تحریکوں سے خاصے مماثل نظر آتے ہیں۔ حزب کے مقاصد کی دھندلاہٹ کو' اس کی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتیں صاف اور واضح کر دیتی ہیں۔ حزب کے لیڈر پوری طرح پر اعتماد ہیں کہ وہ کریموف کے انتہائی قریبی حلقے تک میں اپنا اثر پیدا کر رہے ہیں۔ فوج' خفیہ اداروں اور نوکر شاہی کے اعلیٰ طبقے میں بھی ان کے حامی خاصی تعداد میں ہیں۔ مثلاً کسٹمز کا محکمہ ان کے پروگرام کو بڑھانے میں خاصا معاون ہے۔ جماعت احیائے اسلام اور ازبک اسلامی تحریک کے برعکس...... جنہیں حقیقی حمایت دیہاتی علاقوں اور زراعت پیشہ لوگوں سے ملتی ہے...... حزب کے اکثر کارکن اور حامی شہری دانش ورو' کالج کے طلبہ' تعلیم یافتہ مگر بے روزگار نوجوانوں' فیکٹری مزدوروں اور اساتذہ پر مشتمل ہیں۔ وسط ایشیا میں حزب التحریر کے گرفتار کارکنوں میں زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوان...... جن کی عمریں بمشکل بیس سال

کے اردگرد ہیں......شہری باشندے ہیں۔

درحقیقت حزب کے سائز اور انتظامی ڈھانچے کے متعلق' معلومات کا ایک بہترین ذریعہ' ان کی گرفتاریوں کا ریکارڈ ہے۔ وادی فرغانہ سے ملحق خویند میں تاجک طلبہ اور ازبک نسل کے لوگوں کی بے پناہ گرفتاریاں ہوئی ہیں۔ تاہم خویند سے چند میل دور واقع' دیہاتوں میں کسی کو بھی نہیں پکڑا گیا۔ زراعت پیشہ کسانوں نے حزب التحریر کا نام تک نہیں سنا حالانکہ ازبک اسلامی تحریک سے سبھی واقف ہیں۔ اسی طرح کرغیزستان کے شہر اوش میں' جہاں 40% آبادی ازبک ہے' حزب کے لاتعداد سرگرم حامیوں کو گرفتار کیا گیا لیکن اس کے برعکس ازبک اسلامی تحریک کے ایک اہم مرکز باتکن میں کوئی گرفتاری نہیں ہوئی کیونکہ اس دیہاتی علاقے میں حزب التحریر سے مکمل لاعلمی نظر آتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ ازبکستان میں ازبک اور وسط ایشیا میں ازبک نسل کے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد حزب التحریر کی سرگرم حامی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ حزب وسط ایشیا کے تمام علاقوں میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

کریموف کی پارلیمنٹ نے مئی 1998ء میں آزادی رائے اور مذہبی تنظیموں کا قانون منظور کیا اور ساتھ ہی ازبکستان میں حزب کے خلاف وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ اس قانون کے تحت عبادت کی آزادی کو بہت محدود کر دیا گیا۔ پولیس ہر اس آدمی کے پیچھے لگ جاتی جس نے داڑھی رکھی ہوتی یا جس کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں۔ پاکستان یا افغانستان جانے والے کسی بھی آدمی کو پولیس کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا۔ پرہیز گار مسلمانوں کو عبادت کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اپنے بچوں کے مفروضہ جرائم پر والد کو جیل بھیجا جا سکتا تھا۔ تمام مسلمان جماعتوں کو حکومت سے رجسٹریشن کرانا لازمی تھی اور اسلام کی تبلیغ غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ برقع یا حجاب کے استعمال پر عورتوں کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ وسط ایشیا میں ہیومن رائٹس واچ کے ڈائریکٹر ہولی کارٹر نے اس قانون کو دنیا کے انتہائی مانع مذہب قانون سے تعبیر کیا۔ ''حکومت سارے مسلمانوں کو ایک ہی انداز میں دیکھ رہی ہے چاہے وہ مجرمانہ ذہن کے مالک ہوں یا سیدھے سادے داڑھی والے مسلمان جو مسجدوں میں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔'' انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی۔

قانون پاس کئے جاتے وقت' کریموف نے پارلیمنٹ میں اسلامی بنیاد پرستوں کے

خلاف بے پناہ زہر اگلا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق‘1999ء کے پہلے چھ ماہ میں عدالتوں نے پچپن افراد کو سزائے موت سنائی جن میں سے پندرہ پر عمل درآمد بھی ہوگیا۔ ان میں سے کئی افراد حزب التحریر کے رکن تھے۔

حزب التحریر کا دعویٰ ہے کہ ازبکستان کی جیلوں میں اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ سیاسی قیدی موجود ہیں۔ یہ تعداد یقیناً انتہائی حیران کن ہے اور مبالغہ آمیز بھی۔ امریکی محکمہ خارجہ کی انسانی حقوق کی رپورٹ میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنوری1999ء اور اپریل2000 کے درمیان‘ ازبکستان میں تقریباً پانچ ہزار افرد کو گرفتار کیا گیا۔ ازبکستان کی انسانی حقوق کی تنظیم نے سیاسی قیدیوں کی انتہائی صحیح تعداد چھاپی ہے جس کے مطابق2001 ء کے موسم گرما میں‘ وہاں7600 سیاسی قیدی تھے جن میں سے غالباً5150 قیدیوں کا تعلق حزب التحریر سے تھا- باقی سولہ سو قیدی ازبک اسلامی تحریک یا دوسری وہابی جماعتوں کے تھے- سیاسی قیدیوں کے طوفان کو تھامنے کے لئے کاراکلپکستان میں جسلیک کے فوجی کیمپ میں ایک انتہائی محفوظ جیل تعمیر کی گئی ہے۔ وزارت داخلہ نے اس جیل کو سزایافتگان کی کالونی نمبر کے آئی این64/74 کا نام دیا ہے اور مقامی طور پر اسے ایک ایسی جگہ سمجھا جاتا ہے ’’جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔‘‘ باہر کے لوگوں بشمول قیدیوں کے اہل خانہ کے لیے یہاں آنے کی مکمل ممانعت ہے‘ ضرورت سے زیادہ قیدیوں کی بھرمار (آج کل اس میں آٹھ سو قیدی رکھے گئے ہیں)‘ گرمی‘ سہولتوں کی کمی اور گندا پانی (جس سے ہیپٹائٹس کے ذریعے کئی اموات بھی واقع ہوئیں) کی وجہ سے جیل کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ مسلمانوں کو نماز ادا کرنے یا قرآن کی تلاوت کی ممانعت ہے اور تمام قیدیوں سے جبری مشقت لی جاتی ہے۔ جسلیک جیل کی ناگفتہ صورت حال یا شدید ٹارچر کے ہاتھوں کئی درجن افراد کی ہلاکت کی رپورٹیں ملی ہیں۔ انسانی حقوق سوسائٹی ازبکستان کے اندازے کے مطابق یہاں2000 ء اور2001 ء کے دوران پچاس افراد جاں بحق ہوگئے۔

ہیومن رائٹس واچ کی ایکیشیا شیلڈز نے ازبکستان میں انسانی حقوق کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ستمبر2000ء میں امریکی کانگریس کے ایک پینل کے سامنے واضح ثبوت پیش کیے۔ ’’ازبک پولیس اور سیکورٹی فورسز نے ہزارہا نیک مسلمانوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ گرفتاریاں قطعی غیر قانونی اور امتیازی نوعیت کی ہیں۔ وہ غیر

رجسٹرڈ اسلامی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ جو ریاستی مقبوضہ مساجد سے باہر اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں یا ان کے پاس اسلامی لٹریچر موجود ہوتا ہے۔ پولیس عموماً ان نظر بندوں کو تشدد کا نشانہ بناتی ہے اور طرح طرح کی دھمکیاں دے کر خوف زدہ کرتی ہے۔ طبی سہولیات اور قانونی مشاورت کے حق سے محروم رکھتی ہے اور بسا اوقات ان افرادکو تہ خانوں میں' چھ چھ ماہ تک' قید تنہائی کا شکار رکھا جاتا ہے۔ عدالتی کارروائی انتہائی غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ کیونکہ جج' اپنے طریق کار کے مطابق آزاد مسلمانوں کو'ان کے مذہبی اعتقادات اور تعلق کی بنا پر لمبی سزائیں سنانے پر تلے ہوتے ہیں۔ وہ ٹارچر کے الزامات کو نظر انداز کر کے' استغاثہ کے خود ساختہ الزامات کو ہی ثبوت مان لیتے ہیں۔ اکثر اوقات محض استغاثہ کا بیان ہی سزا سنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔''

ہیومن رائٹس واچ کے مطابق' حکومت نے محلّہ دارنگران کمیٹیاں تشکیل دیں تاکہ مشتبہ یا بیرونی افراد کی آمد ورفت کی نگرانی کی جا سکے' اس کے نتیجے میں گرفتاریوں کی شرح ڈرامائی طور پر بڑھ گئی۔2000ء میں اندازاً محلّہ کمیٹیوں نے دس ہزار سات سوایسے افراد کو شناخت کیا جنہیں ریاست کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور وہ پولیس کی تفتیشی فہرست پر تھے۔

اسی اثناء میں اعترافات کرانے کے لیے وسیع تشدد کا سہارا لیا گیا۔ ''لوگوں کو عموماً انتہائی وحشیانہ انداز مین مارا پیٹا جاتا ہے یا ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ تشدد کی کئی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً لوگوں کے ناخنوں میں سوئیاں چبھونا یا لوگوں کے سروں پر پلاسٹک بیگ ڈالنا تاکہ ان کا سانس الجھ جائے۔ لوگوں کے ساتھ جسمانی تشدد کا بے مہابا استعمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔'' ازبک انسانی حقوق کی آزاد تنظیم کے چیئر مین میخائل اردزینوف کا کہنا ہے۔ ''13 مارچ2000ء کو تاشقند میں گرفتار کئے گئے حزب التحریر کے رکن رستم نور بایوف کو شدید تشدد کا نشانہ بنا کر' نظر بندی کے مرکز میں' پانچ دن میں ہی ہلاک کر دیا گیا۔ امان اللہ نذیروف...... جنہیں1999ء میں حزب کا رکن قرار دے کر سزا سنائی گئی تھی...... دسمبر2000ء میں نوائی کی جیل میں وفات پا گئے۔ 15 ستمبر2000ء کو تاشقند میں عدالتی کارروائی کا سامنا کرنے والے حزب کے پندرہ اراکین نے دعویٰ کیا کہ انہین زدوکوب کیا گیا' بجلی کے جھٹکے لگائے گئے اور اعتراف جرم کرانے کے لیے انہیں گارڈز کے ذریعے جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ جج نے ان کے بیانات کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ انہیں

بارہ سے سولہ سال تک کی سزائیں سنا کر جسلیک جیل بھجوا دیا گیا۔''پولیس گرفتاریوں کو جائزہ قرار دینے یا رشوت لینے کے لیے عام لوگوں کو منشیات کی معمولی مقدار' ہتھیار' اسلحہ یا اسلامی لٹریچر رکھنے اور رنگے ہاتھوں پکڑنے کا باقاعدہ ڈرامہ رچاتی ہے۔ اس غیر قانونی کارروائی کا سب سے زیادہ اور مسلسل نشانہ حزب التحریر کے مشتبہ اراکین کو بنایا جاتا ہے۔''یہ ہیومن رائٹس واچ کی ہولی کارٹر کی رپورٹ ہے۔

حزب کی عمومی سرگرمیوں کے متعلق کوئی خاص اطلاعات نظر نہیں آتیں اور اس کے مشتبہ اراکین پر چلنے والے مقدمات بھی ان کی تنظیمی صلاحیتوں اور مقبولیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ 20 جولائی 2000ء کو ویزک کی ایک عدالت نے حزب کے پندرہ اراکین کو سترہ سال قید کی سزا سنائی۔ ان کے رہنما' تیس سالہ معروف ایشونوف کو دو حزبی گروہ چلانے' دوسو افراد کو حامی بنانے اور پمفلٹ کی تقسیم کے الزام میں سزا سنائی گئی۔ اپریل 2000 میں وادی فرغانہ کے 157 افراد کی ایک فہرست' حکومت کی جانب سے جاری کی گئی جنھیں وہ صرف حزب کے پمفلٹس تقسیم کرنے کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اسی جون میں کرغیزستان کے صوبے جلال آباد میں حزب کے 53 اراکین کو تخریب کاری کے الزام میں مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مقدمات کی کارروائی سے پتہ چلا کہ حزب محلّہ مساجد چلا رہی تھی' رات کو پمفلٹ تقسیم کرتی تھی' ہفتہ وار سٹڈی گروپ چلائے جاتے تھے' جہاں چائے وغیرہ کے ساتھ اسلامی موضوعات پر بحث کی جاتی' نماز پڑھی جاتی اور قرآن کی تلاوت کی جاتی۔ یہ محلّہ وار گروپس یا ضیافتیں' ازبک دائرہ کی کرغیزی شکل تھے۔

وادی فرغانہ میں اپنے مختصر مراکز سے' حزب التحریر انتہائی تیزی سے کرغیزستان اور تاجکستان کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔ 2001ء کے موسم گرما تک کرغیز جیلوں میں حزب التحریر کے 150 مشتبہ اراکین قید تھے۔ ان کی زیادہ تر تعداد اوش کے قید خانوں میں تھی۔ 2000ء اور بعدازاں اوش کی عدالتوں میں حزب التحریر کے ملزمان کے مقدمات ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے بعض ملزموں کی عمریں بمشکل اٹھارہ سال تھیں۔ مئی 2000ء میں اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے' حزب کے چار سرگرم حامیوں پر مقدمہ چلایا گیا' جبکہ چودہ دوسرے ملزموں کے خلاف مقدمے کی کارروائی ابھی جاری تھی۔''تمام ملزمان اپنے مقاصد کا برملا اظہار کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وادی فرغانہ میں اسلامی ریاست کی

تشکیل کے مقدس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔'' اوش میں پبلک سکیورٹی کے سربراہ طالفت رزا قوف نے اپنی رائے دی۔ ان نوجوانوں نے اپنے دفتر کو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ کر رکھا تھا۔ وہیں انہیں حزب کے احکامات اور اس کا لٹریچر بذریعہ ای میل موصول ہوتے تھے۔ وہ انہیں کرغیزی زبان میں ترجمہ کرتے اور پھر تقسیم کرنے کے لیے ان کی فوٹو کاپیاں کر لیتے۔ وہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کا استعمال بھی عام کرتے تھے۔ کرغیز نیشنل گارڈ کمانڈر لیفٹننٹ جنرل عابدی چاٹ بایوف نے جون2000ء میں دعویٰ کیا کہ حزب کی خفیہ مشنری سرگرمیوں کا ساتھ دینے کے لیے تین سو کرغیز باشندے افغانستان میں باقاعدہ تربیت لے رہے تھے۔2001ء کے ابتدائی تین ماہ میں حزب کے چالیس مشتبہ اراکین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمات چلائے گئے۔

کرغیزستان میں بڑھتی ہوئی غربت اور عوامی مسائل کے حل میں حکومتی ناکامیوں اور کرپشن کی انتہا پر عوامی ردعمل نے حزب التحریر کی حمایت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ آبادی میں بے تحاشا اضافے نے غربت کے مسئلے کو اور گمبھیر بنا دیا ہے۔2000ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ کرغیزستان کی آبادی 48 ملین ہے جو1991ء کے مقابلے میں13% بڑھ گئی ہے۔ اوش میں اضافے کی شرح23% تک چلی گئی کیونکہ بے روزگار کسانوں کا ایک طوفان شہروں میں اُمڈ آیا ہے۔ بشکیک کی موجودہ آبادی گیارہ لاکھ ہے حالانکہ وہاں ملازمتوں کی صورت حال کوئی خاص خوش گوار بھی نہیں۔2001ء میں ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق 68% آبادی کا گزارہ بمشکل 7 ڈالر فی ماہ کے لگ بھگ تھا اور سالانہ اوسط تنخواہ165 ڈالر کے قریب تھی۔ جبکہ گزارے کی کم از کم سطح کا اندازہ سالانہ295 امریکی ڈالر کے لگ بھگ تھا۔ 1990ء اور1996ء کے دوران' کرغیزستان کی داخلی خام پیداوار47% کم ہو کر' بمشکل آدھی رہ گئی تھی۔ صنعتی پیداوار16% کم ہوگئی۔ زرعی پیدوار35% اور سرمایہ کاری56% کی سطح پر آ گئی۔

تباہ کن غربت اور گھرانوں کی مایوسی کی انتہا کا عالم یہ تھا کہ بین الاقوامی تنظیم برائے مہاجرین کی ایک رپورٹ کے مطابق چار ہزار کرغیز خواتین اور لڑکیوں کو متحدہ عرب امارات' چین' ترکی اور یورپ تک میں جسم فروشی کے دھندے کے لیے فروخت کر دیا گیا۔ ''انسانوں کی سمگلنگ اس وقت کرغیزستان کی سب سے بڑی صنعت بن چکی ہے...... اس نے سیاحت

کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور منشیات کی سمگلنگ کے بعد' اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔'' اس حقیقت کا اظہار کرغیزستان میں اقوام متحدہ کے مشن کے سربراہ ارکان مراد نے کیا۔

غربت نے بہت سے نوجوانوں کو افغانستان سے افیم کی سمگلنگ کی راہ بھی سجھا دی ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جس پر آج کل کرغیزی پریس میں خاصا شور مچا ہوا ہے۔ 1999ء میں کرغیز پولیس نے سمگلروں سے 17ہزار پونڈ ا افیم برآمد کی- اس کے اگلے سال برآمد ہونے والی افیم 26ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام کا دعویٰ ہے کہ پکڑی جانے والی منشیات اس مقدار کا نہایت معمولی حصہ ہیں جو کرغیزستان میں سمگل کر کے' یہاں سے روس اور یورپ تک پھیلا دی جاتی ہے۔ ہیروئین کی عادت بھی ڈرامائی انداز میں بڑھی ہے۔ اگرچہ کرغیزستان میں صرف4500 نشے کی لت میں مبتلا افراد رجسٹرڈ ہیں' تاہم غیر سرکاری اداروں کے اندازے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار افراد منشیات کا شکار ہیں۔ ان میں سے منشیات کے عادی کئی افراد ایڈز کی لپیٹ میں بھی آ گئے ہیں۔ مارچ 2001ء میں ایڈز کی روک تھام کے لیے جب ایک یورپی این جی او نے کنڈومز کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی تو حزب نے اس کی مخالفت میں احتجاجی پمفلٹس شائع کئے کہ وہ این جی او دراصل جسم فروشی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہے-

کرغیزصدر آقایوف نے اعتراف کیا ہے کہ عوامی غربت میں اضافے سے مذہبی انتہا پسندی کو تقویت حاصل ہو رہی ہے لیکن حکمران طبقے میں روز افزوں کرپشن کے خاتمے اور عوامی مسائل کے حل کے لیۓ وہ کچھ بھی کرتے نظر نہیں آتے ''انتہا پسند کرغیزستان کو ایک عبوری علاقہ سمجھتے ہیں۔ وہ اسلام کی جغرافیائی وسعت اور ریاست کی تشکیل یعنی خلافت کے لیے وادی فرغانہ تک رسائی کو اپنا اہم مقصد گردانتے ہیں۔ انہیں کرغیزستان اور تاجکستان میں غربت اور دوسرے سماجی مسائل کا اچھی طرح علم ہے۔ ان کی تمام تر توجہ مقامی آبادی کی حمایت کے حصول پر ہے۔ اعلیٰ اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کے لیے عوامی حمایت قطعی کوئی حادثہ نہیں۔ انہیں پیسے کا لالچ بھی دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو سبز ڈالر کا نوٹ دکھائیں تو وہ حرص اور لالچ کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ ہمیں فوراً ہی اس پر قابو پانا چاہیے۔'' آقایوف نے یہ بات مئی2001ء میں ایک روسی اخباری نمائندے کو بتائی۔

کرغیزستان کا ایک اور مخصوص مسئلہ اسلام پسندوں کے غصے کو مزید بھڑکا رہا ہے۔ ملک کی سترہ فیصد آبادی عیسائی ہے اور روسی نسل کے لوگوں کو یہاں آباد رکھنے کے لیئے آقایوف نے روسی آرتھوڈاکس چرچ کو مقامی طور پر چرچوں کی تعمیر وتوسیع کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ دریں اثنا کرغیزستان وسط ایشیا کا واحد ملک ہے جہاں مختلف عیسائی تحریکوں کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع فراہم کیا گیا ہے۔ یہ رعایت حزب التحریر کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ اور توہین انگیز ہے۔ ان قوموں کے درمیان نسلی اور مذہبی منافرت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے جو کبھی انتہائی امن وآشتی سے اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اوش صوبے میں کرغیزوں اور ازبکوں کے درمیان نسلی رقابتیں ہمیشہ سے ہی موجود ہیں۔ یہاں ازبک آبادی کا25% ہیں (اور اوش شہر میں 40%)۔ وسط ایشیا کا سب سے مقدس مقام اور عوامی زیارت گاہ تخت سلیمان بھی اوش شہر میں ہی واقع ہے۔ ازبک اور کرغیز سرحدی کشمکش کی وجہ سے یہاں تک عوامی رسائی بھی ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ شمال میں کرغیزوں اور روسی نسل کے آباد کاروں کے مابین مذہبی اور نسلی کشمکش جاری ہے۔ ''کرغیزستان کے شمالی حصّے میں عیسائیت کی تبلیغ کا عمل جنوبی علاقوں میں اسلامائزیشن کی کاروائیوں کے مقابلے میں جاری ہے۔'' یہ خیالات انارہ طیبشالیوا نامی ایک کرغیز خاتون سماجی سائنٹسٹ کے ہیں۔

کرغیزستان میں اسلامی انقلاب پسندی کی ابھی کوئی لہر نہیں آئی تاہم حزب التحریر یہاں آہستہ آہستہ مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ پہلی دفعہ قازق پولیس نے جنوبی علاقوں میں حزب کے سرگرم کارکنوں کی گرفتاری کی رپورٹ دی ہے۔ ادھر کرغیز پولیس نے بھی قازق حزب کے کئی کارکنوں کو کرغیزستان میں گرفتار کیا ہے۔ 6 جولائی کو قازقستان کے سب سے بڑے شہر الماتے کے ہزاروں لیٹر باکسز(Boxes) میں حزب التحریر کے اشتہار دکھائی دیئے، جس نے سکیورٹی اداروں اور عوام دونوں کو ہی چونکا دیا۔ اس دن کا چناؤ اس لئے کیا گیا کہ وہ صدر نذربایوف کا سرکاری یومِ پیدائش تھا۔ انہوں نے چند ہفتے پہلے ہی اسلامی انقلاب پسندی کے خلاف، اپنے عوام کو مزاحمت پر اکسایا تھا۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے بصد اصرار یہ کہا: ''بعض لوگوں کے دلوں میں یہ امید جاگ رہی ہے کہ ہماری ریاستوں کے مسلمان عوام ان کی انقلاب پسندی کی حمایت کریں گے اور مذہبی رہنما ہمیں دوبارہ ازمنۂ وسطیٰ میں لے جائیں گے۔ عورتوں کے چہروں پر نقاب ہوگا اور لوگ لمبی لمبی داڑھیاں رکھیں

گے- اس قسم کا انقلاب تاجکستان جیسے کسی ایک ملک میں تو کامیاب ہوسکتا ہے مگر یہ محض اس کی شروعات ہوگی-'' جنگ کے نتیجے میں عوامی تباہ حالی کے باوجود حزب شمالی تاجکستان میں مقبول ہوتی جارہی ہے-2000ء میں تاجکستان میں حزب کے سو سے زیادہ مشتبہ اراکین کو گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمات چلائے گئے- اگلے سال یہ تعداد دگنی ہوگئی- جب میں نے علی سے استفسار کیا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ خوہند میں حزب کے بیس ہزار حامی موجود ہیں اور ان کی مدد سے حزب اب وادی فرغانہ کے جنوبی علاقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی ہے- اپریل 2001ء میں، چکالودسک (صوبہ سغد) کے ایک گیراج میں ایک ہزار پانچ سو کتابیں اور پندرہ سو پمفلٹ ملے اور حزب کے پندرہ مشتبہ اراکین بھی گرفتار کئے گئے- دارالحکومت دوشنبہ بھی حزب کی سرگرمیوں کے اثرات سے باہر نہیں-26 سے 40 سال تک کے پانچ حزبی کارکن، 16 نومبر 2000 کو حزب کے پانچ ہزار اشتہار رکھنے کے الزام میں، دو شنبہ میں گرفتار کئے گئے- تاجک حکومت واضح خطرات محسوس کر رہی ہے اور جواباً اس نے نسبتاً معتدل مزاج جماعتِ احیائے اسلام کو اسلامی تبلیغ اور اسلامی تعلیمی سرگرمیاں خوہند (سغد) صوبے میں شروع کرنے کے لئے کہا ہے، حالانکہ جماعت کا اس علاقے میں کبھی بھی کوئی خاص اثر نہیں رہا- جماعت کے مقامی رہنما ''غیر قانونی جماعتوں اور تحریکوں سے بچنے'' اور ''دہشت گردوں سے ہوشیار رہنے'' کی اپیلیں کر رہے ہیں- اشارتاً، ان کا ہدف صرف حزب ہوتی ہے- جماعت کے رہنما تسلیم کرتے ہیں کہ نوجوان تاجک نسل حزب التحریر میں شامل ہورہی ہے اور ان کی پارٹی انہیں روکنے سے قاصر ہے-''حزب میں شامل ہونے والے بعض لوگ جماعت کے وہ پرانے جہادی ہیں جو امن معاہدے کے بعد، موجودہ فوج کا حصّہ نہیں بننا چاہتے تھے لیکن زیادہ تر ایسے نوجوان ہیں جو خانہ جنگی کے دوران بچّے تھے اور حزب التحریر کے ذریعے پہلی بار اسلامی تعلیمات سے روشناس ہورہے ہیں-'' یہ بات مجھے جماعت کے رہنما محی الدین کبیر نے بتائی-

حزب التحریر اور اسلامی شدت پسندی

مغربی دارالحکومتوں میں اگرچہ تحریک کی سرگرمیوں کے متعلق کوئی زیادہ واقفیت نہیں تاہم حزب کے متعلق تشویش کی ایک لہر ضرور موجود ہے-2000ء کے آخری مہینوں میں،

کلنٹن انتظامیہ کے انٹیلی جنس ماہرین کے مابین حزب التحریر کو دہشت گردوں کا حامی گروپ قرار دینے کے سلسلے میں اچھی خاصی بحث ہوتی رہی- بالآخر واشنگٹن نے ایسے کسی بیان سے احتراض کیا کیونکہ حزب نے کبھی کسی گوریلا کاروائی میں حصّہ نہیں لیا تھا' لوگوں کو اغوا نہیں کیا اور نہ ہی کہیں فوجی تربیت کے کیمپ بنائے- درحقیقت حزب نے ہمیشہ پر امن تبدیلی کی حمایت کی ہے- روس کو بھی حزب کے متعلق خاصی تشویش ہے کیونکہ اسے اس اسلامی تحریک کے روس کے مسلمان علاقوں میں پھیل جانے کا خوف ہے- حزب سے نمٹنے کے لئے روس کا وسط ایشیائی حکومتوں سے بڑا قریبی رابطہ ہے- حزب کے نوجوان انتہا پسندوں کو ازبک اسلامی تحریک کے پرانے انتہا پسندوں کی طرح شدید ریاستی جبروتشدد اور غربت کا سامنا ہے اور حقیقی خوف یہ ہے کہ یہ نوجوان بھی کسی وقت اپنے بزرگوں کی سنی ان سنی کر کے گوریلا جنگ کا آغاز کر سکتے ہیں-

حزب التحریر کے رہنما طالبان، القاعدہ یا ازبک اسلامی تحریک جیسی کسی بھی تحریک کے ساتھ اپنے عمومی تعلق سے صاف انکاری ہیں- ''ازبک اسلامی تحریک ایک علیحدہ تحریک ہے اور ان کے اندر بہت سے رجحانات اور اختلافات بھی پائے جاتے ہیں- ہتھیاروں اور منشیات کے بہت سے سمگلر بھی ازبک اسلامی تحریک کے ساتھ ہیں اور اس بات سے تحریک کی شہرت کو یقیناً نقصان پہنچتا ہے-'' علی نے وضاحت کی- اور ازبک اسلامی تحریک کے بعض اراکین وسط ایشیاء میں روسی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی استعمال ہورہے ہیں- یہ جاننا ناممکن ہے کہ کونسی جماعت زیادہ مقبول ہے____ حزب التحریر یا ازبک اسلامی تحریک- دونوں کا مقصد علاقے میں خلافت کا قیام ہے لیکن ان کے طریقِ کار مختلف ہیں جیسے بعض ڈاکٹر سرجری کا استعمال کرتے ہیں اور بعض جڑی بوٹیوں سے علاج کرنا پسند کرتے ہیں- ازبک اسلامی تحریک کا کہنا ہے کہ وہ صرف کریموف کا تختہ الٹ کے، ازبکستان میں اسلام لانا چاہتے ہیں- لیکن یہ ان کے منصوبے کا پہلا حصّہ ہے- پورے وسط ایشیا کے لئے ان کے کچھ اور مقاصد بھی ہیں-''

بہرحال کئی سوحزبی کارکن فرار ہوکر شمالی افغانستان چلے گئے ہیں، جہاں ازبک تحریک نے ان کا خاصا خیر مقدم کیا ہے- حزب کے کارکن تحریک کے کیمپوں میں رہتے ہیں اور گوریلوں سے فوجی تربیت حاصل کرتے ہیں- کرغیز حکام کی رپورٹ ہے کہ 2000ء کے

موسم گرما میں ازبک تحریک کے حملوں کے دوران، انہوں نے تحریک کے بعض جنگجوؤں کی لاشوں کے ساتھ حزب کا لٹریچر بھی دیکھا- وہ بارہ ستمبر کے ایک واقعے کی مثال دیتے ہیں جس میں، باتکن کے قریب سات ازبک گوریلے مار دیئے گئے تھے- اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں میں مختلف سطحوں پر قریبی تعلق اور رابطہ موجود ہے، خصوصاً جبکہ اراکین کا تعلق ایک ہی گاؤں یا شہر سے ہو-

علی نے تسلیم کیا کہ حزب طالبان کے لئے ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے لیکن ان کی جانب سے کسی بھی طرح کی معاونت سے وہ انکاری ہیں-''حزب افغانستان میں طالبان کی تحریک کی حامی ہے اور بہت سے حزبی کارکن وسط ایشیا میں کریک ڈاؤن سے بچنے کے لئے، افغانستان چلے گئے ہیں-''طالبان کے بعض نظریات بہت اچھے ہیں- وہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کی تشکیل چاہتے ہیں-لیکن ہمارے درمیان اختلاف یہ ہے کہ حزب دنیا میں ایک جدید زندگی چاہتی ہے- دنیا کو جنت بنانے اور یہاں کی زندگی گزارنے کے بعد بھی جنت میں جانے کے لئے لوگوں کو تیار کرنا چاہتی ہے- حزب التحریر دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی جنت چاہتی ہے-'' اگرچہ علی نے بھی، دوسرے حزبی رہنماؤں کی طرح، اسامہ بن لادن کی طرف سے حمایت یا مالی معاونت سے صاف انکار کیا تاہم انہوں نے اس کی تعریف کی- ''بن لادن سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں لیکن وہ وسط ایشیا کی ساری اسلامی تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں اور اس معاملے میں یہاں وہ خاصے معروف ہیں- کرغیز اور ازبک سفارت کاران کے انکار کو تسلیم نہیں کرتے- ان کے مطابق تمام اسلامی تنظیموں کے درمیان گہرے روابط موجود ہیں- وہ کابل میں ستمبر2000ء کی ایک میٹنگ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں طالبان' ازبک تحریک، حزب التحریر، چیچن علیحدگی پسندوں اور بن لادن نے مستقبل کے تعاون کے بارے میں خاصے طویل مذاکرات کئے تھے-

اگرچہ حزب التحریر نے ابھی تک کسی بھی ہنگامہ آرائی میں حصّہ نہیں لیا تاہم علی ایک خطرناک وارننگ دینے سے قطعاً نہیں ہچکچائے-''حزب پر امن جہاد چاہتی ہے- یہ جہاد جنگ کے بجائے وضاحتوں اور باہمی مذاکرات کے ذریعے بڑھتا جائے گا لیکن بالآخر جنگ ہونا ہے کیونکہ وسط ایشیائی حکمرانوں کا جبر وتشدد بڑھتا جارہا ہے اور ہمیں اس کے لئے تیار ہونا پڑے گا- اگر ازبک تحریک اچانک وادی فرغانہ میں نمودار ہوتی ہے تو حزب کے کارکن

چپ چاپ رہ کر، سکیورٹی افواج کو انہیں مار ڈالنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔"

حزب کی یہ وارننگ بھی ہے کہ ازبکستان میں آنے والا بحران حزب کو اقتدار پر قبضے کے بھرپور مواقع فراہم کرے گا۔"کریموف اسلامی تحریک اور روسیوں دونوں کو خوش کرنے کے چکر میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ کریموف کو روسیوں اور اسلام میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا اور روسیوں کو باہر رکھنے کے لئے اسے اسلام کی سمت آنا پڑے گا۔ لیکن اگر روسی فوجیں ازبکستان آجاتی ہیں تو حزب التحریر کے لئے بہت اچھا ہوگا۔ ہر شخص کا پتہ چل جائے گا۔ طاقت کی واضح تقسیم ہوجائے گی اور اس طرح جنگ شروع ہوگی۔" علی کا کہنا ہے۔

دوسرے لوگ بھی اسی طرح کی وارننگ دے رہے ہیں"آمریت پسند حکمرانوں اور مذہب کے درمیان چپقلش نہ صرف انسانی حقوق کے حوالے سے بلکہ ملکی سیاسی اور سماجی ماحول کے اعتبار سے بھی صورتِ حال ابتر کئے جارہی ہے۔ درحقیقت اس طرح کی صورتِ حال ایسی ہی خانہ جنگی کو جنم دے سکتی ہے جیسی ماضی قریب میں افغانستان میں دیکھی گئی۔" یہ وارننگ انسانی حقوق کی آزاد ازبک تنظیم کے اردزینوف کی طرف سے آئی ہے۔ ایک آپشن جس کے متعلق وسط ایشیائی حکمرانوں نے غوروفکر کی زحمت ہی گوارا نہیں کی' یہ ہے کہ حزب التحریر کو قانونی قرار دے دیا جائے اور اسے عام سیاسی پارٹیوں کی طرح سرگرم عمل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ حزب نے ان حکومتوں کا تختہ تشدد کے ذریعے الٹنے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور جماعت کی قانونی حیثیت تسلیم ہونے کے بعد اس کی قیادت کو عوامی جذبات سے کھیلنے اور نعرہ بازی کی بجائے مقامی مسائل کو سمجھنے اور واضح معاشی اور سیاسی حکمتِ عملی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ نیز اس کے قانونی قرار دیئے جانے کے بعد تشدد کے حامی دوسرے اسلامی انقلابی گروہوں سے اس کے روابط میں بھی یقیناً کمی آجائے گی۔ لیکن تاجکستان کے سوا، کوئی دوسری وسط ایشیائی ریاست کسی اسلامی جماعت کو کھلم کھلا کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ جب تک یہ صورت نہیں بدلتی، حزت کے لئے لوگوں میں کشش باقی رہے گی کیونکہ اس کے پروگرام کی جاذبیت کے ساتھ ساتھ، اس کے دفاع اور مزاحمت کی خوشگوار خوشبو اور مہک بھی شامل ہے۔

نیو یارک اور واشنگٹن پر گیارہ ستمبر 2001ء کے حملوں کے جواب میں، افغانستان پر

امریکی بمباری نے صورتِ حال کو اور زیادہ خراب کر ڈالا ہے- ازبکستان اور تاجکستان نے افغانستان میں حملوں کے لئے اپنے ہوائی اڈے امریکی افواج اور فضائیہ کو پیش کرنے کے ساتھ ہی، دونوں حکومتوں نے حزب التحریر پر جبروتشدد کی انتہا کردی ہے- ان کا خیال ہے کہ اتحادی ہونے کے ناطے، اسلامی گروہوں کے خلاف سخت تر کریک ڈاؤن کے باوجود، وہ مغربی تنقید کا نشانہ بننے سے بچ جائیں گے- اکتوبر کے پہلے ہفتے میں، تاشقند کی ایک عدالت نے حزب کے نو اراکین کو غیر قانونی جماعت کا رکن ہونے کے الزام میں سزا سنائی- ان میں سے ہر ایک کو نو سے بارہ سال تک کے لئے جیل بھیج دیا گیا- عدالت نے ایک نہایت اہم قدم یہ اٹھایا کہ انہیں القاعدہ سے تعلق کی بنا پر بھی سزا دے ڈالی- ملزمان نے بن لادن کی جماعت سے کسی بھی طرح کے تعلق سے انکار کیا- ''ہمارا اسامہ بن لادن یا کسی بھی دہشت گرد گروہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہماری جدوجہد کا طریقہ کار ہی دوسری طرح کا ہے- ہم اپنے نظریات کے لئے پرامن طریقوں سے برسرِ پیکار ہیں-'' نوراللہ مجیدوف (حزب کے ایک رہنما) نے وضاحت کی-

حزب التحریر کا بن لادن سے تعلق ظاہر کر کے، حکام امریکہ سے سیاسی قربت کی امید لگائے بیٹھے تھے- ازبکستان تو خاص طور پر حزب التحریر اور دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے مابین تعلق پیدا کرنے کا خواہاں تھا- اس طرح مقامی جابرانہ قوانین اور اس سے کہیں زیادہ اسلامی انتہا پسندوں کے خلاف جابرانہ ازبک ہتھکنڈوں کو منصفانہ قرار دیا جاسکتا تھا- جنگ میں پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ، اپنے ہی عوام کے خلاف انتہائی غیر انسانی سلوک کے لئے مغربی طاقتوں کی حمایت اور خوشنودی کا بے دریغ استعمال انسانی حقوق کے علم برداروں کے لئے، بے حد تشویش کا باعث ہے-

دریں اثنا، حزب کی عرب دنیا سے درآمد شدہ سیدھی سادھی، یک رخی آئیڈیالوجی کو مسلسل عوامی مقبولیت مل رہی ہے کیونکہ انتہائی مصیبت کے وقت لوگ عام سے تنکے کا سہارا بھی غنیمت سمجھتے ہیں- اگرچہ حزب وسط ایشیاء کے پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کوئی ٹھوس

پروگرام پیش نہیں کر رہی تاہم اس کا واضح پیغام یہ ہے کہ خلافت اور اسلامی نظام کا احیاء نہ صرف سارے مسائل حل کر دے گا بلکہ ایک مثالی معاشرے کا قیام بھی ممکن بنادے گا- وسط ایشیا کے پریشان حال نوجوانوں کے لئے' حزب کی واضح اور ناقابل تبدیل سوچ کے مالک سرگرم کارکن____ جن کے بارے میں بہتر حالات میں، کوئی دوبارہ سوچنا بھی گوارا نہ کرتا____ ان کے لئے نجات دہندہ کا روپ دھار چکے ہیں-''اس تمام علاقے میں کمزور معیشتیں شکست وریخت کے عمل سے دو چار ہیں اور حکمرانوں کی آہنی طاقت مٹی میں ملتی نظر آرہی ہے- سابقہ سودیت یونین کے بہت سے حصّے مختتم توقعات کے انقلاب کی براہِ راست زد میں ہیں- جگہ جگہ مسلّح جتھے بن گئے ہیں، ان کی کوئی نظریاتی اساس نہیں- چونکہ دوسرے ذرائع ابلاغ یا تو موجود نہیں یا ناکام ہوچکےہیں، اس لئے جنگ جو کاروائی محض اپنے عدم اتفاق کے اظہار کا ذریعہ بنا لی گئی ہے-'' یہ رائے وسط ایشیا کی صورتِ حال کی ایک تجزیہ نگار پاؤلا نیو برگ کی ہے-

حزب التحریر کے تعلیمی جہاد کے عملی جہاد میں بدل جانے کا خوف' ممکن ہے خود بخو د ایک حقیقت کا روپ دھار لے-

باب 7

نعمان غنی اور ازبک اسلامی تحریک

سودیت یونین کے خاتمے سے کچھ ہی ماہ پہلے، ازبکستان میں اسلامی جہادی نظریے کا احیاء، وادی فرغانہ کے ایک چھوٹے سے زرعی قصبے میں شروع ہوا- اس کی ابتدا پر امن طریقے سے اسلامی شعور بیدار کرنے کے حوالے سے ہوئی لیکن دسمبر میں اس وقت ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی جب نعمان گن میں چند بے روزگار جوانوں نے ازبک کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت پر قبضہ کر لیا- بات صرف یہ تھی کہ انہوں نے مسجد کی تعمیر کے لئے میئر سے زمین مانگی تھی اور میئر نے زمین دینے سے انکار کر دیا تھا- اس واقعے کے بعد وسط ایشیا میں پے در پے ایسے واقعات کا سلسلہ چل پڑا جس نے پچھلے عشرے میں پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا-

ان نوجوانوں کی قیادت، کالج سے نکالا گیا اور خفیہ اسلامی تحریک کا ایک چوبیس سالہ مولوی طاہر عبدالاحد وچ یلدے شیف کر رہا تھا- وہ غضب کا مقرر اور ذہین منتظم تھا- اس کے ساتھ 22 سالہ ایک اور نوجوان تھا جمعہ بھائی احمد زہانو وچ- اس نے بعد میں اپنے آبائی علاقے کا نام اپنے نام کے ساتھ لگا لیا اور جمعہ نعمان غنی بن گیا____ ایک انتہائی کرشماتی اور فعال شخصیت، جسے اس کے گروہ کے دوسرے نوجوان اس کی دلیری اور جرات مندی کی وجہ سے اپنا مثالی ہیرو سمجھنے لگے-1987ء میں نعمانی غنی کو سودیت فوج میں جبراً بھرتی کر لیا گیا- پیراٹروپر کی حیثیت سے انہوں نے افغانستان میں روسی کاروائی کا مشاہدہ کیا- بعد ازاں

انہیں سارجنٹ بنادیا گیا- اسی دوران نعمانی غنی نے افغان مجاہدین کے لئے ___ جن کے خلاف وہ لڑ رہے تھے ___ شدید اپنائیت اور احترام کا جذبہ محسوس کیا- ان کے دوستوں کے مطابق، اس مشاہدے نے انہیں ایک مسلمان کا نیا جنم دیا-

33 سالہ عبدالاحد جیسے کئی جوانوں نے مذہبی تربیت کے لئے سعودی عرب کا سفر بھی کیا تھا- انہیں ٹھیک ٹھاک عربی آ گئی تھی اور وہابی مسلک نے انہیں خاصا متاثر کیا- سعودی وہابی فاؤنڈیشن سے ان کا قریبی رابطہ تھا کیونکہ ان کی سرگرمیوں کے لئے تمام تر مالی امداد وہیں سے آتی تھی- سعودی مالی امداد اور لگ بھگ پانچ ہزار کارکنوں کے ساتھ، اس گروپ نے 1990ء میں نعمان گن میں ایک مسجد اور مدرسے کی تعمیر شروع کی- اس مدرسے میں دو ہزا طلبہ کی رہائش کی گنجائش رکھی گئی- مسجد کے باہر ایک نعرہ لکھا ہوا تھا- ''اسلامی ریاست زندہ باد-'' یلدے شیف نے نعمان گن میں اسلامی تعلیمات کو سختی سے نافذ کرنا شروع کر دیا- مثلاً لوگوں کو باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی اور خواتین کو رنگ برنگے ازبک ملبوسات پہننے سے روک دیا گیا- نیز انہیں خود کو سرے پاؤں تک چھپانے کے لئے برقعہ پہننے کی ہدایت کی گئی- جرائم کے مقابلے کے لئے محلّہ وار نگران کمیٹیاں بنائی گئیں: نگران امن وامان قائم رکھتے اور دوکانداروں کی بلاوجواز قیمتوں میں اضافے پر بھی نظر رکھتے- یلدے شیف نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ صدر کریموف ازبکستان میں شریعت نافذ کریں اور ساتھ ہی نعمان گن کے مسائل پر گفتگو کی دعوت بھی دی- کریموف اپریل 1991ء میں ان جہادی لوگوں سے بات کرنے آئے بھی مگر ملاقات جلد ہی ہنگامہ آرائی کا شکار ہوگئی-

یلدے شیف نے بعض ناممکن مطالبات کر ڈالے ___ مثلاً کریموف ازبکستان کو اسلامی ریاست قرار دے دیں اور زیادہ سے زیادہ مساجد اور مدرسے بنائے جائیں- غم وغصّے اور توہین کے شکار کریموف نے وعدہ کیا کہ ان مسائل پر پارلیمنٹ میں غور کیا جائے گا اور وہاں سے چلے گئے- خرابی کی بنیاد پڑ چکی تھی- سال کے آخر میں، یلدے شیف نے ازبک کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا اور ایک ایسی تحریک کی ابتداء کر دی جسے انہوں نے کریموف کی حکومت کے خاتمے کے لئے جہاد سے موسوم کیا-

وسط ایشیاء میں مسلح اسلامی جدوجہد کی ابتداء

یلدے شیف کے پیروکار، حال ہی میں تشکیل دی گئی جماعت احیائے اسلام ازبکستان کے رکن بھی تھے۔ لیکن اسلامی ریاست کے مطالبے سے دست برداری کی وجہ سے وہ اپنی جماعت سے بد دل ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے عدالت پارٹی بنا ڈالی جو اسلامی انقلاب کی داعی تھی۔ ''جماعتِ احیائے اسلام حکومتی ایجنٹ ہے اور وہ پارلیمنٹ میں جانا چاہتی ہے۔ ہمیں پارلیمنٹ میں جانے کا کوئی شوق نہیں۔ ہم یہاں اور ابھی اسلامی انقلاب کے خواہاں ہیں۔ آئینی کھیلوں کے لئے ہمارے پاس کوئی وقت نہیں۔'' احد نے یہ بات مجھے اس روز بتائی، جس روز میں نے ان کے ساتھ نعمانی گن کی مسجد میں ایک پورا دن گزارا۔ وہ اس مسجد کے امام تھے۔ عدالت کے زیرِ اہتمام چلنے والے مساجد اور مدارس جلد ہی پوری وادی فرغانہ کے طول وعرض ـــــ آندیان، مارگیلان، کووا، فرغانہ شہر ـــــ اور کرغیزستان کے شہر اوش تک پھیل گئے۔ انہوں نے جماعت احیائے اسلام کے اثر ورسوخ کو خاصا نقصان پہنچایا۔ توبہ، اسلام لشکر لاری اور حزب اسلامی جیسے کئی اور جہادی گروپ بھی وادی فرغانہ میں نمودار ہونے لگے۔

ان جہادی گروہوں اور دوسری اسلامی جماعتوں یا جماعتِ احیائے اسلام کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ سرکاری اسلام کا کوئی احترام نہیں کرتے تھے، روایات کی پاسداری ان کے نزدیک فضول تھی اور انہیں سیاسی حکومتوں کا بھی کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ ان کی رجائیت پسندی کے مطابق، یہ حکومتیں کسی بھی وقت ڈھے سکتی تھیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک وقت حکومتی مشینری بالکل بے بس اور مفلوج لگتی تھی۔ وہ انقلاب پسندوں کے خلاف نہ تو پولیس کو کھڑا کرسکتی تھی اور نہ ہی ریاستی کنٹرول میں موجود اسلامی تنظیموں کو ان کے مقابلے میں لاسکتی تھی۔ سودیت دور میں نعمان گن میں صرف تین مسجدیں تھیں اور اب ایک سوتیں ہوگئی ہیں۔ ان سب مساجد پر جہادی گروہوں کا قبضہ ہے۔ان نئی مساجد میں عبادت گزاروں کا خاصا رش ہوتا ہے اور مدارس ، لڑکے لڑکیوں سمیت، طلبہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض مدارس میں تو قرآن مجید، اسلامی قانون اور تاریخ پڑھانے کے لئے تین شفٹیں چلائی جارہی ہیں۔ ''سب سے پہلے وادی فرغانہ، پھر ازبکستان اور بالآخر پورے وسط ایشیا کو

ہم یقینی طور پر ایک اسلامی ریاست بنائیں گے۔'' احد نے مجھے بڑے جوش وخروش سے بتایا۔

کچھ عرصے تک حکومت نے نعمان گن میں یلدے شیف کے قبضے کو برداشت کیا۔ تاشقند میں حکومتی وزراء نے مجھے بتایا کہ بنیادی طور پر وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ مسلح گروہ کون ہیں اور چاہتے کیا ہیں___ وہ وہابی مسلک کے متعلق بھی قطعی لاعلم تھے۔ بالآخر حکومت نے مارچ 1992ء میں عدالت پارٹی پر پابندی لگا کر کریک ڈاؤن کی ابتداء کردی اور تقریباً ستائیس آدمیوں کو گرفتار کرلیا تاہم مساجد اسی طرح اپنے معمولات میں لگی رہیں۔ عدالت پارٹی کے رہنما یلدے شیف اور نعمانی غنی تاجکستان فرار ہوگئے اور تاجک جماعتِ احیائے اسلام میں شامل ہوگئے۔ وہ جماعت خانہ جنگی کی تیاریاں کررہی تھی۔

ایک مختصر عرصے کے لئے یلدے شیف نے دوشنبہ میں تاجک جماعتِ احیائے اسلام کے رکن اور تاجکستان کے مفتی قاضی اکبر طورا جان زادہ کے مدرسے میں تربیت حاصل کی۔ جنگ کے آغاز کے بعد، یلدے شیف نے جماعتی رہنماؤں کے ساتھ افغانستان کا رخ کیا۔ کچھ عرصہ انہوں نے طالقانمیں___ جو ایام جلا وطنی میں جماعت کا مرکز تھا۔ جماعتی پراپیگنڈے کے فروغ میں جماعت کی مدد بھی کی۔لیکن دل چونکہ ازبکستان کی اسلامی تحریک میں اٹکا ہوا تھا اس لئے یلدے شیف نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ وہ پہلے پاکستان آئے پھر سعودی عرب گئے۔ بعد ازاں وہ ایران، متحدہ عرب امارات اور ترکی بھی گئے۔ وہ اسلامی تحریکوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے اور مختلف اسلامی جماعتوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے۔

یلدے شیف نے ان ممالک کی انٹیلی جینس ایجنسیوں سے بھی رابطے کئے اور ان سے مادی معاونت طلب کی۔ پاکستانی آئی۔ ایس۔ آئی جو افغان سوویت جنگ میں برسرکار رہ چکی تھی اور بعد میں طالبان کی حمایت کررہی تھی___ نے انہیں نہ صرف مالی معاونت فراہم کی بلکہ مکمل تحفظ بھی فراہم کیا۔1995ء سے1998ء تک یلدے شیف نے پشاور کو اپنا مرکز بنائے رکھا۔ پشاور اس وقت صرف پاکستانی یا افغان اسلامی سرگرمیوں کا ہی نہیں بلکہ تمام پان اسلامک جہادی گروہوں کا مرکز تھا، یہیں یلدے شیف کی ملاقات ''عرب افغانوں'' سے ہوئی (یہ وہ عرب تھے جو سوویت یونین کے خلاف جہاد کرنے افغانستان آئے تھے اور

بعد میں اسامہ بن لادن کے ہمراہ یہیں بس گئے) انہیں عربوں کی وساطت سے ان کی ملاقات بن لادن اور دوسرے افغان گروہوں سے ہوگئی- پاکستان کی جمیعتِ علمائے اسلام نے ___ جس نے بعد ازاں طالبان کی زبردست حمایت کی ___ پشاور میں یلدے شیف کے لئے فنڈز فراہم کئے اور ان کے ازبک نوجوانوں کو اپنے مدرسوں میں تعلیم وتربیت کے لئے بلا لیا-1996ء میں، میں نے پشاور سے کراچی تک پھیلے ہوئے ان مدارس کا دورہ کیا وہاں اساتذہ نے ان کے لئے خصوصی کلاس رومز کا معائنہ کرایا، جہاں مترجمین کے ذریعے وسط ایشیا کے سینکڑوں طلبہ کو تعلیم دی جاتی تھی- ان طلبہ کی اکثریت کا تعلق ازبکستان کی عدالت پارٹی اور تاجکستان کی جماعت احیائے اسلام سے تھا- تاہم چند طلبہ قازق، کرغیز اور چینی علاقے اوئی غر کے بھی تھے-

روسی اور ازبک حکام کا دعویٰ ہے کہ یلدے شیف نے سعودی عرب ، ایران اور ترکی کے خفیہ اداروں سے بھی مالی امداد حاصل کی- ان ممالک کے اسلامی خیراتی اداروں اور تنظیموں سے بھی ان کا رابطہ تھا- بسماچی بغاوت کے دوران وسط ایشیا سے فرار ہو کر سعودی عرب میں پناہ لینے والے بہت سے ازبک افراد اب باقاعدہ سعودی شہری اور کٹر وہابی تھے- یلدے شیف نے ان سعودی ازبکوں کی تجارتی برادری سے، ایک ایسے بااثر تاجر کے ذریعے مالی عطیات وصول کئے، جس کے بعض سعودی شہزادوں بشمول سعودی خفیہ اداروں کے سربراہ ترکی الفیصل سے بھی تعلقات تھے- مکّہ میں موجود سعودی ازبک نیٹ ورک کریموف سے شدید متنفر تھا کیونکہ ان کے خیال میں وہ ایک ناقابلِ اصلاح کمیونسٹ تھا- سو ازبک اسلامی تحریک کے قیام کے بعد، یلدے شیف کے لئے سعودی عطیات میں گرانقدر اضافہ ہوگیا-

یلدے شیف نے کا کیشیا کا بھی دورہ کیا جہاں انہوں نے1994ء اور1996ء کے دوران روس کے خلاف پہلی چیچن جنگ کے باغی کمانڈروں سے میل جول پیدا کیا اور اس طرح خود کو ازبکستان میں اسلامی انقلاب کے ترجمان،عملیت پسند اور روحانی رہنما کے طور پر منوالیا- ترکی میں انہوں نے ابھرتی ہوئی اسلامی بنیاد پرست تحریکوں کے کارکنوں سے ملاقاتیں کیں اور بہت سی ایسی اسلامی تنظیموں سے مالی امداد حاصل کی جو وسط ایشیا میں اسلامی مقاصد کو ترکی اسلامی نصب العین سے ہم آہنگ سمجھتی تھیں-بعض ذرائع کے مطابق، یلدے شیف پشاور سے ازبکستان کے خفیہ دوروں پر بھی جایا کرتے تھے- یہ1990ء کے

عشرے کے آخری حصّے کا قصہ ہے- ان کا سفر عموماً جعلی پاسپورٹ اور غیر قانونی دستاویزات پر ہوتا تھا- پاکستانی مذہبی جماعتیں اور سعودی تاجر ان کی مالی معاونت کرتے تھے- انہی دوروں کے دوران انہوں نے وادی فرغانہ اور تاجک سرحد کے قریب جنوب مشرقی ازبکستان میں سرخند دریا کے علاقوں میں عدالت پارٹی کے خفیہ مراکز کی اہمیت کو سمجھنا شروع کیا-وسط ایشیا میں ازبک اسلامی تحریک کی، پانچ سال بعد شروع ہونے والی گوریلا جنگ میں، یہ مراکز انتہائی اہم کردار ادا کرنے والے تھے-

ایک سابقہ سرگرم تاجک سیاست دان (جو جماعت احیائے اسلام کے حامی تھے) آج کل دوشنبہ میں ایک مغربی این جی او سے منسلک ہیں اور اپنے نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے- ان کے مطابق نعمان غنی نے1992ء میں ازبکستان چھوڑ دیا اور اپنے تیں ازبک جہادی ساتھیوں اور چند عربوں کے ساتھ، جنوبی تاجکستان میں کرگان طیّب کے علاقے میں آ گئے- ان کے عرب ساتھی سعودی اسلامی فاؤنڈیشنز اور عدالت پارٹی کے مابین رابطہ کا کام دے رہے تھے-

''چند ہی ماہ میں نعمان غنی کے ساتھیوں میں دو سو ازبک بھی شامل ہوگئے- جو وادی فرغانہ میں کریک ڈاؤن کی وجہ سے، وہاں سے بھاگ نکلے تھے- افغانستان کی خانہ جنگی سے دل برداشتہ بہت سے عرب مجاہدین بھی افغانستان سے، ان کے ساتھ آ ملے-'' یہ بات ایک ایسے تاجک ذریعے نے کہی جس کی نعمان غنی سے پہلی ملاقات1992ء میں ہوئی تھی- ''سابقہ سوویت فوجی ہونے کے ناطے نعمان غنی کو سوویت حربوں اور اور اس کے خصوصی دستوں کا اچھی طرح پتہ تھا- یہ بات جماعت احیائے اسلام کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی کیونکہ اس کا سامنا سوویت تربیت یافتہ تاجک افواج سے تھا-نعمان غنی کو مختلف بموں کی ساخت، بارودی سرنگوں اور دوسرے جنگی ساز و سامان کے استعمال کا بخوبی علم اور تجربہ تھا چنانچہ انہوں نے ان کا ماہرانہ اور بروقت استعمال کیا-سعودیوں سے مالی امداد مل رہی تھی اور افغانوں سے ان کا قریبی رابطہ تھا، سو نعمان غنی کبھی بھی اکیلے نہیں تھے-''

جماعتِ احیائے اسلام نے تاجک گوریلوں کو نعمانی غنی گروہ سے منتھی کر دیا اور انہیں وادی طویل دارا بھیج دیا-1993ء کے بعد یہی جگہ انکا مرکز بن گئی اور آج بھی ازبک اسلامی تحریک کا وسط ایشیا میں' سب سے اہم مرکز ہے-

خانہ جنگی کے دوران نعمانی غنی طویل دارا شہر سے دو دفعہ بے دخل ہوئے اور دوبار ہی انہوں نے اس پر قبضہ بھی کیا۔ انہوں نے وادی کراتے جن اور گورنو بدخشاں میں بھی حکومتی افواج سے شدید جنگ کی۔1993ء میں نعمان غنی نے ہبور باط نامی درے میں خانہ جنگی کی سب سے بڑی لڑائی لڑی۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بیرونی عناصر کو مسلسل اپنی جانب متوجہ رکھا۔خصوصاً افغانستان میں موجود عرب اس صورتِ حال سے بہت متاثر تھے۔ وہ وسط ایشیاء میں اس نئی جنگ کو ایک ایسا عظیم جہاد سمجھ رہے تھے جو سابقہ سوویت یونین کے عین قلب میں اسلامی انقلاب کو جنم دے گا۔ اسی اثنا میں نعمان غنی کی جماعت احیائے اسلام کے تمام رہنماؤں سے قریبی واقفیت ہوگئی۔ بہت سے لوگ ان کے انتہائی قریبی دوست بن گئے اور جب اسلامی ازبک تحریک نے ازبکستان پر حملے کا آغاز کیا تو وہ نعمان غنی کے ساتھ تھے۔جماعتِ احیاکے بعض سابقہ فوجی کمانڈر مثلاً حکیم قلندروف____ جنہوں نے نعمانی غنی کے ساتھ طویل دارا میں مزاحمت کی قیادت کی تھی۔ اب دوشنبہ میں مخلوط حکومت میں اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔1996ء میں نعمان غنی جماعتی فوج کے چیف آف سٹاف مرزا ضیاؤیوف____ سید عبداللہ نوری کے بھتیجے____ کی ماتحتی میں آ گئے۔ جلد ہی ان میں بے حد گہری دوستی ہوگئی۔ ضیاء دوشنبہ کی مخلوط حکومت میں وزیر ایمرجنسیز ہیں لیکن آج بھی نعمان غنی انہیں ''بابا'' (بڑا بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ افغانستان سے تاجکستان پر نعمان غنی کے آخری حملے کے دوران، ضیاؤیوف نے دوشنبہ حکومت اور نعمانی غنی کے مابین مذاکرات کے دوران انتہائی کٹھن کردار ادا کیا تھا۔

اس وقت نعمان غنی کے واقف جماعت احیاکے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ نعمان غنی اپنے فوجیوں سے بھرپور وفاداری اور سخت نظم وضبط کے قائل تھے۔ وہ لوگوں کو متحرک کرنے کی خصوصیت کے حامل شاندار مقرر ہیں لیکن فطرتاً وہ غصیلے، جذباتی اور آمریت پسند ہیں۔ جماعت کے رہنما دوشنبہ حکومت سے سیاسی مذاکرات کو تقویت دینے کے لئے جب بھی فوجی حکمت عملی کو اس سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تو ایسے احکامات کو نعمان غنی عموماً اہمیت نہیں دیتے تھے۔نعمان غنی نے تاجک زبان بھی سیکھی تاہم انہیں اس پر عبور نہیں ہے۔ انہوں نے ایک ازبک خاتون سے شادی کی جن سے ان کی ایک بیٹی ہے۔ دوران جنگ وہ افغانستان بھی آئے جہاں انہوں نے صدر ربانی اور احمد شاہ مسعود سے ملاقات کی۔ تاہم وہ حکمت یار کے

وفادار شمالی افغانستان کے پختون کمانڈروں سے بھی ملے جو کابل حکومت کے مخالف تھے۔ عزت اللہ سعدولیف، جو خانہ جنگی کے دوران، طالقان کے مرکزی دفتر کو چلا رہے تھے، کے مطابق نعمان غنی حکمت عملی کی تیاری، رسد کی فراہمی اور جماعت کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کے لئے، اکثر جماعتی ہیڈ کوارٹر آیا کرتے تھے۔

نعمان غنی کے پرانے دوستوں اور اتحادیوں میں سے کوئی بھی انہیں اسلامی فہم اور آگہی کا حامل نہیں سمجھتا۔ ''وہ بنیادی طور پر گوریلا لیڈر ہے، اسلامی عالم نہیں اور وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے جلد ہی متاثر ہوجاتا ہے جیسے آج کل وہ طالبان اور اسامہ بن لادن سے متاثر ہے۔'' یہ بات جماعت کے رہنما نوری کے اسسٹنٹ محی الدین کبیر نے کہی۔ کبیر جماعت کے دوشنبہ حکومت سے مذاکرات کے دوران جماعت کے بین الاقوامی قانون کے مشیر تھے۔ ''وہ ایک اچھا آدمی ہے مگر اس میں کسی طرح کی بھی گہرائی یا ذہانت نہیں۔ اس کی موجودہ شکل میں اسلامی نظریئے کی بجائے اس کے اپنے فوجی اور سیاسی تجربات و مشاہدات کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ بہرحال وہ ازبک حکومت سے شدید متنفر ہے___ اور یہی نفرت اسے متحرک کئے ہوئے ہے۔ ایک طرح سے یہ قیادت زبردستی اس کے سر منڈھی گئی کیونکہ کوئی اور کریموف کی مخالفت کا رسک لینے کا خواہاں ہی نہیں تھا۔''

جب1997ء میں تاجک خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا تو نعمان غنی نے جنگ بندی اور امن معاہدے کی مخالفت کی۔ ''نعمان غنی نے جنگ بندی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ جب جماعت احیا نے جہاد کو روکنے کا حکم دیا تو اس میں اتنی سیاسی لچک بھی نہیں تھی کہ وہ کسی خاص موقعے پر صلح کی اہمیت کا ادراک کر سکے۔'' کبیر نے مجھے بتایا۔ ''جماعت احیائے اسلام کے لئے عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگئی کیونکہ یہاں ایک ایسا غیرملکی جماعت کے لئے لڑ رہا تھا جو جماعتی رہنماؤں کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔'' نعمان غنی سے واقف ایک اور جماعتی کمانڈر نے کہا۔ بہرحال نعمان غنی کو پہاڑوں سے نیچے لانے کا کام ضیاؤیوف کے سپرد کر دیا گیا۔ بالآخر نعمان غنی مان گئے۔ انہوں نے اپنے زیادہ تر دستوں کو منتشر کر دیا مگر ازبکوں کے ایک مخصوص گروہ اور کچھ گوریلوں کو طویل دارا وادی میں، اپنے کیمپ میں رکھ لیا۔

نعمان غنی وادی کراتے جن میں گارم کے ایک چھوٹے سے شمالی قصبے ہائت میں مقیم

ہو گئے- انہوں نے وہاں کرغیز سرحد کے قریب واقع ایک سڑک کے ساتھ بڑا سا ایک فارم خریدا، جہاں وہ اپنی بیوی، بچی اور تقریباً چالیس ازبکوں اور چند عربوں کے ساتھ رہنے لگے- کچھ عرصہ کاشتکار کی حیثیت سے گزارنے کے بعد،نعمان نے گارم کے کسی ٹرانسپورٹر کے ساتھ کاروباری شراکت کر لی- جلد ہی کئی ٹرک ان کی ملکیت میں آ گئے جو دوشنبہ تک سامان لے جایا کرتے تھے-بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ ان دنوں نعمان____ افغانستان سے تاجکستان، وہاں سے روس اور بالآخر یورپ تک____ ہیروئن کی نقل وحمل میں بری طورح ملوث ہو گئے تھے- انکی کوشش تھی کہ اپنی تنظیم کو جاری رکھنے اور ہائت میں بڑھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی ضروریات کے لئے زیادہ سے زیادہ فنڈز اکٹھے کئے جائیں-

''اب وہ کاروباری بھی تھا اور زمیندار بھی لیکن روزانہ سارے ازبکستان____ وادی فرغانہ، تاشقند، سمرقند____ سے لوگ اس کے پاس آیا کرتے تھے اور کریموف کے ظلم وستم اور تشدد کے واقعات سنایا کرتے-'' یہ بات گارم کے ایک تاجر نے بتائی جو ہر ہفتے نعمان سے ملنے ان کی ہائت والی رہائش گاہ جایا کرتا تھا-''ازبک وہاں آتے، کچھ دن ٹھہرتے- وہ ان کی خاطر تواضع کیا کرتا تھا-وہ اسے اکساتے رہتے- اٹھو، کچھ نہ کچھ کرو، وطن میں حالات بہت مخدوش ہیں اور تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو-'' اس نے مجھے بتایا-

نعمان غنی کے اسی زمانے کے ایک اور دوست نے، جو آج کل گارم میں سماجی کارکن ہے، بتایا کہ نعمان غنی اسے کہا کرتا تھا-''واپسی کا میرے پاس کوئی راستہ نہیں- مجھے آگے ہی جانا ہے تاکہ جنگ کو جاری رکھا جاسکے- ازبکستان میں قوم میرا انتظار کر رہی ہے-'' نعمان غنی کا فارم جلد ہی اسلامی انقلابیوں کا مرکز بن گیا کیونکہ جنگ بندی سے مایوس ازبک، عرب، چیچن اور تاجک وہاں آتے تو ان کی اچھی طرح مہمان داری کی جاتی تھی-''1999ء میں نعمان غنی کے افغانستان جانے تک، لگ بھگ دوسو افراد وہاں مقیم تھے اور بعض لوگوں کے تو بیوی بچے بھی ساتھ ہی تھے- ان میں سے اکثریت ازبکوں کی تھی تاہم عربوں اور وسط ایشیا کے دوسرے نسلی گروہوں کی بھی ایک خاصی تعداد نعمان غنی کے اس یقین کی پوری طرح حامی تھی کہ وہ دراصل اسلامی بین الاقوامیت کی سوچ کے حامل رہنما ہیں- مقصد کی آگہی نے انہیں مزید تقویت بخشی-

ازبک اسلامی تحریک کا قیام

اس اثناء میں یلدرے شیف، ہائت میں نعمان غنی سے ملنے کے لئے،1997ء میں تاجکستان واپس آئے- دونوں ہی کے لئے یہ ایک فیصلہ کن گھڑی تھی- انہیں علاقے میں ایک نئی سیاسی صورتِ حال کا سامنا تھا، جو سراسران کے خلاف جارہی تھی- انہیں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنا تھا- تاجک خانہ جنگی ختم ہوچکی تھی- پہاڑوں میں واقع ان کے مراکز کا صفایا ہوچکا تھا، افرادی قوت ان کے پاس نہیں تھی اور اسلحہ وہ جنگ بندی کے وقت، خودحکومت کو دے بیٹھے تھے-ان کے جماعتی اتحادی جنگ بندی کے حامی تھے اور چند ازبک باغیوں کی حمایت کر کے اسے توڑنا نہیں چاہتے تھے-

افغانستان میں ربانی اور مسعود کو طالبان نے کابل سے نکال دیا تھا اور مسعود جو کبھی جماعتِ احیاء کے اتحادی تھے اب انتہائی سرگرمی سے تاجکستان میں قومی یک جہتی کی حامل نئی حکومت کو تقویت دے رہے تھے- علاوہ ازیں ازبکستان میں حالات اور بھی بدتر ہوتے جارہے تھے- اہم اسلام پسند رہنما نظروں سے اوجھل ہوچکے تھے- اگست1995ء میں اندیجان کے امام اعظم شیخ عبدالولی مرزایوف، بذریعہ ہوائی جہاز تاشقند سے ماسکو جانا چاہتے تھے کہ انہیں ان کے معاون سمیت غائب کردیا گیا-ستمبر1997ء میں شیخ کے ایک اور اسسٹنٹ کو غائب کردیا گیا- مارچ1998ء میں عابد خان نذروف، تخت بائی کی مسجد کے امام، اپنے تیرہ سالہ بچے سمیت غائب ہوگئے- ان سب افراد کے بارے میں شبہ ہے کہسکیورٹی دستوں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد، انہیں مارڈالا گیا- تاہم ازبک حکومت خودکوان کے غائب ہونے کےسلسلے میں بری الذمّہ قرار دیتی ہے-

2دسمبر1997ء کونعمان گن میں ایک فوجی کیپٹن کوقتل کرنے اور اس کے دفتر کے باہر اس کے سر کی نمائش کے واقعے کے بعد، کریموف نے ازبکستان میں اسلام پسندوں کے خلاف ایک اور زبردست کریک ڈاؤن شروع کر دیا- گیارہ دسمبر کواجتماعی کاشت کاری کے ایک فارم کے سابقہ چیرمین اور اس کی بیوی کا بھی سرقلم کر دیا گیا- 19 دسمبر کو تین پولیس والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا- ان ہلاکتوں کی ذمّہ داری کسی نے بھی قبول نہیں کی لیکن حکومت نے فوری ردعمل کا اظہار کیا اور وادی فرغانہ میں ایک ہزار سے زیادہ افراد کوگرفتار کر

ڈالا- پولیس ہر داڑھی والے آدمی سے تفتیش کرتی رہی-نعمان گن کے واقعات نے پوری حکومت میں بے چینی پھیلا دی کیونکہ اسطرح کی صورتِ حال امن وامان کو تہ وبالا کرسکتی تھی اور اسلام پسندوں کوتقویت دے سکتی تھی- جب اندیجان میں گرفتار ہونے والے بعض اسلام پسندوں نے تسلیم کیا کہ نعمان غنی کی زیرِنگرانی ان کی تربیت ہوئی ہے تو کریموف نے ازبک پارلیمنٹ میں 2 مئی1998ء کو دہشت گردوں کے خلاف مزید جابرانہ کاروائیاں کرنے کے اعلان کے ساتھ، اپنے معروف ریمارکس دیئے-

''ان لوگوں کے سروں میں گولی مارنی چاہیئے، اگر ضروری ہوا تو میں خود بھی انہیں ماروں گا-'' کریموف نے عہد کیا- اسی مہینے پارلیمنٹ نے آزادی رائے اور مذہبی تنظیموں کے جابرانہ قانون کی منظوری دی- جس کے تحت تمام غیر رجسٹرڈ مساجد کو بند کردیا گیا اور تمام مذہبی رہنماؤں پر سرکاری رجسٹریشن کرانے کی پابندی لگا دی گئی- اس وقت ازبکستان میں4200 مساجد تھیں جن میں سے2430 صرف وادی فرغانہ میں تھیں، ان میں سے صرف 1566 مساجد کوحکومت نے رجسٹریشن دی-

جہادیوں کے گھرانے بھی اس کریک ڈاؤن کا نشانہ بنے- یلدے شیف کی والدہ کرامت عسکر وفا کو اپنے بیٹے سے1999ء میں لاتعلقی کے اعلان پر مجبور کر دیا گیا-''اپنے والد کی وفات کے وقت میرا چھوٹا بیٹا پانچ سال کا تھا- میں نے ایک بیکری میں سخت محنت مشقت کی اور بڑی مشکلوں سے اسے پالا پوسا- میں نے اپنے نافرمان بیٹے طاہر کو، اپنے چھوٹے بھائی کو بلاوجہ مارنے پیٹنے کی وجہ سے، گھر سے نکال دیا- اس کے بعد سالوں گزر گئے، میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی- یہ ناکارہ، ناقابلِ اعتبار شیطان اگر میرا بیٹا ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں- کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں غرق ہوجائے- وہ اور اس کے ساتھی قبر میں بھی چین نہ پاسکیں- میں اپنے صدر اور اپنی قوم سے بے پنا شرمندہ ہوں- کاش میرا یہ باغی بیٹا، طاہر، جس نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے، مرجائے-'' انہوں نے یہ الفاظ ایک عوامی اجتماع میں کہے-

نعمان غنی کی بہن محبوبہ احمد وف اور ان کے بھائی ناصر خواجہ یوف نے، پولیس کی جانب سے مسلسل پریشان کئے جانے کے بعد،نعمان غنی سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کردیا- بعد ازاں مارچ2000ء میں وہ طویل دارا بھی گئے تا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرسکیں-''ہم

اسے آمنے سامنے بیٹھ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے خاندان کے لئے کتنی پریشانیوں پیدا ہو رہی ہیں-" احمدوف نے وضاحت کی- بہرحال واپسی پر ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا اور جون میں خواجہ یوف کو چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی- اسے ازبک اسلامی تحریک کے دس مشتبہ سرگرم کارکنوں کے ساتھ جن میں چار خواتین بھی شامل تھیں، سزا دی گئی- اگرچہ نعمان غنی کی بہن جیل میں نہیں ہیں تاہم پولیس انہیں پوچھ گچھ کر کے مسلسل ہراساں کرتی رہتی ہے- اگست میں نعمان غنی کی والدہ کو نعمان گن کے ایک عام اجتماع میں بلایا گیا، جہاں ازبک اسلامی تحریک سے لڑتے ہوئے مارے جانے والے فوجیوں کے رشتہ داروں اور ان کے اپنے پڑوسیوں کے ہاتھوں، ان کا منہ کالا کرایا گیا اور جمعہ نعمان غنی کو جنم دینے پر لعنت ملامت کی گئی-

وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار ہوئیں، روتے ہوئے معافی مانگتی رہیں اور اپنے بیٹے کو لعن طعن کرتی رہیں- معروف تحریکی رہنماؤں کے معصوم رشتہ داروں یا اسلامی تعلق کی بنا پر کسی بھی فرد کو ظلم کا نشانہ بنانے میں حکومت نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا- ازبک نوجوانوں کو بنیاد پرستوں کے حلقہ اثر میں جانے سے روکتے ہوئے کریموف نے واضح وارننگ دی- "اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت سے بچنے کی کوشش میں، کوئی ذاتی المیہ بھی جنم لے سکتا ہے-"

نعمان گن میں 1997ء کے واقعات کے پیچھے یقیناً نعمان غنی کے حامیوں کا ہاتھ ہوگا تاہم حکومت نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وادی فرغانہ سے جہادی گروہوں کو نکال باہر کرنے کے لئے شدید کریک ڈاؤن کی ابتدا کر دی- یہ گوریلے پناہ گزین بن کر ہائت میں نعمان غنی کے فارم پر پہنچنے لگے اور کریموف کے جبر و تشدد کے مقابلے کے لئے نعمان غنی اور یلدے شیف پر دباؤ بڑھانے لگے- مقابلے کے لیے دونوں ہی تیار تھے لیکن سب سے پہلے انہیں مناسب پناہ گاہ چاہیئے تھی- اس آپریشن کے لئے تاجکستان کو مناسب مرکز نہیں بنایا جاسکتا تھا- اس کا جواب افغانستان میں تھا- یلدے شیف کا 1997ء میں کابل میں طالبان سے تعارف ہو چکا تھا اور طالبان انہیں مکمل پناہ دینے کے لئے تیار تھے- ادھر ازبکستان افغانستان میں طالبان مخالف قوتوں کی حمایت کر رہا تھا اور کریموف خود بھی طالبان کے شدید مخالف تھے- یلدے شیف نے اسامہ بن لادن سے بھی ملاقات کی جو ان دنوں قندھار میں طالبان کے قائد کے ساتھ مقیم تھے- اسامہ کے اس علاقے میں کوئی رابطے نہیں

تھے سو انہیں یلدے شیف کی شکل میں مستقبل کا ایک اہم اتحادی نظر آیا۔

بعض ازبک حکام اور جماعت احیا کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ وادی فرغانہ اور ازبکستان کو کریموف کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے، ایک اہم اسلامی جماعت کی تشکیل کے لئے، اسامہ بن لادن نے یلدے شیف کی حقیقی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا کوئی ثبوت تو موجود نہیں تاہم امریکی ایف بی آئی نے بھی بار ہا یہ دعوی کیا ہے کہ ازبک اسلامی تحریک کی تشکیل میں بن لادن کا کردار بنیادی تھا کیونکہ اس سلسلے میں سارے فنڈز اسامہ نے مہیا کئے۔ اپنے وہابی حمایتیوں کے ساتھ، یلدے شیف وہابیوں کے مسلک اور اسامہ کی مغرب مخالف جارحانہ پالیسیوں سے بہت متاثر ہوئے۔ طالبان کے دیوبندی عقیدے کے وہ پہلے ہی خاصے قریب تھے۔

1998ء میں یلدے شیف کابل میں مقیم ہوگئے جہاں طالبان نے انہیں وزیر اکبر خان کے سفارتی علاقے میں رہائش گاہ دے رکھی تھی۔ انہیں قندھار کے جنوبی شہر میں بھی، جہاں اسامہ بن لادن اور طالبان کے ملا عمر قیام پذیر تھے، رہائشی سہولت دی گئی۔ اسی موسمِ گرما میں یلدے شیف نے نعمان غنی کے ساتھ، کابل میں، اپنی منصوبہ بندی مکمل کی اور ازبک اسلامی تحریک کے قیام کا اعلان کر دیا۔ تحریک نے کریموف حکومت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ بعد ازاں ''وائس آف امریکہ'' سے اپنے ایک طویل انٹرویو میں انہوں نے ازبک اسلامی تحریک کے مقاصد کے بارے میں بتایا۔ ''تحریک کے سرگرم کارکنوں کا پہلا مقصد ہے، اپنے وطن میں جبر وتشدد کے خلاف، رشوت کے خلاف، عدم مساوات کے خلاف لڑنا اور اپنے مسلمان بھائیوں کو جیل کی قید سے رہا کرانا____ ان لوگوں کا بدلہ کون لے گا، جو حکمرانوں کی جیل میں مارے گئے۔ بلاشبہ ان کا انتقام ہم لیں گے۔ ان کا انتقام لینا ہمارا فرض ہے اور یہ فرض ادا کرنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ ازبک حکمرانوں کے خلاف اعلان جہاد پر ہمیں کوئی پچھتاوا نہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم جہاد کو اس کے منطقی اختتام تک لے جائیں گے۔''

یلدے شیف نے اسلامی ریاست کی تشکیل کا عہد کیا۔ ''ہم نے اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے اعلان جہاد کیا ہے۔ ہم شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم افغانستان، ایران یا پاکستان اور سعودی عرب کا اسلام نہیں لانا چاہتے بلکہ نبی اکرم کا رائج

کردہ مثالی اسلام چاہتے ہیں۔متذکرہ ممالک میں موجود مذہب کا مثالی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے، ہم جبروتشدد کا ماحول ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے، آج ہم خون بہارہے ہیں۔ اگلا مرحلہ اسلامی ریاست کا قیام ہوگا۔'' یلدے شیف نے یہ دعویٰ بھی کیا ''ہماری تحریک، ایک لاکھ لوگوں کی تحریک ہے، کسی جنگل کو آگ لگانے کے لئے صرف ایک شلعہ ہی کافی ہوتا ہے اور اس کے لئے ایک ماچس بھی بہت ہے۔ کریموف سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس بہت لوگ ہیں اور خدا نے چاہا تو ہزاروں اور مجاہدین بھی ہیں جو اس خواب کی تکمیل کے لئے ہمارے ساتھ ہونگے۔'' اپنے انٹرویو میں یلدے شیف نے ازبک اسلامی تحریک کا تعلق بسماچیوں سے جوڑا ہے۔''ہماری جڑی ستر اسّی سال پیچھے تک چلی جاتی ہیں، جب ہمارے مجاہد آباؤ اجداد نے کمیونسٹوں سے جہاد کیا تھا۔ ہم اپنا موازنہ اپنے ان اجداد سے کرتے ہیں اور ان کے کام کو آگے بڑھانے میں، ہمیں کوئی پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا___ ہمیں کسی بیرونی رابطے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہماری جڑیں انتہائی گہرائی تک اپنے وطن کی سرزمین میں پیوست ہیں۔'' (درحقیقت بہت سے ازبک مجاہدین بسماچی مجاہدین کی ادلاد میں سے ہیں)۔ ازبک اسلامی تحریک کے مذہبی رہنما زبیر ابن عبدالرحیم بخارا کے سابقہ حکمران خاندان منگیت سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں سے بعض افراد، سوویت انقلاب کے بعد، سعودی عرب چلے گئے تھے۔

کریموف، نعمان غنی اور ازبکستان کی جدوجہد:

ازبکستان میں مسلمانوں کے خلاف کریموف کے حقیقی کردار کو متعین کرنے والا، اہم ترین واقعہ غالباً 16 فروری1999ء کی دوپہر کو پیش آیا۔ ایک گھنٹے کے وقفے میں کار بموں کے چھ دھماکے، تاشقند کے عین مرکز میں کئے گئے۔ بظاہر یہ صدر کریموف کو ہلاک کرڈالنے کی کوشش تھی۔ سب سے زیادہ طاقتور بم دو آدمیوں نے چلایا جو اپنی کار سے چھلانگ لگا کر باہر نکلے اور پولیس گارڈ کے بھاگنے سے پہلے ہی ان پر فائر کھول دیا۔ بم اس عمارت کے گیٹ کے بالکل قریب پھٹا جو آزادی چوک کے ساتھ کابینہ کے اراکین کا دفتر تھا۔ ازبکستان میں یہ ان چند عمارتوں میں سے ہے جہاں انتہائی سخت حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ کریموف اپنی رہائش گاہ سے نکل چکے تھے اور کابینہ کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لئے

ابھی راستے میں تھے- وہیں پولیس نے ان کے ڈرائیور کو مطلع کیا کہ بم دھماکے ہو رہے ہیں- اگر چہ حکام کو کوئی گزند نہیں پہنچی تاہم تیرہ لوگ مارے گئے اور 128 افراد زخمی ہوئے-

دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، شدید عالم غضب میں، کریموف چند ہی لمحے میں نقصانات کا جائزہ لینے کے لئے، خود آزادی چوک آ پہنچے- اس وقت بھی شہر میں کہیں کہیں دھماکے ہو رہے تھے-

چند ہی دنوں میں، دو ہزار افراد کو پوچھ گچھ کے لئے زیرِ حراست لے لیا گیا- حکومت آپے سے باہر ہوگئی- اس نے ازبک اسلامی تحریک اور ارک یا برلک جیسے جلاوطن سیکولر سیاسی گروہوں تک کو، دوسری مخالف پارٹیوں سمیت کار بم دھماکوں میں ملوث کر دیا- ابتداً کریموف نے، ترکی میں جلاوطن ارک لیڈر محمد صالح پر الزام لگایا- ازبک پریس نے ان کی تحریک کے رہنماؤں سے افغانستان میں ملاقاتوں کی تصاویر تک چھاپ ڈالیں- بہت سے ازبکوں کا خیال ہے کہ تصاویر کی یہ جعلی سازی ازبک خفیہ اداروں کی کارستانی تھی- دھماکوں کی کاروائی بہت منظّم طریقے سے ہوئی اور اسے انتہائی مستعدی سے انجام دیا گیا- اس کے نتیجے میں بہت سی افواہوں نے بھی جنم لیا- مثلاً یہ نظریہ کہ حفاظتی افواج کا کریموف کے حاسد سیاسی رہنماؤں سے قریبی رابطہ تھا اور وہ اس سازش میں شریک تھے اور اس کے بالکل الٹ یہ قصہ بھی سنا گیا کہ ازبکستان پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے، روس نے کریموف کو قتل کروانے کی کوشش کی تھی- افواہیں پھیلتی رہیں اور ساتھ ہی ساتھ کریموف نے اپنی ظالمانہ کاروائیاں بھی جاری رکھیں- 2 اپریل کو انہوں نے اعلان کیا کہ جو نوجوان بھی ازبک اسلامی تحریک میں شامل ہوگا، اس کے والد کو گرفتار کر لیا جائے گا- ''اگر میرا بچہ یہ راستہ چنے گا تو میں خود اس کا سر قلم کر دوں گا-'' کریموف نے خبردار کیا-

ازبک عمومی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ بم دھماکوں کے ذمہ دار، خود کریموف حکومت کے اندر موجود قبائلی اور ان کے سیاسی رقیب لیڈر تھے، جنہیں اقتدار میں ان کا جائز حصّہ نہیں ملا اور غالباً انہیں یہ خوف بھی تھا کہ کریموف کی پالیسیاں ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں- تاجکستان کی طرح، جہاں علاقائیت کا عنصر اشرافیہ کی سیاست میں بہت طاقتور ہوگیا ہے، کریموف کے ارتکازِ اختیارات اور سمرقند میں اپنے قبیلے پر عنایات کی بارش نے اچھی خاصی عوامی مزاحمت کو جنم دیا ہے- علاوہ ازیں کریموف کو یہ خوف بھی ہے کہ مستقبل میں کسی

وقت وادی فرغانہ کی علاقائی اشرافیہ ازبک اسلامی تحریک کے ساتھ تعلق نہ پیدا کر لے۔
''کریموف وادی میں تنازعات کو روکنے کی کوششوں میں مزاحم کیوں ہوتے ہیں؟ کیونکہ فرغانہ کی علاقائی اشرافیہ کا اسلام پسندوں کے ساتھ اتحاد کریموف کے لئے ایک انتہائی ڈروانا خواب ہے۔ تاجکستان میں ایسا ہو چکا ہے اور بعض ازبکوں کے خیال میں، بم دھماکوں کے روز، یہاں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔'' وسط ایشیا کے ایک ماہر برنیٹ رابن نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔

ان دھماکوں کا ذمہ دار کوئی بھی ہو، اس کے جھٹکے پورے وسط ایشیا میں محسوس کئے گئے۔ دوسرے رہنماؤں کو یہ خوف تھا کہ ان کی سیاسی اپوزیشن کے نزدیک اس طرح کے قاتلانہ حملے قابلِ عمل راستہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے یہ شکوہ بھی کیا کہ اسلامی انقلاب پسند قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں۔ اس طرح کے خوف کچھ اتنے غلط بھی نہیں تھے: کرغیز حکومت نے مئی میں دعویٰ کیا کہ انہوں نے صدر آقایوف کے قتل کی ایک سازش بے نقاب کی ہے۔ تاہم کریموف کو اپنے پڑوسیوں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ انہوں نے کرغیز حکومت پر انقلاب پسندوں سے نرمی برتنے اور تاجکستان پر ازبک اسلامی تحریک کے کارکنوں کو پناہ دینے کا الزام لگایا۔ انہوں نے طالبان، پاکستان، ترکی اور چیچن باغیوں تک کو رگید ڈالا کہ انہوں نے دھماکے کرنے والوں کو تربیت دی اور ازبک اسلامی تحریک کے کارکنوں کو پناہ بھی فراہم کی۔ کریموف نے دعویٰ کیا کہ بم دھماکوں میں ملوث بعض افراد پاکستان فرار ہوگئے اور بعض نے ترکی اور قازقستان میں جاکر پناہ لی۔ یلدے شیف پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ان کار دھماکوں کو متحدہ عرب امارات میں بیٹھ کر منظّم کیا تھا۔ اس آخری الزام میں، ازبک خفیہ اداروں کی تھوڑی بہت کاوش بھی شامل ہے۔

بم دھماکوں کے چند ماہ بعد صورتِ حال اور بھی زیادہ تشویش ناک ہوگئی جب 2 اپریل کو (اسی دن کریموف نے ازبک اسلامی تحریک کے اراکین کے والدوں کے خلاف کارروائی کا اعلان کیا تھا) فائرنگ کے دو واقعات میں سترہ افراد ہلاک ہوگئے۔ سب سے پہلے پولیس نے ایک بس کو اڑا کر رکھ دیا جسے اسلامی جہادیوں کے بجائے، مجرموں نے ہائی جیک کر لیا تھا۔ اس میں نو آدمی ہلاک ہوئے۔ پھر تاشقند کے باہر جانے والی سڑک کی چیک

پوسٹ پر آٹھ مشتبہ اسلامی جہادیوں کو مارڈالا- لیکن فوراً ہی کریموف نے اپنا پینترہ بدل لیا۔۔۔ یہ پینترہ بازی کریموف کی ڈانوا ڈول خارجہ پالیسی کا ایک اہم رخ رہا ہے۔۔۔ اور طالبان سے صلح وصفائی کی بات شروع کردی- انہوں نے پاکستانی حکومت کے ذریعے، اپنے وزیر خارجہ عبدالعزیز کاملوف کی ملامحمد عمر سے ملاقات کا انتظام کرایا- اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام، افغان امن مذاکرات کو آگے بڑھانے کے لئے، تاشقند کی ایک کانفرنس میں طالبان کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے، ازبک حکمران خاصے فکر مند تھے- کریموف طالبان سے یہ یقین دہانی حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ ازبک اسلامی تحریک کی حمایت نہیں کرینگے-لیکن جب 2 جون کو کاملوف کی قندھار میں ملاعمر سے ملاقات ہوئی تو ونہوں نے یہ کہہ کر ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ جب تک ازبکستان انہیں افغانستان کی جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، وہ تاشقند مذاکرات میں حصّہ نہیں لیں گے- علاوہ ازیں، اگرچہ طالبان ازبک اسلامی تحریک کی مدد نہیں کر رہے تاہم وہ تحریکی گوریلوں کے خلاف کوئی کاروائی بھی نہیں کریں گے-

کریموف کی پینترے بدلتی خارجہ پالیسی دوسرے محاذوں پر رنگ دکھاتی رہی- جون میں ازبکستان کو اس وقت ترکی سے تعلقات میں شدید سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا جب ترکی نے تحریکی جہادیوں کو پناہ دینے کے ازبک الزامات کے جواب میں، اس سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لئے- انتقاماً تاشقند نے ترکی معاونت سے چلنے والے بیس تعلیمی اداروں کو بند کر دیا- جون میں ہی، بم دھماکوں میں ملوث بائیس مشتبہ افراد پر مقدمات قائم کر دیئے گئے- استغاثہ نے الزام لگایا کہ دھماکوں کی منصوبہ بندی افغانستان، پاکستان اور ترکی میں کی گئی تھی اور چیچن باغیوں نے انہیں تربیت اور مادی معاونت فراہم کی تھی- ہیومن رائٹس واچ کے مطابق، ان بائیس افراد کے بم دھماکوں میں ملوث ہونے کا ایک بھی مناسب ثبوت فراہم نہیں کیا گیا- وہ حزب التحریر کے اراکین تھے اور وہ دہشت گردانہ کاروائیوں کے بجائے پراپیگنڈہ سرگرمیوں میں مصروف تھے- تاہم ان میں سے چھ افراد کو موت کی سزا سنادی گئی،

آٹھ افراد کو بیس سال قید اور باقیوں کو ہلکی پھلکی سزائیں سنائی گئیں۔

موسمِ گرما میں، ازبکستان نے نعمان غنی کو پناہ دینے کے الزام میں، تاجکستان کو تنگ کئے رکھا۔ اگرچہ وہ وہیں تھے مگر صورتِ حال کے صحیح اظہار کے لئے پناہ اور پشت پناہی غالباً مناسب الفاظ نہیں تھے: تاجکستان ازبک اسلامی تحریک کی حمایت کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ بہرحال تاجک صدر رحمانوف نے نعمان غنی سے نجات حاصل کرنے یا کم سے کم انہیں افغانستان بھیج دینے کے لئے مخلوط حکومت میں شامل جماعتِ احیاء پر دباؤ ڈالا۔نعمان غنی رحمانوف اور جماعت کے موجود اچھے تعلقات اور مخلوط حکومت کے استحکام کے لئے ایک ناروا بوجھ بنتے جارہے تھے۔

اپنے مسلح دستوں کے غیر مسلح کئے جانے اور پابندی لگ جانے کے خوف نے اگست 1999 میں نعمان غنی کو تاجکستان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ وادی طویل دارا چھوڑنے اور سرحد پار کرغیزستان میں آنے کے بعد، انہوں نے اغوا اور ماردھاڑ کا سلسلہ شروع کردیا۔ بعد ازاں وہ افغانستان چلے گئے۔25 اگست کو اسلامی ازبک تحریک نے کریموف کے خلاف اور ان کی حکومت کے خاتمے کے لئے اعلان جہاد کردیا۔1999ء کے موسمِ گرما کے واقعات نے جو تاشقند کے بم دھماکوں کے بعد مسلسل جاری تھے، اسلامی تحریک کو وسط ایشیا کے علاقے کے سب سے بڑے خطرے کے طور پر ابھارا۔

اس اثنا میں نعمان غنی علاقے کے اہم ترین رہنما کے طور پر سامنے آئے لیکن وہ انٹرویو دینے سے بچتے تھے۔مغربی میڈیا کے لوگ ان سے بات کرنے کو ترستے تھے مگر انہوں نے انہیں کبھی پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کی صرف ایک غیر واضح اور پرانے وقتوں کی تصویر، ازبک خفیہ اداروں نے، ازبک قومی اخبارات میں ضرور شائع کرائی تھی۔ انہوں نے اپنے گرد، افغان ملاّ عمر سے بھی زیادہ گہرا، چیستانی غلاف پھیلایا ہوا تھا۔ جلد ہی نعمان غنی کو نہ صرف زیرِ زمین وسط ایشیائی تحریکوں میں بلکہ پاکستان، افغانستان اور ساری عرب دنیا میں ایک دیومالائی کردار کے طور پر جانا جانے لگا۔ ماسکو جیسے دور افتادہ علاقوں میں بھی، مغربی

سفارت کار، فوج اور خفیہ اداروں کے حکام، تیل کمپنیوں کے عہدیدار، بینکار، انسانی امداد کے کارکن اور اخبار نویس ان کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے تھے- ان کے بارے میں ہر افواہ پر کان دھرتے اور ان کے منصوبوں اور عزائم کے متعلق بری طرح اندازے لگانے کی کوشش کرتے- عام لوگوں کی زبان پر ازبکی تحریک کا ذکر کم اور جمعہ بھائی- ان کا گھریلو نام____ کی باتیں زیادہ ہوتیں- اس طرح ان کی حقیقی اور تصوراتی سرگرمیوں کی کہانیاں عوامی دل ودماغ پر نقش ہوگئیں-

پر اسرار شخصیت کے علاوہ، ان کے کردار کے گرد موجود افسانوی ہالہ جنوبی امریکہ کے چی گویرا کی الف لیلائی شخصیت سے بے حد مشابہ تھا، جو اپنے آخری انقلابی ایڈونچر کے بعد منظرے غائب ہوگئے تھے- نعمان غنی دو جنگیں پہلے ہی لڑ چکے تھے- ایک افغانستان کے خلاف سوویت فوج میں شامل ہوکر اور دوسری جماعتِ احیا کے لئے تاجکستان میں اور اب وہ ازبک حکومت کے خلاف تیسری جنگ کی ابتداء کرنے جارہے تھے- ان جنگوں کی وجہ سے جہادیوں کو متحرک اور منظم کرنے اور تربیت یافتہ، ماہر اور اسلامی جذبے سے سرشار فوجیوں سے صحیح کام لینے کا، عثمان غنی کو وسیع تجربہ ہوچکا تھا- وہ ایک انتہائی کرشماتی اہلیت کے مالک تھے- انہوں نے وادی فرغانہ اور وسط ایشیا کے دوسرے علاقوں میں ہزار ہا ایسے غیر مسلح ہمدرد، خاموشی سے، پیدا کر ڈالے جو محض ایک اشارے پر باہر نکل سکتے تھے یا ان کے گوریلوں کو ضروری رسد یا رہنمائی فراہم کر سکتے تھے- اگرچہ ازبکی تحریک کے مسلح دستوں نے کبھی بھی وسط ایشیائی یا روسی افواج کے لئے کوئی سنجیدہ خطرہ پیدا نہیں کیا تاہم ان کے عسکری حربے انتہائی شاندار نوعیت کے تھے اور انہوں نے وسط ایشیائی حکومتوں میں دہشت پیدا کردی تھی-

دریں اثناء، نعمانی غنی کو اپنے جارحانہ حملوں کے لئے موزوں وقت کے چناؤ کا زبردست سیاسی ادراک تھا- وہ بروقت وسط ایشیائی ریاستوں میں یا ان کے مابین کوئی بھی تنازعہ کھڑا کردیتے- ہر موسم سرما میں روس، امریکہ اور نیٹو ممالک وسط ایشیائی ممالک پر فوجی

اور سیاسی حکمت عملی میں اشتراک کے لئے زور ڈالتے اور ہر موسم گرما میں نعمان غنی کا حملہ شروع ہوجاتا اور ساتھ ہی حکومتوں کی جانب سے الزامات اور جوابی الزامات کی وجہ سے ماحول پھر بگڑ جاتا۔ مزید براں نعمان غنی اپنے ہر حملے کا انداز بدل ڈالتے تھے، جس سے علاقائی افواج ششدر ہو کر رہ جاتیں۔ ''نعمان غنی وسط ایشیائی ممالک کو کبھی بھی باہمی تعاون کے قریب نہیں آنے دے گا۔ وہ ان کے مابین اختلافات کو مزید بڑھانے کا حربہ سوچ سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ ازبک اسلامی تحریک نے وادی فرغانہ میں قدم جمانے کے لئے، ہر سال نت نئے طور طریقے اپنائے ہیں، انہیں پتہ ہے کہ وادی فرغانہ پر کنٹرول کر لینے کا مطلب ہے، پورے وسط ایشیا کا کنٹرول حاصل ہوگیا۔'' تاجکستان میں اقوامِ متحدہ کے مشن کے سربراہ آئی ودپیٹروف نے مجھے یہ بات دوشنبہ میں بتائی۔

دریں اثناء، طالبان، بن لادن، ازبک مہاجرین، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے خیراتی اداروں اور پاکستان کی اسلامی جماعتوں کی جانب سے مہیا کردہ رقوم، سازوسامان اور رضا کاروں کی مسلسل ترسیل، یلدے شیف کے ذریعے، کابل میں ان کے مرکز سے، ہوتی رہی۔ تحریک نے افغانستان سے وسط ایشیا کے راستے یورپ تک، ہیروئین کے تمام کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے سرگرم کارکنوں کو پورے علاقے میں ''کیریئر'' کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ بیرونی روابط، رسد کے ذرائع اور فنڈز میں مسلسل توسیع نے، کریموف کے خلاف ازبکی تحریک کے جہاد کے لئے انتہائی نازک صورتِ حال پیدا کر دی۔ لیکن تحریک کی بڑھتی ہوئی طاقت کے لئے، ازبک حکمرانوں کا جابرانہ رویّہ اور ازبک عوام کی خوفناک غربت اس سے بھی زیادہ نازک مرحلہ تھا۔

باب 8

نعمان غنی اور وسط ایشیا کا جہاد

دوشنبہ سے باہر نکلتے ہی چند میل دور، وادی گارم میں شمالی جانب بڑھتے ہوئے، سیّاح، اچانک ہی پامیر کے عالیشان سلسلہ کوہ کی لپیٹ میں آ جاتا ہے- وادی عبور کرتے ہوئے، سڑک کے دونوں جانب سرسبز کھیتوں کے طویل سلسلے اور غربت زدہ دیہات بکھرے نظر آتے ہیں- ان کے ساتھ ساتھ بند فیکٹریاں بھی اپنی سیاہ چمنیوں سمیت، دکھائی دیتی ہیں- تھوڑی سی چڑھائی کے بعد، سرسبز وشاداب پہاڑی علاقہ ہے جہاں مویشی گھاس چرتے پھرتے ہیں اور یہی راستہ آگے برف پوش چوٹیوں کی سمت بڑھتا جاتا ہے- ڈرائیونگ کے ابتدائی حصّے میں، وادی وسیع اور کھلی کھلی لگتی ہے، کھلی فضا اور آزادی کا احساس دیتی ہے لیکن اوپر جاتے ہوئے یہ تنگ ہوتی جاتی ہے اور سڑک پہاڑی کے ساتھ ساتھ ڈرامائی انداز میں چڑھنے لگتی ہے- اس کی ایک جانب کہیں نیچے دریائے سرخاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے- چٹانی ڈھلانوں پر واقع دیہاتوں میں دو رویہ چائے خانے ہیں، ان میں لمبے لمبے تختوں پر قالین بچھے ہیں، گاؤ تکیے رکھے ہیں- تاجک لوگ اپنے مخصوص رنگین لباس پہنے انہیں چلاتے ہیں- گدھوں اور گھوڑوں کے کاروانوں اور سوویت دور کے پرانے، خستہ حال ٹرکوں کے ڈرائیور یہاں کچھ دیر سستا لیتے ہیں- یہ لوگ ضلع گارم سے پھل اور سبزیاں دوشنبہ کی منڈیوں تک لے جاتے ہیں- وادی کے عین درمیان، دربند کے مقام پر، جہاں دریا عالیشان اور خوابناک انداز میں پھیلنے لگتا ہے، ایک تنگ سی سڑک دائیں جانب وادی طویل دارا میں چلی جاتی ہے

جبکہ وادی گارم والی سڑک بلند ہوتی گارم ، تاشقند، ہائت اور جگرتال کی سمت گامزن رہتی ہے- یہی راستہ آگے کرغیز سرحد عبور کر کے اوش کی جانب جاتا ہے-

وادی طویل دارا جانے والی سڑک، وادی گارم کے راستے کی نسبت خاصی تنگ ہے- یہ سڑک چکنی مٹی، پگھلتی برف اور گرے ہوئے چٹانی ٹکڑوں کے ملغوبے سے بنی ہے- چٹانی سلسلے کے ساتھ جاتی ہوئی یہ ٹوٹی پھوٹی سڑک اتنی عمودی اور ڈھلواں ہے کہ اس کے عین اوپر پہاڑی چوٹیاں نظر سے اوجھل رہتی ہیں- سٹیرنگ کی ہلکی سی غلط جنبش آپ کو ہزاروں فٹ نیچے بہتے دریا میں پھینک سکتی ہے- یہاں سے دیکھیں تو نیچے بہتا ہوا دریا باریک براؤن دھاگے کی مانند نظر آتا ہے- بہار میں بھی یہاں کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے اور اس کے بلند درّے برف باری اور برفیلے تودوں کے کھسک آنے کی وجہ سے بند ہوجاتے ہیں- بعض اوقات وادی اتنی تنگ ہوجاتی ہے کہ لگتا ہے کہ آپ سر اٹھائیں گے تو دوسری جانب کی پہاڑی کو چھولیں گے-

وادی طویل دارا کی یہ سڑک دو شنبہ اور مشرقی تاجکستا ن میں گورنو بدخشان کے دارالحکومت خراگ کے مابین مرکزی رابطے کا کام دیتی ہے اور سال کے زیادہ تر حصّے میں، برف کی وجہ سے بند رہتی ہے- سڑک کو کھلا رکھنا اور حکومتی کنٹرول میں رکھنا، علاقے کے وسیع تر مفاد میں ہے- اس راستے میں تباہ شدہ ٹینکوں کے ڈھانچے، ٹوٹی پھوٹی آرمرڈ گاڑیاں اور شکستہ فوجی ٹرک جا بجا بکھرے ہوئے ہیں- تاجک خانہ جنگی کے دوران وادی جماعتِ احیائے اسلام کا ایک مضبوط گڑھ تھی- بعض بڑی جنگیں اسی وادی میں لڑی گئیں کیونکہ حکومتی افواج باغیوں کو یہاں سے نکالنے کے درپے تھیں- گوریلوں کے لئے یہ بہترین پناہ گاہ ہے کیونکہ چند لوگ یہاں پوری فوج کو رد کے رکھ سکتے ہیں-

وادی میں اترتے ہوئے، تقریباً آدھا راستہ طے کرنے کے بعد، بائیں جانب ایک طویل مگر تنگ سی گھاٹی جس کے دہانے پر، سانگور نامی گاؤں میں جمعہ نعمان غنی نے ازبک اسلامی تحریک کے گوریلوں کے لئے قلعہ بند کیمپ، رہائشی سہولتیں اور مستقل گیریژن بنا رکھا ہے- ان کے آدمی 1990ء کے عشرے سے یہاں موجود ہیں- شروع میں وہ تاجک فوج سے نبرد آزما رہے اور بعد ازاں وادی فرغانہ میں ازبک فوج کے خلاف جارحانہ کاروائیاں منظّم کرتے رہے- آدھی درجن افراد گھاٹی کے دہانے پر قبضہ رکھ سکتے ہیں- چٹانوں کے اس

بے کراں اور بلند وبالا ہجوم پر بمباری کی کوئی کوشش بے فائدہ اور بے نتیجہ ہوگی۔ نعمان غنی جب بھی افغانستان سے یہاں آتے ہیں، وہ سانگور گاؤں کے سکول میں کھلی کچہری لگاتے ہیں اور وسط ایشیا پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ 2001ء کے موسمِ بہار میں، میں نے نعمان غنی کے بارے میں مزید معلومات کے حصول کے لئے یہاں تک سفر کیا۔ وہ چند ہی ہفتے پہلے، اپنے چار سو ساتھیوں کے ہمراہ، تین ماہ وادی میں گزار کر گئے تھے۔

''روزانہ ان سے ملاقات کے خواہاں لوگوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں ــــــ قازق، تاجک، ازبک، کرغیز، عرب، چیچن، اوئی غرز، پاکستانی اور افغان ــــــ وہ سب ان کے ساتھ شامل ہونا اور وسط ایشیا میں جہاد کرنا چاہتے تھے۔'' طویل دارا کے گاؤں میں ایک کسان نے مجھے بتایا۔ ''ہر روز سینکڑوں لوگ آتے تھے۔ وہ خوراک، رہائش اور ان کے لئے مناسب رقم کا بندوبست کرتے تھے۔'' ایک اور شخص نے مجھے بتایا۔

اپنے قیام کے دوران، نعمان غنی نے اپنے ''خاموش ہمدردوں'' کو بھی بلایا۔ یہ سب وادی فرغانہ کے دیہاتوں میں عام سی زندگی گزارتے تھے۔ اپنے روزمرّہ کاموں میں مصروف رہتے تھے اور کان ہتھیار اٹھا لینے کے اعلان پر لگے رہتے تھے۔ یہ لوگ وہاں ازبک تحریک کے گرمائی حملوں کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔

ان کے قیام کا اہم ترین واقعہ ان کی ایک مقامی تاجک حسینہ سے شادی تھا۔ وہ گورنو بدخشاں کی ایک بیوہ خاتون تھیں۔ ان کے دو بیٹے بھی تھے اور ان کے شوہر تاجک خانہ جنگی کے دوران مارے گئے تھے۔ سینکڑوں لوگوں نے نعمان غنی کی شادی کی دعوت میں شرکت کی۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ دلہن پامیر کے پہاڑوں کی حسین ترین عورتوں میں ایک ہے اور نعمان غنی کو خوبصورت خواتین سے خاص لگاؤ ہے۔ اس شادی سے نہ صرف مقامی تاجک قبائل سے تعلقات میں استحکام پیدا ہوا بلکہ نبی اکرم کے عہد کی ایک سنت بھی پوری ہوئی۔ کسی شہید کی بیوہ سے شادی کرنا دوگنا ثواب ہے۔ نعمان غنی کی پہلی ازبک بیوی اور اس کی بیٹی ابھی افغانستان میں ہی تھے۔

گوریلے تمام ضروری سامان مقامی دیہاتیوں سے خریدتے، انہیں اچھی قیمت دیتے اور کوئی بھی مسلح انتہا پسند مقامی آبادی کے لئے ہراسانی یا پریشانی کا باعث نہیں تھا۔ پانچ سال کی خانہ جنگی کے بعد دیہاتیوں کو اب صرف اپنے فارموں کی تعمیر نو، مویشیوں کے ریوڑ

اکٹھے کرنے اور زندگی کو گزارنے میں دلچسپی تھی۔'' مقامی لوگ نعمان غنی کی موجودگی کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھی خوش مزاج ہیں اور خریدی جانے والی خوراک اور اشیاء کی قیمت ادا کرتے ہیں۔'' ایک کاشتکار نے کہا۔ نعمان غنی نے مقامی لوگوں اور دوشنبہ کی حکومت سے تاجک سیاست میں حصہ نہ لینے اور تاجکستان میں اسلامی تحریک شروع نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ نعمان غنی نے صرف اتنا کہا تھا کہ انہیں ان کے پہاڑی مرکز میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور وادی فرغانہ تک رسائی کے لئے جہاں وہ ازبکستان کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے تھے، تاجک کرغیز سرحد پار کرنے کا ٹرانزٹ حق دیا جائے۔ لیکن ایک طویل عرصے تک نعمان غنی کی موجودگی کی بدولت تاجک حکومت پر ازبک دباؤ کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

1999ء کی مہم

1999ء کے موسم گرما میں، جب نعمان غنی نے دوبارہ ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے ہائت کا اپنا فارم چھوڑ دیا اور کچھ مہینے، اپنے بنیادی مرکز کو منظم کرنے کے لئے، سانگور گھاٹی میں گزارے۔ وہ اپنے مددگاروں کا ایک ایسا نیٹ ورک تشکیل دینا چاہتے تھے جو وادی طویل دارا سے، جنوبی کرغیز ستان کے باتکن صوبے کے پہاڑی سلسلوں تک پھیلا ہوا ہوتا کہ اس کے ذریعے وہ وادی فرغانہ میں اپنے ساتھیوں کو ہتھیاروں اور خوراک کی سپلائی جاری رکھ سکیں۔ اس جگہ سڑکوں پر بہت کم فوجی چیک پوسٹیں تھیں، چنانچہ وہ باآسانی وادی گارم کی سڑکوں کے ذریعے جگرتال تک، سامانِ رسد ٹرکوں اور ٹیکسیوں کے ذریعے لے جاسکتے تھے۔ جگرتال سے اس سامان کو خچروں اور گھوڑوں کے کاروانوں پر بار کر دیا جاتا تھا۔ ازبک تحریک کے جہادی کارکن چار پانچ دن میں پہاڑی سلسلوں کو عبور کر لیتے اور باتکن، سکھ اور فرخ کی جانب جنوبی کرغیزستان کے ہموار میدانوں میں پہنچ جاتے۔ یہاں سے سامان کو اتار کر، وادی فرغانہ کے جنوبی کنارے کے اردگرد موجود پہاڑوں کی ترائی میں بھیج دیا جاتا۔

سکھ کی آبادی تینتالیس ہزار افراد پر مشتمل ہے اور اس کا رقبہ غزہ کے علاقے جتنا ہے۔ یہ ازبکستان کا حصہ ہے اگرچہ یہ تمام اطراف سے کرغیزستان سے گھرا ہوا ہے۔ (1920ء میں

سٹالن کے ہاتھوں کی گئی تباہ کن نقشہ نویسی کا ایک شاخسانہ) ازبکستان کا علاقہ وہاں سے صرف بارہ میل دور ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے آپ کو کرغیز علاقے کو عبور کرنا لازمی ہے- یہ گھرا ہوا عاقہ تاجک اکثریتی علاقہ ہے مگر سوویت یونین کے خاتمے کے بعد ازبکستان اور کرغیزستان، دونوں ہی نے اسے نظر انداز کئے رکھا ہے- سکھ کے تاجک خانہ جنگی کے دوران جماعتِ احیائے اسلام سے خاصی ہمدردی رکھتے تھے مگر اب ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی وفاداریاں نعمان غنی کی جانب منتقل کردی ہیں کیونکہ انہیں اپنے نظر انداز کئے جانے کا شدید احساس ہے اور تاشقند سے بے پناہ نفرت بھی- تاہم ازبکستان کی سکیورٹی کے اعتبار سے سکھ بے انتہا اہم ہے: اگر ازبک تحریکِ مسلح گروپس کے ساتھ اس علاقے میں گھس جائے تو وہ ازبک علاقے پر قبضہ کا دعویٰ کرسکتی ہے اور ازبک فوج کرغیزستان پر حملہ کئے بغیر، اس کا جواب نہیں دے سکتی-

سکھ کا یہ علاقہ کرغیزستان میں اچھی خاصی سیاسی چپقلش کا باعث بنا ہوا تھا- اسی اثناء میں کرغیز پریس نے یہ خبر شائع کردی کہ 26 فروری2001ء کو وزیراعظم کرمان بیگ باقیوف نے ازبک وزیراعظم اوتکیر سلطانوف کے ساتھ ایک خفیہ معاہدے پر دستخط کردیئے ہیں جس کے تحت ازبکستان کو سکھ کے علاقے تک زمینی رسائی کے لئے کرغیز علاقے سے راہداری فراہم کردی گئی ہے- کرغیز اخبارات اور پارلیمنٹ میں ایک احتجاجی طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور باتکن میں مقامی حکام نے یہ پیش گوئی تک کردی کہ اگر اس معاہدے پر عمل کیا گیا تو (باتکن صوبے کے) بہت سے کرغیز علاقے ازبکی چاردیواری میں آجائیں گے، جس سے کرغیز سکیورٹی کے لئے خطرات پیدا ہونگے- بشکیک حکومت فوراً ہی معاہدے سے مکر گئی- اس کا کہنا تھا کہ یہ اعلان کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں بلکہ محض باہمی ارادوں کا اظہار تھا- لیکن اس واقعے سے ازبک پریشر کی انتہا اور کرغیز حکومت کی کمزوری بہرحال ظاہر ہوگئی اور یہ خطرہ بھی واضح ہوگیا کہ ازبکستان کسی دن طاقت کے بل پر سکھ پر قبضہ بھی کرسکتا ہے- فرخ کا چاروں جانب سے گھرا ہوا علاقہ بھی کرغیزستان میں واقع ہے لیکن یہ دراصل تاجک علاقہ ہے- یہاں پچیس ہزار آبادی کی اکثریت تاجک ہے- فرخ تاریخی طور پر اسلامی انقلاب پسندی کا مرکز رہا ہے____ فرخ کے باشندے بسماچیوں کے ہمراہ سودیت افواج سے بھی لڑتے رہے تھے اور یہاں کے مولوی جذبہ جہاد بیدار کرنے میں مشہور ہیں- یہ دونوں گھرے

ہوئے علاقے آج کل ازبک تحریک کا زبردست گڑھ ہیں- فرغانہ پہنچنے کی نعمان غنی کی تیز تر کاروائیوں کے ساتھ ہی ان دونوں علاقوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے-

سودیت دور میں فرغانہ وادی کے جنوبی کونوں میں، جہاں تاجکستان، ازبکستان اور کرغیزستان کی سرحدیں ملتی ہیں، سرحدوں کا تعین خاصا پریشان کن تھا لیکن اب ریاستوں کی اپنی سرحدی نقشہ بندیوں کے بعد یہ معاملہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے- ازبک اسلامی تحریک کے نمودار ہونے اور سخت حفاظتی انتظامات اور سرحدی گشت کے بعد سے، وسط ایشیا کی سب سے بڑی مارکیٹ وادی فرغانہ اور تاشقند کے لئے تاجکستان اور کرغیزستان کے مابین تجارت واقعتاً ختم ہوکر رہ گئی ہے- نئی سرحدوں نے دیہاتوں، کھیتوں اور خاندانوں کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے- سرحد پار، اگلے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے، کسانوں کو تقریباً سو ڈالر کا پاسپورٹ بنوانا پڑتا ہے، دس ڈالر کے قریب ویزے کا خرچ علیحدہ ہے- اس کا صرف ایک ہی مفہوم بنتا ہے کہ ان کی اپنے قریبی رشتہ داروں تک رسائی ناممکن ہے- آبپاشی کی نہریں، جو سوویت دور میں لہراتی ہوئی علاقے میں سے گزرتی تھیں، خشک ہوچکی ہیں یا ان کا بہاؤ، کم ہونے کی وجہ سے، سرحد پر ہی رک جاتا ہے، اس طرح کاشتکاری ناممکن ہوگئی ہے- ازبک تحریک کو روکنے کی کوشش میں، ازبک حکومت نے تاجک اور کرغیز سرحدوں کے ساتھ ساتھ بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والے مقامی دیہاتیوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے- ان سرحدی پابندیوں سے سمگلنگ کے کاروبار کو خوب فائدہ پہنچا ہے اور بہت سے سمگلر ازبکی تحریک کے حامیوں کو نقل وحرکت اور قیام کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں- حفاظتی انتظامات کو مربوط کرنے اور باہمی تعاون کے بجائے ہر ریاست نے اپنی اپنی قلعہ بندیاں کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم صورتِ حال میں کوئی بہتر پیدا نہیں ہوئی- حفاظتی اقدامات نے غربت اور بے روزگاری میں اور اضافہ کردیا ہے- چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومتیں ان علاقوں کے لوگوں کا دل جیتنے کے لئے یہاں ترقیاتی کام کراتیں لیکن حکومت کے مسلسل نظر انداز کئے جانے اور سرمایہ کاری کے فقدان نے ازبکی تحریک کے لئے اس علاقے میں بے چینی پھیلانے کے لئے مثالی صورتِ حال پیدا کردی ہے-

اگست1999ء میں، اس خوف سے کہ کہیں ازبک دباؤ سے مجبور ہوکر تاجک حکومت ان

کے حامیوں پر پابندی نہ لگا دے، نعمان غنی نے خود ہی کاروائی کا آغاز کردیا- انہوں نے وادی طویل دارا سے مسلح گوریلوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ کرغیز میدانوں میں، ان ٹھکانوں میں بھیجنا شروع کردیئے- 9اگست کو اکیس افراد کے ایک گروہ نے، اوش کے مغرب میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کے مئیر اور تین دوسرے حکام کو اغوا کرلیا اور ایک ملین ڈالر کے تاوان' ضروری رسد اور ایک ہیلی کاپٹر کا مطالبہ کرڈالا، تاکہ وہ اس کے ذریعے افغانستان جاسکیں- پریشان حال کرغیز حکومت نے ___ جو اس صورتِ حال کے لئے تیار نہیں تھی، اور اس کے پاس باقاعدہ فوج بھی کچھ زیادہ نہیں تھے ___ فوراً ہی ہتھیار ڈال دیئے-13 اگست کو مغوی رہا کردیئے گئے اور کرغیز حکومت نے گوریلوں کو تاجکستان واپس جانے کا محفوظ راستہ دے دیا- یہ خبریں بھی آ رہی تھیں کہ کرغیز حکومت نے پچاس ہزار ڈالر بطور تاوان بھی ادا کئے ہیں- صدر کریموف نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا- انہوں نے کرغیز صدر پر ازبک تحریک کے ساتھ ملی بھگت کا الزام لگایا اور وادی طویل دارا اور گارم پر حملے کے لئے بمبار طیارے بھیجنے کا اعلان کردیا- غالبًا گارم میں شہریوں کے ہلاک ہونے کے باعث، تاجکستان میں احتجاجی مظاہرے شروع ہوگئے- انہوں نے دونوں ریاستوں کے درمیان کشیدگی مزید بڑھادی- اس طرح نعمان غنی کی خواہش کے مطابق بین الریاستی تنازعہ پیدا ہوگیا-

کچھ اور تحریکی گروپ باتکن کے علاقے میں آگے بڑھ کر تین دیہاتوں میں داخل ہوگئے- انہوں نے کرغیز وزارتِ داخلہ کے ایک میجر جنرل کو پکڑ لیا-23اگست کو ایک اور گروپ نے کان کن کمپنی کے چار جاپانی ماہرین ارضیات سمیت سات افراد کو اغوا کرلیا- اس واقعے کی پوری دنیا میں شہ سرخیاں لگ گئیں- بشکیک حکومت کے لئے ایک زبردست بین الاقوامی بحران پیدا ہوگیا کیونکہ جاپان وسط ایشیا کا ایک اہم مالی معاون اور سرمایہ کار ملک تھا- اغوا کے وقت کا انتخاب اور بھی زیادہ پریشان کن تھا- یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب صدر آقایوف شنگھائی فائیو چین، روس، تاجکستان، کرغیزستان، قازقستان ممالک کے سربراہوں کی بشکیک میں ایک کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے- کانفرنس میں صدر آقایوف نے ازبکی تحریک کی مذمت کی اور کہا کہ تحریک کے چار سو مسلح افراد پورے وسط ایشیا کو تباہ کر ڈالنا چاہتے ہیں-

جواباً، ازبکی تحریک نے افغانستان سے اعلان کیا کہ اس نے کریموف حکومت کا تختہ الٹنے اور وادی فرغانہ پر قبضہ کرنے کے لئے جہاد کا آغاز کر دیا ہے- جونہی کرغیز فوجی متحرک ہوئے اور روسی فوجی مشیر جاپانی مغویوں کی تلاش میں علاقے میں بھیجے گئے- تین ہزار پانچ سو کرغیز گلّہ بان، اپنے خاندانوں سمیت اردگرد کی پہاڑیوں میں روپوش ہوگئے- پھر وہ پناہ گزین بن کر باتکن میں آ گئے اور یہاں انسانی مسائل کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا- ''ہماری اپنی خوراک بمشکل پوری ہوتی تھی، اوپر سے یہ پناہ گزین بھی آ گئے- ہمیں انہیں بھی کھلانا پلانا پڑا کیونکہ حکومتی امداد اور خوراک آنے میں تو کئی ہفتے لگ گئے تھے-'' باتکن کے نزدیک کاراباخ کے ایک گاؤں میں آیت بونصیب علی وا نامی ایک پرائمری سکول ٹیچر نے بعد میں مجھے بتایا-

باتکن کا علاقہ صرف پناہ گزینوں اورلڑائی کا مرکز ہی نہیں تھا بلکہ ازبکی تحریک کے لئے کارکنوں کی بھرتی کے لئے بھی خاصا زرخیز تھا- نو کرغیز جوان اس سال تحریک میں شمولیت کے لئے کارا باخ سے گئے تھے، جن میں ایک بیوہ کے چار بیٹے بھی تھے- ''انہوں نے اپنی ماں کوصرف اتنا بتایا کہ انہیں قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے اور پھر وہ چلے گئے- وہ غم کی شدت سے ابھی تک پاگل ہے اور چیختی چلاتی رہتی ہے-'' نصیب علی وا نے بتایا- سماجی کارکن گل مراد ودٹو کا نے بتایا کہ 2000ء میں درجن بھر آدمی اور بھی ازبک اسلامی تحریک میں شامل ہونے باتکن سے گئے تھے- ''ہر جگہ یہی کچھ ہورہا ہے- دیہات نوجوان لوگوں سے خالی ہوگئے ہیں یا تو وہ نوکری تلاش کرنے روس چلے گئے ہیں یا پھر نعمان غنی کے ساتھی بن گئے ہیں کیونکہ وہ کم ازکم تنخواہ تو دیتا ہے اور یہاں بے پناہ غربت ہے-''

باتکن کرغیزستان کا سب سے پسماندہ ضلع ہے- یہ صوبہ اوش کا حصّہ تھا لیکن ازبک تحریک کے پہلے حملے کے بعد 1999ء میں اسے علیحدہ انتظامی اکائی بنادیا گیا- سکول اساتذہ اور مقامی حکام نے مجھے بتایا کہ یہاں بے روزگاری کی شرح 60% سے 90% تک ہے اور پورے ملک میں یہاں کی شرح پیدائش ــــــ 3.4% سب سے زیادہ ہے- سودیت دور میں آبپاشی کی زیادتی اور ازبک بارڈر پر نہروں کے بند ہوجانے کی وجہ سے یہاں کی زرخیز زمینیں شور زدہ ہوگئی ہیں- زنگ آلود فیکٹریاں بند پڑی ہیں- بجلی دن میں صرف چار گھنٹے فراہم کی جاتی ہے اور روزگار کے کوئی مواقع نہیں- دودھ کا پلانٹ، آئل مِل اور شراب

بنانے والی ایک فیکٹری1991ء سے بند پڑی ہیں-حکومت نے انہیں دوبارہ چلانے کی کوئی کوشش نہیں کی-''غربت کا کھیل اسے انتہا پسندوں نے بنا دیا ہے- ورنہ غربت ہے اور نہ بھوک- بے چینی پیدا کرنے کے لئے مناسب رہائش جیسی بنیادی سہولیات تک نارسائی کا بہانہ گھڑا گیا- یہ ایسے معاملات ہیں جن سے لوگ خود ہی بیزار ہوجائیں گے-'' کرغیزستان میں اقوام متحدہ کے امن مشن کے سربراہ ارکان مراد نے صورتِ حال کو اس طرح دیکھا-

اگست کے آخر تک تحریکی گروہوں نے کوئی بیس افراد اغوا کئے- کرغیز فوج کے ساتھ مسلسل لڑائی کے دوران وہ مغویوں کو رہا کرتے رہے مگر جاپانی ماہرین ارضیات کا معاملہ لٹکائے رکھا اور اسطرح جاپان میں ایک سیاسی بے چینی پیدا کردی- جاپانی خفیہ اداروں کے درجنوں ایجنٹ اور سفارت کار اپنے ہم وطنوں کو رہا کرانے اور تحریک سے رابطے کا کوئی سلسلہ ڈھونڈنے کے لئے ہمسایہ ریاستوں سے مذاکرات کرنے وہاں آن پہنچے- 4 ستمبر کو تحریک نے کچھ تاوان، ازبک جیلوں میں قید پچاس ہزار افراد کی رہائی اور وادی فرغانہ میں جانے کے محفوظ راستے کا مطالبہ کیا اور ان کے بدلے میں تمام مغویوں کو رہا کرنے کی حامی بھر لی- کرغیزستان نے یہ مطالبہ مسترد کردیا-

باتکن اور اوش کے اردگرد، تحریک کے زیر اثر دیہاتوں پر دوبارہ ازبک حکومت کا ایکشن شروع ہوگیا انہوں نے بارہ کرغیز کاشتکاروں کو ہلاک کردیا اور درجنوں گھر تباہ کر ڈالے- کرغیز فوج نے بھی حملہ شروع کردیا تاکہ گوریلا گروپوں کو ایک دوسرے سے کاٹ کر، انہیں واپس تاجکستان میں دھکیل دیا جائے- اسی اثناء میں، کرغیز فوج کے تین اعلیٰ افسروں نے باتکن کے قریب سرائے تالا کے گاؤں میں تحریک کے دو گوریلا کمانڈروں سے مذاکرات شروع کردیئے-25 اکتوبر تک مذاکرات اور شدید جنگ، دونوں ہی جاری رہے- اس روز بالآخر جاپانی مغویوں کو رہا کردیا گیا- اگرچہ جاپانی اور کرغیز رہنماؤں نے بالاصرار کہا کہ کوئی تاوان نہیں دیا گیا تاہم مغربی سفارت کاروں کا کہنا تھا کہ جاپان نے، تحریک کو تاوان دینے کے لئے، خفیہ طور پر کرغیز حکومت کو دو سے چھ ملین ڈالر تک ادا کئے-

موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی، چونکہ تاجکستان کے پہاڑی درّے برف باری کے باعث بند ہوجاتے ہیں، چنانچہ تحریکی گروپ طویل دارا کی جانب پسپا ہوگئے-جماعت احیائے اسلام سے تعلق رکھنے والے حکومتی وزراء وہاں پہلے سے ہی موجود تھے- وہ نعمان غنی

کو افغانستان چلے جانے کا مشورہ دے رہے تھے- بالآخر نعمان غنی مان گئے اور نومبر کے پہلے ہفتے میں ایک عجیب وغریب منظر نظر آیا____ جو آنے والے برسوں میں بارہا دکھائی دینا تھا____ ازبک اسلامی تحریک کے چھ سو مسلح مجاہد، اپنے بیوی بچوں سمیت ہائت اور طویل دارا سے روسی فوجی ہیلی کاپٹروں میں سوار افغان سرحد کی جانب جارہے تھے- افغانستان میں انہیں یلدے شیف اور طالبان نے خوش آمدید کہا- تحریکی جہادیوں کو مزارِ شریف شہر میں ٹھہرایا گیا، جبکہ گوریلوں کے خاندانوں کو مزارِ شریف میں ہی اقوام متحدہ کے ایک سابقہ مہاجر کیمپ میں بھیج دیا گیا- ستم ظریفی دیکھئے کہ 1990ء کے عشرے کی خانہ جنگی کے دوران تاجک پناہ گزینوں کو اسی کیمپ میں ٹھہرایا گیا تھا- طالبان نے ازبک تحریک کو اپنا تربیتی کیمپ قائم کرنے اور کابل، قندھار اور مزارِ شریف میں اپنے سیاسی دفاتر کھولنے اور وادی فرغانہ سے آنے والے نئے لوگوں میں سے تازہ بھرتی کی اجازت بھی دے دی- یلدی شیف نے پہلے ہی طالبان سے معاہدہ کرلیا تھا کہ ازبکی تحریک ازبکستان کے خلاف اپنے فوجی آپریشنوں میں مکمل آزاد ہوگی- جواباً تحریک (طالبان کے لئے) مسعود کے خلاف بھی لڑے گی-

ازبک تحریک1999ء میں کہیں بھی وسط ایشیا کے لئے کوئی اہم فوجی خطرہ پیدا نہیں کرسکی تاہم گوریلوں نے اپنے وحشیانہ خوابوں سے کہیں زیادہ کامیابیاں حاصل کیں- انہوں نے علاقے کی حکومتوں، روس اور بیرونی دنیا میں____ ازبکستان، تاجکستان اور کرغیزستان کے مابین موجود تنازعات کو وسعت دے کر____ اچھی خاصی دہشت پیدا کردی- انہوں نے ثابت کردیا کہ علاقے کی معمولی تربیت یافتہ اور اچھے اسلحہ سے محروم فوج، ان کی اغوا کی کاروائیوں اور جارحانہ گوریلا حملوں اور جنگی حربوں کا کسی بھی طرح مقابلہ نہیں کرسکتی- سب سے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے لئے ایک نام بنالیا تھا- شاندار پراپیگنڈے کے ساتھ اپنے مقاصد کا اعلان کیا تھا- نئے مجاہدوں کی بھرتی، اسی طرح یقینی بن سکتی تھی- بسماچی بغاوت کے بعد، پہلی دفعہ وسط ایشیا میں مسلح جہاد کا منظر ابھر رہا تھا-

اس موسم سرما میں نعمانی غنی اور یلدے شیف نے قندھار کے کئی چکر لگائے- وہاں وہ حکمت عملی تیار کرنے اور اسلحہ، بارود اور نقد رقم کی فراہمی کے سلسلے میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر سے مذاکرات کر رہے تھے کیونکہ بھرپور تیاریوں کے ذریعے ہی مشن کو وسیع تر کیا

جاسکتا تھا- ازبکی تحریک کی مالی معاونت میں زیادہ تر حصّہ افغانستان سے ہونے والی افیم کی تجارت کا تھا- منشیات کے انسداد اور جرائم سے تحفظ کے اقوام متحدہ کے دفتر(ODCCP) کے مطابق99-1998ء کے دوران افیم کی پیداوار دوگنی ہوگئی___2750 ٹن سے بڑھ کر پانچ ہزارٹن-2000ء میں پیداوار، محض خشک سالی کی وجہ سے، کم ہوکر3400 ٹن رہ گئی- طالبان نے اپنی جنگی کاروائیوں کے لئے فنڈز جمع کرنے کی خاطر افیم کی برآمد پر ٹیکس لگا رکھا تھا- نعمان غنی، تاجکستان کے راستے افیم کی سمگلنگ میں بری طرح ملوث تھے اور اب انہوں نے وسط ایشیاء میں اپنے تحریکی ساتھیوں کے نیٹ ورک اور چیچن رابطوں کو بھی، اپنے کاروبار میں وسعت کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا-

انٹرپول کرائم انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کی اسٹنٹ ڈائریکٹر رالف متشکی نے2000ء میں امریکی کانگریس کو رپورٹ دی کہ افیم کی افغان برآمدات کا60% اب وسط ایشیا کے ذریعے لے جایا جارہا تھا اور یہ کہ ''ازبک تحریک ہیروئین اور افیم کی اس مقدار کے 70فیصد حصّے کی، اس علاقے سے نقل وحمل کی براہِ راست ذمہ دار ہوسکتی ہے-'' جولائی2000ء تک جب طالبان نے افیم کی کاشت پر پہلی دفعہ پابندی لگائی، ازبک تحریک اور منشیات کے دوسرے کار پرداز مزار شریف اور قندوز میں افیم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کرچکے تھے- انسداد منشیات اور جرائم سے تحفظ کے ادارے کے مطابق یہ مقدار اندازاً دوسو چالیس ٹن تھی- 2001 کے موسم گرما میں تاجک حکام نے مجھے بتایا کہ انہیں یقین ہے کہ نعمان غنی اور منشیات کے دوسرے سمگلروں نے ہیروئین کو ریفائن کرنے کے لئے، تاجکستان میں لیبارٹریاں قائم کررکھی ہیں- اسی سے افغانستان سے درآمد شدہ خام افیم کی ضخیم مقدار کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے- 2جولائی2001ء کو روسی سرحدی محافظوں کے ہاتھوں2.4 ٹن خام افیم کی ریکارڈ مقدار کے پکڑے جانے سے بھی ان شبہات کی تصدیق ہوتی ہے-''ہیروئین تیار کرنے کی لیبارٹریاں، غالبًا یہاں موجود ہیں-'' گارڈز کے کرنل کومٹی یوچنگو نے واضح کیا-''یہی وجہ ہے کہ افغان سمگلر افیم خام صورت میں یہاں سمگل کرکے لاتے ہیں، جو پہلی نظر میں بظاہر گھاٹے کا سودا لگتا ہے-''

نعمان غنی کو مالی امداد اور بھی مختلف ذرائع سے مل رہی تھی- مغربی سفارت کاروں اور انٹیلی جنس حکام کے مطابق طالبان کی طرف سے نعمان غنی کے لئے دو ایم آئی 8 روسی ہیلی

کاپٹر (ٹرانسپورٹ) حاصل کئے گئے، جس میں چالیس افراد بیٹھ سکتے تھے- اس کی قیمت بن لادن نے ادا کی- لیفٹنٹ جنرل بورس ملینکوف، آزاد ریاستوں کے دہشت مخالف مرکز کے سربراہ کی رپورٹ تھی کہ بن لادن نے نعمان غنی کو2000ء کے شروع میں 26 ملین ڈالر دیئے تھے جبکہ سعودی عرب میں مقیم سعودی ازبکوں نے سنپر رائفلز، رابطہ اور ابلاغ کا اکویمنٹ اور اندھیرے میں واضح دیکھنے والی عینکیں جیسا ہائی ٹیک سازوسامان خریدنے کے لئے 15 ملین ڈالر بھیجے تھے- کہا جاتا ہے کہ یہ سب اشیاء پاکستان اور خلیجی ممالک کے اسلحہ ڈیلروں کے ذریعے بھیجی گئی تھیں- سی آئی اے کا یہ دعویٰ کہ بن لادن وسیع تباہ کاری کے حامل غیر روایتی ہتھیار، خصوصاً جراثیمی ہتھیار وسط ایشیائی ریاستوں سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا- اس شبہے کوبھی تقویت دیتا ہے کہ بن لادن کے سابقہ سوویت ریاستوں سے رابطہ پیدا کرنے میں ازبکی تحریک کا بھی ہاتھ تھا- بن لادن کے تحریک سے قریبی تعلقات نے وسط ایشیا جیسے علاقے میں، جہاں پہلے اس کے کوئی تعلقات ہی نہیں تھے، اپنی کارروائیوں کے لئے ایک نئی بنیاد فراہم کر دی- آئندہ سالوں میں پورے علاقے میں یہ افواہیں بازگشت کرتی رہیں کہ بن لادن وسط ایشیاء میں امریکی ٹارگٹس (سفارت خانے اور قازقستان میں آذربائی جان کی تیل کمپنیوں کے دفاتر) کونشانہ بنانے کی کوشش کرے گا- اگرچہ امریکہ نے تاجکستان میں اپنا سفیر مقرر کر دیا تھا لیکن وہ زیادہ تر قازقستان میں ہی رہتا تھا اور مہینے میں ایک دو روز کے لئے دوشنبہ آیا کرتا تھا- بن لادن اور ازبکی تحریک کی جانب سے لاحق خطرات ہی اس کی وجہ تھے-

سو ازبکی تحریک نے فنڈز اور اسلحہ کی فراہمی کے لئے ایک وسیع وعریض نیٹ ورک بنا رکھا تھا جس میں افغانستان اور پاکستان کے اسلامی گروپس اور خلیجی ریاستوں اور سعودی عرب کے عطیہ وہندگان شامل تھے- افیم کی سمگلنگ اور اغوا کی کاروائیوں سے حاصل ہونے والی آمدنی اس کے علاوہ تھی- ازبکی تحریک جہاں کہیں بھی سامنے آئی، اس کے مسلح کارکنوں کے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہوتی تھی- وہ مقامی دیہاتیوں سے خریدی جانے والی اشیاء کی قیمت ادا کرنے میں بڑے محتاط تھے- مبینہ طور پر نعمان غنی اپنے لڑاکوں کو سو ڈالر سے پانچ سو ڈالر تک ادا کیا کرتا تھا- نئے لڑاکوں کی تحریک میں شمولیت یقینی بنانے کے لئے یہ افواہ ہی کافی تھی-

2000ء کی مہم:

جولائی2000ء میں نعمان غنی افغانستان سے طویل دارا واپس آئے تو کئی سو مسلح افراد کی فورس ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے اپنے آدمیوں، ساز وسامان اور ہتھیاروں کو خفیہ طریقے سے ازبکستان اور کرغیزستان منتقل کرنا شروع کر دیا تا کہ نئے حملے کا آغاز کیا جاسکے۔ ان کی فورس کے پاس شاندار جیکٹیں، انفراریڈنائٹ سکوپس، سنپر رائفلیں، بھاری مشین گنیں اور راکٹ لانچرز، غرض سب کچھ تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلحہ وادی فرغانہ میں موجود ''خاموش'' ساتھیوں تک پہنچایا جائے۔ یہ کام سرانجام دینے کے لئے علاقے میں منظّم اور مسلح کارکن بھیجنے کی ضرورت تھی تا کہ مختلف جہتی حملوں کے ذریعے وسط ایشیائی افواج کو ان علاقوں سے دور رکھا جاسکے جہاں سے سامان رسد لایا جانا تھا۔

اگست میں ازبکی تحریک نے مختلف اطراف سے انتہائی منظّم اور مربوط حملوں کی ابتدا کر دی جبکہ دوسرے گروپ وادی فرغانہ میں ہتھیار اور گولہ بارود سمگل کرتے رہے۔ تحریک کا سب سے بڑا گروپ دوبارہ باتکن کے سامنے موجود پہاڑی علاقوں میں جا اترا۔ سکھ اور فرخ کے بعض مقامات پر تو انہوں نے کرغیز فوج کو حیرت زدہ کر دیا۔ ایک اور گروپ تاجکستان کے مغربی کنارے پر واقع پندذی قند تک جا پہنچا، وہاں سے وہ جنوب میں لڑ کر، سرحد پار کر کے جنوب مشرقی ازبکستان میں سرخندریا کے صوبے کی چٹیل پہاڑیوں میں سپارسی میں آ گیا۔ ایک اور گروپ شمالی تاجکستان میں خوبند آیا، اس نے خفیہ طور پر ازبک سرحد عبور کی اور تاشقند کی شمالی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ یہاں انہوں نے جانگیہ آباد اور بوستان لیک (تعطیلاتی تفریحی مرکز، تاشقند سے صرف اسی میل شمال میں) کے اردگرد موجود ازبک فوجوں پر حملہ کر دیا۔ ان ساری کاروائیوں میں اندازاً ایک سو سے دوسو افراد شامل تھے۔

نعمان غنی نے سرخندریا صوبے کے پہاڑوں میں کچھ مہینے، انتہائی خاموشی سے گزارے، وہاں انہوں نے ایک زبردست قلعہ نما کیمپ تعمیر کرایا، جس میں ایک سو ستر ازبکی گوریلے رکھے گئے۔ ازبک فوج کو جنگ شروع ہونے تک، ان افراد کی موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔ تاشقند میں غیر ملکی سفارت کاروں نے تفصیلاً مجھے بتایا کہ روس میں تربیت یافتہ خصوصی ازبکی فوجی دستوں نے، جو حال ہی میں امریکہ سے کمانڈو ٹریننگ لے کر آئے تھے،

سرخندریا کی جنگ میں کتنی شاندار کارکردگی کامظاہرہ کیا- چند گوریلوں نے ان کے ہتھیار چھین لئے اور انہیں نہتا کردیا-''ایک اعلیٰ پائے کے ازبک یونٹ نے ایک ایسی جھڑپ میں ___ جس سے بچا جاسکتا تھا ___ اپنے بارہ جوان ضائع کردیئے، دس جوان زخمی بھی ہوئے اور ان لوگوں پر ہر داڑھی والے شخص کی دہشت بیٹھ گئی- ان کا حوصلہ ہی ختم ہوگیا تھا-'' ایک سفارت کار نے کہا-''سات گوریلے ایک ہفتے تک ایک تنگ سی گھاٹی میں محصور رہے- ان کا گولہ بارود بھی قریب الختم تھا لیکن انہیں ختم نہیں کیا جاسکا، حالانکہ فوج گن شپ ہیلی کاپٹرز، توپیں اور بھاری آرٹلری کا استعمال کررہی تھی-'' اس نے مزید کہا-''فضائی بمباری کے ساتھ، شدید زمینی گولہ باری کے باوجود فوج کو قلعہ بندی تک پہنچنے کے لئے ایک مہینہ لگ گیا- زیادہ تر تحریکی گوریلے ہلاک ہوچکے تھے، کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے لیکن گرفتار کوئی بھی نہیں ہوا-

آپریشن کے دوران ازبک فوجیوں نے پہاڑوں میں واقع تین دیہاتوں سے زبردستی دو ہزار باشندوں کو نکال باہر کیا- یہ وہ تاجک گلہ بان تھے جو صدیوں سے شہروں اور حکومتی کنٹرول سے دور تنہا ان دیہاتوں میں رہ رہے تھے- ازبکی تحریک سے نمٹنے کی کوشش میں، اپنے ہی لوگوں میں خوف اور انتشار پھیلانا یا ان کی جبری بے دخلی، ازبک حکمرانوں کی نااہلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے- چند مہینے پہلے انہی گلہ بانوں نے ازبکی فوج کو پہاڑوں میں تحریکی گوریلوں کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا-لیکن فوج نے اسے نظرانداز کردیا تھا- جنگ شروع ہوجانے کے بعد ازبک حکام نے الزام لگایا کہ گلہ بان تحریک کو اشیائے خوراک فراہم کررہے تھے-''وہ بہت سادہ اور مہمان نواز لوگ ہیں- جو کوئی بھی ان کے علاقے سے گزرتا ہے، وہ اسے مہمان بنا لیتے ہیں، چاہے اس کے گلے میں مشین گن ہی کیوں نہ ہو- ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش تو ہے نہیں اسلئے اگر انہیں کوئی چیز فروخت کرنے کا موقع مل جائے تو وہ انکار نہیں کرتے-'' سرخندریا میں سری آسیا کی ایک خاتون زمرد قربانو دانے یہ حقیقت بتائی-

فوجیوں نے سب سے پہلے تو گلہ بانوں کے مویشی باڑوں کو تباہ کیا اور ان لوگوں کو دو مہینے تک ایک فوجی کیمپ میں مقید رکھا جہاں ان کے لئے معمولی غذا کا بھی بندوبست نہیں تھا- اس کے بعد انہیں ایک اور ویران علاقے میں منتقل کر دیا گیا، جہاں کئی لوگ سردی اور

بھوک کے ہاتھوں جاں بحق ہوگئے- پریشانیوں سے تنگ آ کر جب انہوں نے صدر کریموف سے ملنے اور اپنی حالتِ زار سے آگاہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہیں بری طرح زدوکوب کیا گیا-

حضرت القادروف نامی ایک گلہ بان نے دسمبر میں بی بی سی کی ازبک سروس کو ایک انٹرویو میں اپنی حالتِ زار کے بارے میں بتایا تو ازبک فوج نے اسے شدید اذیتیں دے کر ہلاک کردیا- اس کی لاش جب اس کے گھر بھیجی گئی تو اس کے بھائی احمد القادروف کے بیان کے مطابق، اس کا سر توڑ پھوڑ دیا گیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور پیچ کس کے ذریعے اس کے بدن پر پچاس زخم لگائے گئے تھے- اس طرح تہتر گلہ بانوں پر غداری، دہشت گردی اور ازبکی تحریک کی معاونت کے الزامات عائد کئے گئے: جون2001ء میں ایک عدالت نے، دہشت گردی کے جرم میں ان سب کو طویل قید کی سزا سنا دی- ایک ماہ بعد، 7 جولائی کو ازبکستان کی انسانی حقوق کی سوسائٹی کے سربراہ شارق رضی مرادوف، جنہوں نے تنِ تنہا___ 15 جون کو اپنے گرفتار ہونے سے قبل___ گلہ بانوں کی جبری بے دخلی کے خلاف احتجاج کیا تھا، پولیس کی حراست میں جاں بحق ہوگئے- ان کی لاش جب ان کے گھر والوں کے حوالے کی گئی تو انہوں نے سیکیورٹی فورسز پر، ان پر تشدد کرنے اور ہلاک کرنے کا الزام لگایا-

دریں اثناء شمالی تاجکستان میں تحریک کے جارحانہ حملوں نے کہیں زیادہ بے چینی پیدا کررکھی تھی- پندرہ گوریلوں کے ایک گروپ کے ہاتھوں دو فوجیوں کی ہلاکت اور چار دوسرے افراد کے اغوا کے بعد، 24 اگست کو بوستان جھیل اور غزل قند کی قریبی پہاڑیوں میں واقع گرمائی تفریحی مقام سے تعطیلات کے لئے آئے ہوئے چار ہزار افراد اور بچوں کو زبردستی نکال باہر کیا گیا- گوریلے فوج کے مسلسل حملوں کا کئی ہفتوں تک مقابلہ کرتے رہے لیکن بالآخر گولہ بارود ختم ہوجانے کی وجہ سے ان کا صفایا کردیا گیا- یہ پہلا موقع تھا کہ لڑائی دارالحکومت کے اتنی نزدیک ہورہی تھی- تاشقند کے شہریوں کو فوجی اڈے سے اڑنے والے بمبار جیٹ جہازوں اور گن شپ ہیلی کاپٹرز کی آوازیں بخوبی سنائی دیتی تھیں- شہر میں افواہوں کی بھرمار ہوگئی تھی-

شروع اگست میں، باتکن میں گوریلوں نے کرغیز فوجی ٹھکانوں پر کئی حملے کئے جن میں

چوبیس فوجی اور پچیس گوریلے مارے گئے- کرغیز فوجی حکام کا دعوی تھا کہ گوریلے وہاں رسد کا ذخیرہ کرر ہے تھے اور وادی فرغانہ کے لئے کوریڈور بنانے کی کوشش کرر ہے تھے- سکارپین اور برفانی چیتے کے ناموں سے موسوم کرغیز فوج کے خصوصی دستے____ جو اسی سال کے شروع میں فورٹ کیمبل لوزیانا سے تربیت لے کر آئے تھے____ ان گوریلوں کے خاتمے کے لئے بھیجے گئے- دوسرے سال بھی پہاڑوں سے اترے ہوئے مہاجرین باتکن اور اردگرد کے دیہاتوں میں آ کر جمع ہو گئے-

گیارہ اگست کو تحریکی گوریلوں نے درہ طورو کے دہانے پر واقع کورباخاکنین میں، بائیس کرغیز فوجیوں کو ایک اچانک حملے میں ہلاک کردیا- (یہ درّہ تاجک سرحد سے چار میل اور باتکن سے اٹھارہ میل کی دوری پر ہے)- دورانِ جنگ یہ خون ریزی کے چند سب سے بڑے واقعات میں سے ایک تھا- گوریلے تحریکی گروپ کے ان اٹھائیس افراد کا ایک حصّہ تھے جو تاجکستان سے سرحد عبور کر کے تاوان کی خاطر غیر ملکی سیاحوں اور کوہ پیماؤں کو اغوا کرنے آیا تھا- حملے کے بعد، وہ دو حصّوں میں منقسم ہو گئے اور 12 اگست کو انہوں نے علیحدہ علیحدہ بارہ غیر ملکی کوہ پیماؤں اور چار امریکی باشندوں بشمول ایک عورت کو اغوا کرلیا- کوہ پیما تو بالآخر بچ نکلے یا انہیں ان کے اغوا کنند گان نے چھوڑ دیا مگر نعمان گن کے کمانڈر صابر کی سربراہی میں، آٹھ آدمیوں کے ایک تحریکی گروپ نے امریکیوں کو نہیں چھوڑا- وہ انہیں تاجکستان واپس لے جانا چاہتے تھے- راستے میں صابر نے اغوا شدہ ایک کرغیز فوجی کو قتل کردیا- لیکن تحریکی گروپ اپنے مغویوں سمیت جلد ہی کرغیز سپیشل فورس کے 130 جوانوں کے نرغے میں پھنس گیا- کئی دن کے تعاقب کے بعد کرغیز دستوں نے چھ گوریلوں کو ہلاک کردیا اور دو کو گرفتار کر لیا اور کوہ پیماؤں کو رہا کرالیا- پکڑے جانے والے ایک گوریلے نے بتایا کہ تحریک کے لئے لڑنے کا معاوضہ اسے 500 ڈالر ماہانہ دیا جاتا تھا- جبکہ دوسرے قیدی نے بتایا کہ اسے زنا کے جرم میں سزا ہو گئی تھی اور وہ قانون کی گرفت سے بچتا پھر رہا تھا- تحریکی کارکن عام طور پر پکڑے نہیں جاتے: زخمی گوریلوں کو عموماً ان کے ساتھی ہی مار ڈالتے ہیں تاکہ وہ فوج کے ہتھے نہ چڑھ سکیں- زندہ بچ جانے والا آخری تحریکی لڑاکا کمانڈر صابر، تاجک سرحد سے بمشکل آدھا میل دور کرغیز فوجیوں کے نرغے میں آ گیا اور انہوں نے اسے گولیوں سے چھلنی کردیا- فوجیوں کو اس کے جسم سے ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا- ''اگر تم

یہ رقعہ پڑھ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے مار ڈالا ہے- براہِ مہربانی میری نعش کو اسلامی قوانین کے مطابق دفنا دینا-''

امریکی کوہ پیماؤں نے بعد ازاں دعویٰ کیا کہ انہوں نے 18 اگست کو تحریکی محافظ روشن شریپوف کو ایک چوٹی سے دھکا دے کر گرا دیا تھا اور اغوا کنندگان کی حراست سے فرار ہو گئے تھے- کرغیز فوج نے 27 اگست کو شریپوف کو بھی غیر مسلح حالت میں گرفتار کر لیا- اس نے امریکی رپورٹر جان بوچرڈ کو بعد میں بتایا کہ اسے کوئی نشہ آور شے کھلا دی گئی تھی (یا غالباً وہ سو گیا تھا) جب وہ جاگا تو امریکی جا چکے تھے- امریکی کوہ پیماؤں نے اپنی کہانی نہ صرف امریکی رسالے اور بک پبلشرز کو فروخت کی بلکہ ہالی وڈ کو بھی بیچ ڈالی- اس اکیلے واقعے کو بے پناہ اہمیت ملی- امریکی حکومت کی جانب سے تحریک کو دہشت گرد قرار دینے کے فیصلے کے پس پشت، ایک اہم محرک یہ واقعہ بھی تھا-

کرغیز فوج نے کسی نہ کسی طرح ایک ویڈیو کیمرے پر قبضہ کر لیا جسے گوریلے اپنے آپریشنز کی فلم بندی کے لئے استعمال کرتے تھے (اور بعد میں جسے کرغیز فوج نے ہلاک کئے جانے والے گوریلوں کی مردہ لاشوں کی عکاسی کے لئے استعمال کیا) میں نے جو فلم دیکھی اس میں اچھے خاصے مسلح نوجوان کھاتے، پیتے، سوتے، نماز پڑھنے یا تلاوتِ قرآن کے لئے اکٹھے ہوتے دکھائے گئے ہیں- ان کا تعلق واضح طور پر گلہ بانوں، کاشتکاروں سے اور بعض کا تعلق شہری علاقوں سے تھا- تاجکستان کو کرغیزستان سے جدا کرنے والے بلند درّوں کو جب ان گوریلوں نے عبور کیا تو ان کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی- پھر یہ اغوا کی وارداتوں اور دوسری کارروائیوں کے لئے منقسم ہو گئے- سب سے پریشان کن بات ان لڑاکوں کی کم عمری تھی____ بعض تو ابھی جوان ہی ہو رہے تھے- دوسری ان میں بے انتہا نسلی ہمہ جہتی تھی: ازبک، تاجک، کرغیز، چیچن اور کاکیشین غرض سبھی کی نمائندگی تھی-

اکتوبر کے آخر میں نعمان غنی نے اپنی فوجیں ہٹا لیں اور واپس افغانستان کی جانب پسپا ہو گئے____اور یہ سب کچھ روسی سرحدی محافظوں کی انتہائی مشتبہ نگرانی میں وقوع پذیر ہوا- اسی مہینے تاشقند کی ایک عدالت میں تحریک اور ارک کے بارہ رہنماؤں کا مقدمہ شروع ہوا- ان میں سے صرف تین افراد، ایک فولادی پنجرے میں بند، عدالت میں موجود تھے- باقی لوگوں، بشمول نعمان غنی اور یلدے شیف پر ان کی غیر حاضری میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا-

ازبک پراسیکیوٹر جنرل نے ملزمان کے خلاف الزامات کی تفصیل بتائی۔ ''فوری کاروائی کے نتیجے میں اکٹھی کی گئی دستاویزات اور شہادتیں اس بات کی شہادت ہیں کہ 1991ء اور 1999ء کے دوران تاشقند، سمرقند اور خوارزم کے علاقوں میں انیس قتل اور پینتیس تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔ فروری 1999ء میں تاشقند میں بم دھماکے کئے گئے ____ نومبر 1999ء میں جانگیہ آباد اور اگست 2000ء میں سرخندریا اور تاشقند کے علاقوں میں طاہر یلدی شیف اور نعمان غنی اور محمد صالح کی رہنمائی میں، مسلح گروہوں نے تخریب کاری کی کاروائیاں کیں۔'' عدالت نے بارہ آدمیوں کو ستر آدمیوں کو ہلاک کرنے اور دوسو افراد کو زخمی کرنے کا مجرم قرار دیا۔ نعمان غنی اور یلدے شیف کو ان کی غیر حاضری میں موت کی سزا سنائی گئی، جب کہ ارک کے قائد محمد صالح کو، جو ناروے میں جلاوطنی کاٹ رہے تھے، بیس سال قید کی سزا ملی۔ سزاؤں سے یہ واضح ہوگیا کہ کریموف اور ازبک اسلامی تحریک کے مابین صلح کی کوئی گنجائش نہیں۔

2000ء میں ازبکی تحریک کے حملوں میں مجموعی نقصانات کا آخری سرکاری اندازہ کچھ یوں تھا کہ ازبکستان میں چوبیس فوجی اور تیس گوریلے ہلاک ہوئے جبکہ کرغیزستان میں 30 فوجی اور 120 ازبکی گوریلے مارے گئے۔ آزاد ذرائع کے مطابق دونوں قومی افواج میں ہلاک شدگان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ 2000ء میں تحریکی حملوں کے نتیجے میں بین الاقوامی ردعمل میں وسعت اور برق رفتاری آ گئی۔ امریکہ، روس چین، ترکی، فرانس اور اسرائیل نے کرغیزستان اور ازبکستان میں ضروری اشیاء اور مزاحمت کو روکنے والے اسلحے کی ترسیل ہوائی جہازوں کے ذریعے کی۔ روسی حکومت نے ازبکستان کو 30 ملین ڈالر کے ہتھیار دینے کا وعدہ کیا۔ اس اسلحے میں پچاس آرمرڈ گاڑیاں، ایم آئی 8 ہیلی کاپٹرز اور رابطے اور ابلاغ کا ضروری اکوپمنٹ بھی شامل تھا۔ چین کی فضائیہ نے تین لاکھ پینسٹھ ہزار ڈالر مالیت کی جیکٹس، رات کو نظر آنے والی عینکیں اور سنپر رائفلیں فوراً تاشقند بھیجیں اور کرغیزستان کی دفاعی صلاحیتوں میں اضافے کے لئے امداد کا بھی وعدہ کیا۔ امریکہ پہلے ہی دونوں ممالک کو 3 ملین ڈالر کا فوجی سامان دے رہا تھا۔

مغربی اقوام نے علاقے کے ممالک پر مدافعانہ حکمت عملی میں باہمی ربط پیدا کرنے پر زور دیا۔ روس نے اس سلسلے میں فوراً ہی پہل کر دی۔ 21 اگست کو قازق، کرغیز، تاجک اور

ازبک سربراہوں نے بشکیک میں دفاعی منصوبہ بندی کو مربوط بنانے کے سلسلے میں روسی دفاعی حکام سے ملاقات کی۔ لیکن ان ملاقاتوں سے کریموف اور دوسرے علاقائی حکمرانوں کے درمیان موجود کشیدگی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوسکی۔ 25 اگست کو کریموف نے تاجک وزیر برائے ایمرجنسیز، جماعتِ احیائے اسلام کے لیڈر اور نعمان غنی کے پرانے دوست مرزا ضیاؤیوف پر براہِ راست ازبکی تحریک کی حمایت کا الزام لگادیا۔ ظاہر ہے ضیاؤیوف نے فوراً ہی یہ الزام مسترد کردیا۔ اس قسم کے الزامات نے ان ممالک کے مابین فوجی حکمت عملی کو مربوط بنانے کی راہ میں اور مشکلات پیدا کردیں۔ اگرچہ کریموف ازبکی تحریک کا ٹارگٹ تھے مگر انہوں نے وسط ایشیا کے اس بحران کے لئے، اپنے سوا سبھی لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔

15 ستمبر کو واشنگٹن نے ازبکی تحریک کو بن لادن سے روابط، منشیات کی تجارت، شہریوں کے اغوا اور قتل میں ملوث ہونے کی وجہ سے، دہشت گرد قرار دے دیا۔ اس طرح کلنٹن انتظامیہ نے ازبکستان کو ایک زبردست بونس دے دیا۔ حکومت نے اس اہم اقدام کے ذریعے ازبکستان اور سی آئی اے، ایف بی آئی کے مابین مدافعانہ اور دہشت گرد مخالف کاروائیوں میں باہمی معاونت اور اشتراک میں قریبی تعلق پیدا کردیا۔ واشنگٹن میں حکام نے مجھے بتایا کہ بن لادن کی ازبکی تحریک سے معاونت پچھلے سال کے مقابلے میں ڈرامائی طور پر بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور تحریک____ امریکہ کے خلاف جہاد میں____ القاعدہ کے گلوبل نیٹ ورک کا اہم حصّہ بنتی جارہی تھی۔

ایسی ہی مسلسل شہادتوں کے سبب ازبک تحریک کے خلاف، امریکہ کو فوری قدم اٹھانا پڑا۔ منشیات کی سمگلنگ، فوجی تربیت اور وسط ایشیا میں القاعدہ کے مراکز کی توسیع میں معاونت کے علاوہ ازبکی تحریک وسط ایشیا میں اعلیٰ امریکی حکام اور سفارت کاروں کی نقل وحرکت کے بارے میں انتہائی اہم انٹیلی جنس بن لادن کو مہیا کررہی تھی۔

تاہم اس امریکی فیصلے نے بین الاقوامی امیدوں اور ازبکی تحریک اور حکومت کے مابین باہمی رابطے کے لئے امریکی خاموش ڈپلومیسی کے عمل کو شدید دھچکا پہنچایا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ انسانی حقوق کی پامالی کے حکومتی ریکارڈ کو بھی امریکہ نظر انداز کئے جارہا تھا۔ بعض امریکی سفارت کاروں نے اس فیصلے کی مخالفت بھی کی۔ ان کے مطابق یہ فیصلہ قبل

از وقت تھا- امریکہ کو ازبکی تحریک کو دہشت گرد قرار دینے سے قبل، انسانی حقوق اور جمہوریت کے ایشوز پر کریموف سے معاہدے کرنے چاہئیں تھے- لیکن سی آئی اے اور ایف بی آئی نے ان اعتراضات کو مسترد کردیا- وہ ہر قیمت پر ازبک حکومت سے خفیہ معلومات کا تبادلہ کرنا چاہتے تھے___ اور یہ کام قانوناً وہ اس وقت تک نہیں کرسکتے تھے جب تک امریکی حکومت ازبکی تحریک کو دہشت گرد گروپ قرار نہ دے دیتی-

مزار شریف اور قندوز (شمالی افغانستان) میں مرتکز ازبکی تحریک ایک پان اسلامک فورس بنتی جارہی تھی- چھ سولڑاکوں، بمعہ ان کے بیوی بچوں کے، کی تعداد اور طاقت آہستہ آہستہ بڑھ کر اب دو ہزار ہوگئی تھی- ان کا تعلق کرغیز، تاجک اور ازبک نوجوانوں کے علاوہ، کاکیشیا کے چیچنوں اور چین کے مسلمان صوبے زن جیانگ سے بھی تھا- طالبان کے ساتھ معاہدے پر عمل درآمد کرتے ہوئے، نعمان غنی نے2000 کے موسم گرما کے آخر میں شمال مشرقی افغانستان میں احمد شاہ مسعود پر حملہ کرنے کے لئے چھ سوتحریکی جہادی فراہم کئے- طالبان فوجیوں نے طالقان میں احمد شاہ مسعود کے ہیڈ کوارٹر کا محاصرہ کرلیا- یہ محاصرہ ایک ماہ بعد 5 ستمبر کوختم ہوا- طالبان کی فوجی طاقت کا ایک تہائی____ 12 سے15 ہزار تک____ حصّہ غیر افغانوں پر مشتمل تھا- ازبکی تحریک کے علاوہ پاکستان کے چار ہزار اور بن لادن کے عرب بریگیڈ (قاعدہ کا ایک حصّہ) کے چھ سو اور چیچن اور اوئی غرز کے بھی کافی مجاہد موجود تھے- پاکستان کی آئی ایس آئی کے افسران اور ایس ایس جی کے کمانڈرز نے نقل وحمل، منصوبہ جاتی حکمت عملی اور جنگی حربوں کو منظّم کرنے اور طالبان کے حملوں خصوصاً آرمرڈ اور آرٹلری کے استعمال میں ارتباط پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا- محاصرے کے دوران، مغربی ممالک کی ریڈیو انٹرسپشن کے ذریعے یہ پتہ چلا کہ حملوں کے دوران تین رابطہ زبانیں استعمال ہوئیں: پشتو (افغان اور پاکستان کے لئے)، روسی (ازبکی تحریک کے لئے) اور عربی (عرب جہادیوں کے لئے)-

طالبان کے حمایتی پاکستانی گروہوں میں کئی سو افراد شیعہ مخالف انتہا پسند جماعتوں میں سے تھے مثلاً سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی- یہ لوگ پاکستان میں شیعہ مسلمانوں کے قتل میں خاصے بدنام ہوگئے تھے- ان دونوں گروپوں کو طالبان نے مکمل تحفظ فراہم کیا- اس طرح وسط افغانستان کے علاقہ ہزارہ جات میں عربوں نے بھی شیعہ فرقے کے لوگوں کا بدترین قتل

عام کیا تھا- سپاہ اور لشکر کے بعض کارکن1999ء میں نعمان غنی کے ساتھ شامل ہوگئے- وہ وسط ایشیا میں مجاہد ہونے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ محض شیعہ مخالف جنگ جو کے بجائے بین الاسلامی تحریک کی پہچان بن سکیں- غیر ملکی سفارت کاروں نے جاپانی ماہرین ارضیات کے اغوا کے متعلق جب از بکی تحریک سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو سپاہِ صحابہ کے ایک پاکستانی کو رابطہ کار کی حیثیت سے دیکھ کر ششدرہ رہ گئے- سپاہ کے یہ جنگجو از بکی تحریک کو رسد، ابلاغیاتی سہولتیں اور دوسری معاونت، پاکستان سے فراہم کر رہے تھے-

سقوطِ طالقان نے مسعود کو زبردست دھچکا پہنچایا اور کچھ ہفتوں تک اس کے مددگار روس اور ایران کو یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں مسعود کو افغانستان سے نکل کر، اپنے لڑاکوں کے ساتھ، تاجکستان میں پناہ نہ لینی پڑ جائے- اگرچہ مسعود نے طالبان کی پیش قدمی کو روک لیا تھا، تاہم طالقان آخری جھٹکا ثابت ہوا اور اس شکست کے بعد بین الاقوامی برادری نے طالبان پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا- مختلف ممالک کے اسلامی جہادیوں کی اس جنگ میں شرکت اور افغانستان میں بن لادن کی مسلسل موجودگی نے روس اور امریکہ کو مجبور کردیا کہ وہ طالبان کو اسلحہ کی ترسیل سمیت، تمام تر پابندیاں لگانے کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو متحرک کریں- یہ پابندیاں جنوری2001ء میں لاگو ہوئیں- دریں اثناء مسعود کو اپنے سر پرستوں سے ہتھیاروں کی سپلائی جاری رہی-

طالقان کے محاصرے میں، از بکی لڑاکوں کو آرمرڈ' آرٹلری اور فضائی طاقت کے مربوط استعمال سمیت انتہائی اہم جنگی تجربات حاصل ہوئے- وہ القاعدہ جیسے گلوبل جہادی نیٹ ورک کے زمینی آپریشنوں میں خاصے ملوث ہوگئے- القاعدہ کے اراکین کو طالبان کا مکمل تحفظ حاصل تھا- لیکن مستقبل میں یہ سب بیکار ہوجانا تھا- اسی اثناء میں طالبان کو احساس ہوگیا کہ از بکی تحریک کو وہ ایک مفید تردیدی عامل کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں-

جب چین نے اپنے قریبی اتحادی پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ کابل کے باہر دشکور کے کیمپ میں اوئی غر مسلمانوں کی____ چینی صوبے میں اسلامی جہادی تحریک چلانے کے لئے____ تربیت ختم کرنے کے لئے طالبان کو مجبور کرے، تو طالبان نے اوئی غر جہادیوں کو فرنٹ لائن سے ہٹا کر شمال میں مزارِشریف میں از بکی تحریک میں شامل ہونے بھیج دیا-

پاکستان میں چینی سفیر اور ملا عمر کے درمیان، قندھار میں ایک ملاقات میں طالبان نے صاف انکار کردیا کہ اوئی غران کے فوجی دستوں کا حصّہ تھے۔

چند ماہ بعد، پاکستان کی فوجی حکومت نے قتل وغارت میں ملوث سپاہ اور لشکر کے بعض رہنماؤں کو، پاکستانی تحویل میں دینے کا مطالبہ کیا۔ طالبان نے انہیں بھی ازبک تحریک میں شمولیت کے لئے شمال میں بھیج دیا۔ اسی طرح جب روس نے بعض چیچن رہنماؤں کی واپسی پر زور دیا تو انہیں بھی ازبکی تحریک کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اسطرح غلطی سے ازبک اسلامی تحریک نہ صرف بین الاقوامی پان اسلامک طاقت بن گئی' بلکہ ان غیر ملکی سورماؤں کے لئے بھی____ جنہیں اپنی افواج میں شامل رکھنا طالبان کے لئے پریشانی کا باعث ہوجاتا____ ایک بہترین پشت پناہ بن گئی۔اگرچہ ازبک تحریک کا مقصد واحد ازبک حکومت کا تختہ الٹنا تھا تاہم عام لوگوں کو، وسط ایشیا میں اس کی جہادی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے متعلق کوئی شبہ نہیں رہا۔

نومبر2000ء میں نعمان غنی تقریباً تین سولڑاکوں پر مشتمل، اپنی بین الاقوامی فوج لے کر واپس تاجکستان آ گئے۔ وسط ایشیائی حکمرانوں نے ان کی وہاں موجودگی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ایک اخبار کے یہ خبر چھاپنے پر شدید منفی ردعمل کا اظہار کیا گیا اور ساتھ ہی 5 جنوری کو الماتے میں ایک کانفرنس____ نعمان غنی کی واپسی سے نمٹنے کے لئے____ منعقد کر ڈالی۔ کریموف نے گذشتہ سالوں کی طرح اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

''1999ء اور2000ء میں ہم جارحیت کا نشانہ بن رہے تھے لیکن ہمیں اس صورتِ حال کو دوبارہ پیدا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔2001 میں اسی قسم کی صورتِ حال سے بچنے کے لئے، وسط ایشیائی ریاستوں کو خصوصی اقدامات کرنا ہونگے۔'' درحقیقت کریموف کا موسم سرما کے دوران طالبان سے مسلسل رابطہ تھا تاکہ وہ انہیں، نعمان غنی کو ازبک حکومت کی تحویل میں دینے کے لئے قائل کرسکیں۔ ازبکستان اور طالبان کے درمیان مذاکرات شروع کرانے کے لئے، پاکستان نے اکتوبر2000ء میں اسلام آباد میں (پاکستان میں موجود) ازبک اور طالبان سفیروں کی باہمی ملاقات کرائی تھی۔ ازبک سفارت کار اپنے ہمراہ تحریکِ کے ان کارکنوں کی ایک فہرست بھی لائے تھے، جنہیں وہ افغانستان سے واپس لینا چاہتے تھے۔ سفیروں کی تین ملاقاتوں کے بعد، طالبان کے وزیر خارجہ وکیل احمد متوکل نے مجھے بتایا کہ

طالبان ازبکوں پر یا کریموف پر کبھی اعتبار کرنہیں سکتے- انہوں نے بات چیت کوقطعی بے فائدہ قرار دیا- وہ ان مذاکرات کو جاری رکھنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے- متوکل نے دعویٰ کیا کہ ''ہمارے ہاں صرف تین سو پچاس ازبک خاندان موجود ہیں جو کریموف کے جبروتشدد سے تنگ آ کر بھاگے ہیں اور ہم نے اسلامی بھائی چارے کے جذبے کے تحت انہیں پناہ دی ہے لیکن مزارِشریف میں کوئی تحریکی لڑاکے موجودنہیں-''

وادی طویل دارا میں نعمان غنی کی آمد نے ازبکستان اور تاجکستان کے درمیان تندو تیز الزام تراشیوں کو مزید ہوا دی- ازبکستان نے تاجکستان اور کرغیزستان پر اسلام پسندوں پر قابو پانے کے لئے دباؤ میں اور اضافہ کردیا- شدید سردی کے مہینوں میں، تاشقند نے دو شنبہ اور بشکیک کی گیس سلائی بند کردی تاکہ وہ ازبکی لڑاکوں کوختم کرنے کی ہر کوشش کرنے پر مجبور ہوجائیں- ازبکستان نے کرغیز حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ سکھ کے محصور علاقے تک رسائی کے لئے انہیں زمینی راہداری کی سہولت فراہم کی جائے- ساتھ ہی ازبکستان نے تاجک اور کرغیز سرحد کے ساتھ بارودی سرنگیں بچھانے اور خار دار تاریں لگانے کا کام بھی شروع کردیا- اس طرح انہوں نے خاندانوں، دیہاتوں اورتجارت کے مابین مزید خلیج حائل کردی- خوبند میں مغربی انسانیت پسند کارکنوں نے مارچ2001ء میں مجھے بتایا کہ پچھلے چند ماہ میں بارودی سرنگوں کے حادثاتی طور پر پھٹ جانے کی وجہ سے تیس معصوم جانیں ضائع ہوگئیں اور درجنوں لوگ شدید زخمی ہوئے- پھر تاشقند نے ان تاجک پناہ گزینوں کو ملک سے نکالنا شروع کردیا، جو پچھلے سال سے ازبکستان میں رہ رہے تھے- ازبک نسل کے لوگ تاجک خانہ جنگی کی وجہ سے وہاں سے نکل بھاگے تھے- ایسے ہزاروں لوگ تھے: انہیں یہ خوف بھی تھا کہ اگر انہیں تاجکستان واپس جانے پر مجبور کردیا گیا تو کمزور تاجک معیشت ان کے بوجھ تلے دب کر، بالکل ہی تباہ ہوجائے گی-

کریموف کے خلاف تاجک ناراضگی خاصی پرانی تھی اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ازبکستان نے کرنل محمود خدائے بردیف سمیت کئی تاجک باغیوں کو پناہ دی رکھی تھی- کرنل محمود نے ازبک امداد سے نومبر1998ء میں شمالی تاجکستان میں زبردست مسلح بغاوت کی تھی- ایک اور سابق تاجک وزیرِ اعظم عبدالمالک عبداللہ جانوف، ازبکستان میں پناہ گزین، خود کو صدر رحمانوف کا متبادل رہنما قرار دیتے تھے- جماعت احیائے اسلام سے تعلق رکھنے والے

بعض وزیروں نے دلالتاً کہا کہ جب تک ازبکستان نے ان لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے، تاجکستان کو بھی ازبکی تحریک کو تحفظ دینے کا حق ہے کیونکہ دوشنبہ کے پاس ترپ کا یہی ایک پتہ ہے- بہرحال ازبکستان اور بین الاقوامی برادری کے شدید دباؤ کے زیر اثر، تاجک وزراء نعمان غنی کو افغانستان جانے کے لئے قائل کرنے، وادی طویل دارا بھی گئے-نعمان غنی نے اپنے ایک پرانے دوست، مرزا ضیاؤیوف کے علاوہ اور لوگوں سے ملنے سے انکار کردیا- ضیاؤیوف معاملات طے ہونے تک، تقریباً ایک ہفتہ وادی ہی میں رہے- نعمان غنی وہاں سے نکلنے پر رضامند ہو گئے اور یہ واپسی ایک بار پھر روسی سرحدی محافظوں کی عین ناک کے نیچے انجام پائی- جنوری2001ء میں تقریباً سات دن تک نعمان غنی اور ان کے تین سو ساتھیوں کو روسی ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے، طویل دارا سے افغان سرحد تک پہنچایا جاتا رہا- ازبکی تحریک کا ایک چھوٹا سا دستہ البتہ سانگور بیس کیمپ میں رہنے دیا گیا-

بازاروں میں ،حکومتی وزارتوں میں اور دوشنبہ کے سفارت خانوں میں سازش کے متعلق افواہیں گشت کرتی رہیں- سب سے چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ کون نعمان غنی کی حمایت کررہا ہے- بہت سے تاجک حکام____ اور کئی غریب کسانوں تک____ کو بھی یقین تھا کہ روسی دوہری گیم کھیل رہے تھے- روس سرکاری طور پر تو ازبکی تحریک کا مخالف تھا مگر روسی سرحدی محافظ افغانستان سے تحریکی حملوں کو نظر انداز کررہے تھے کیونکہ ماسکو، ازبکستان میں اپنی فوجوں کی موجودگی کی اہمیت کریموف سے منوا کر، وہاں اپنا اثر ونفود قائم کرنا چاہتا تھا- یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ1999ء سے روسی فوج ازبکی تحریک کے کارکنوں کو تین بار طویل دارا سے نکال کر افغان سرحد تک پہنچا چکی تھی- سازش کے نظریئے کو مزید بھڑکانے والا، یہ ایک اہم عامل تھا- ماسکو نے یہ وضاحت کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ نعمان غنی کو گرفتار کرنے کے بجائے، بحفاظت افغانستان فرار ہونے میں کیوں مدد دے رہا تھا-بعض اور تاجک افسران کا دعویٰ ہے کہ پاکستان اور سعودی عرب وسط ایشیاء میں اسلامی ازبک تحریک کی امداد اس لئے کررہے تھے کہ اوّل تو یہ طالبان کی امداد کا ایک حصّہ تھا اور دوسرے وہ اس علاقے میں اسلامی تحریکوں کے ذریعے، اپنا حلقہ اثر قائم کرنا چاہتے تھے- ان تاجک افسران اور بعض غیر ملکی سفارت کاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نومبر میں جب نعمان غنی وسط ایشیا آئے تو انہوں نے افغانستان سے زمینی راستہ اختیار کرنے کے بجائے،

پاکستان کی مدد سے ایک چارٹرڈ جہاز میں، کراچی سے بشکیک تک کا سفر کیا- انہوں نے اپنی داڑھی صاف کر کے، بھیس بدل لیا تھا- بعد میں نعمان غنی نے مبینہ طور پر اوش سے طویل دارا تک کار میں سفر کیا- تاہم کسی بھی افواہ کی تصدیق نہیں ہوسکی- روسی اور پاکستانی حکام نے ان تمام الزامات کو بے سروپا قرار دے دیا- تاجک احیائے اسلام کے اراکین، گوریلا جنگ کے حقائق سے واقفیت کی بنا پر، ان باتوں کو قابلِ یقین سمجھتے تھے-''جب ہم خانہ جنگی میں مصروف تھے تو ہمیں جہاں سے بھی مدد ملتی تھی، ہم بے جھجک لے لیا کرتے تھے-نعمان غنی بھی، ازبکستان کے مخالف کسی بھی گروہ سے مدد لے سکتا ہے-'' جماعت احیا کے ایک رہنما شریف ہمت زادہ نے کہا-

نعمان غنی کی باآسانی تاجکستان رسائی مسئلے کا صرف ایک حصّہ تھی- ازبکستان کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال دگرگوں ہورہی تھی اور اس کے ساتھ ازبکی تحریک کی حمایت میں اضافہ ہورہا تھا- ازبک پولیس کے جابرانہ ہتھکنڈوں کے باوجود، 10 اپریل 2001ء کو تین سو خواتین نے وادی فرغانہ میں اندیجان کی سڑکوں پر زبردست مظاہرہ کیا- ان کے ہاتھوں میں موجود پلے کارڈز پر لکھا تھا-''2000ء تنہا بیواؤں اور یتیموں کا سال ہوگا-'' انہوں نے تمام سیاسی قیدیوں کی، جن میں ان کے شوہر اور بچے بھی شامل تھے، رہائی کا مطالبہ کیا- میئر آفس کے باہر پولیس عورتوں کے ایک گروپ کو گرفتار کررہی تھی تو اور خانہ دار خواتین ان کی جگہ لینے کے لئے وہاں آ پہنچیں، یہ عمل دن میں پانچ مرتبہ دوہرایا گیا- ازبک حکمرانوں سے بین الاقوامی بیزاری کے اظہار کے طور پر آئی ایم ایف نے اپریل میں یہ کہہ کر اپنا تاشقند کا دفتر بند کردیا کہ معاشی اصلاحات کی غیر موجودگی اور متفقہ شرح مبادلہ قائم کرنے میں ناکامی نے ازبکستان کی معاشی ترقی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے-''غیر ملکی سرمایہ کاری کے لئے یہاں کا کاروباری ماحول قطعی سازگار نہیں-'' آئی ایم ایف کے نمائندے کرسٹوف روزن برگ نے تاشقند سے روانگی سے پہلے رپورٹروں کو بتایا-

ازبکستان کا معاشی بحران واقعی سنگین ہوتا جارہا تھا- ازبک ریاستی منصوبہ بندی کے ادارے کے حکام کے مطابق 60% آبادی پچیس سال سے کم عمر کی تھی اور ان میں سے اکثریت بے روزگار تھی- حکومت کو ہر سال چار لاکھ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی

ضرورت تھی، جو ناممکن کام تھا- افراطِ زر بھی60% تک چل رہا تھا- پچھلے سالوں میں یہ 465% تک چلا گیا تھا- اگرچہ افراط زر خاصا کم ہوا تھا تاہم اکثر ازبک ابھی تک مشکلات کا شکار تھے- دیہاتی علاقوں میں کاشتکاروں پر اب بھی کپاس اگانے پر زور دیا جا رہا تھا لیکن اس ساری مشقت سے انہیں کچھ بھی نہیں مل رہا تھا- حکومت کاشتکاروں کو 170 ڈالر فی میٹرک ٹن ادا کر رہی تھی اور اسے بیرون ملک1300 ڈالر میں فروخت کر رہی تھی- روسی دور کی جبری مشقت کے انداز میں، مقامی حکام بچوں کو پڑھائی چھوڑ کر، کپاس کی کاشت کے زمانے میں، بلا اجرت کھیتوں میں کام کرنے پر زور دے رہے تھے-بعض کاشت کاروں کو رقم کے بجائے اشیاء کی صورت میں ادائیگی کی جا رہی تھی- اس طرح ان کی قوت خرید اور بھی کم ہوجاتی تھی- ان اقدامات سے کپاس کی کاشت کم ہونے لگی اور کاشتکاروں کی بقا کے امکانات مزید کم ہوتے چلے گئے- المیہ یہ تھا کہ حکومت یہ تسلیم کرتی تھی کہ اس کی معاشی ناکامیوں کی وجہ سے ازبکی تحریک کی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن وہ اس کے علاج کے لئے ضروری اصلاحات کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھی- ''یہ تسلیم کرلینا درست ہوگا کہ مذہبی انتہا پسندی میں اتار چڑھاؤ، خود اس میں موجود مذہبی تضادات کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اس کی حقیقی وجوہات غیر حل شدہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل ہیں-'' کریموف نے یہ بات ایک سرکاری میگزین میں تسلیم کی-

2001ء کی مہم:

2001ء کے موسمِ سرما کا آغاز ہوتے ہی علاقے کی تمام حکومتیں ازبکی تحریک کے مزید حملوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونے لگیں-تنظیم میں کثیر نسلی تعاون میں مزید اضافہ محسوس ہونے لگا- جون میں یہ رپورٹیں پھیلائی گئیں کہ ازبک اسلامی تحریک نے اپنا نام بدل کر حزب اسلامی ترکستان رکھ لیا ہے اور اب وہ تمام وسط ایشیا اور چینی صوبے زن جیانگ میں اسلامی انقلاب بپا کرنے کی جدوجہد کرے گی- ازبکی تحریک نے بعد ازاں ان رپورٹوں کی صداقت سے انکار کردیا- ''ہمارا صرف ایک دشمن ہے- اور وہ ہے تاشقند کا غاصب حکمران- ہمارا ہمسایہ ملکوں سے کوئی جھگڑا نہیں اور ہمارا نام تبدیل نہیں ہوا-'' تحریک کی مذہبی قیادت کے سربراہ زبیر بن عبدالرحیم نے یہ بات ریڈیو آزاد یورپ میں دیئے گئے

ایک غیر معمولی انٹرویو میں سامعین کو بتائی- عبدالرحیم نے بہرحال تسلیم کیا- ''ہماری تنظیم کے پیشِ نظر صرف از بکی مفادات ہی نہیں- ہم ایک اسلامی جماعت ہیں- مختلف نسلی گروپ ــــ کرغیز، قازق اور اوئی غزبھی ــــ ہمارے ہمنوا ہیں لیکن چونکہ ہم سب ازبکستان سے ہیں، اس لئے ہم خود کو ازبک اسلامی تحریک کہتے ہیں-'' دریں اثناء مسلسل دوسرے سال بھی نعمان غنی نے، شمال افغانستان میں، مسعود کے خلاف طالبان کے موسم گرما کے حملے کے لئے چھ سو از بکی جہادی بھیج دیئے- یہ حملہ جون میں شروع ہوا اور موسمِ خزاں تک جاری رہا تا آنکہ بن لادن کے دوفدائین نے مسعود کو ہلاک کرڈالا- ان دونوں نے خود کو صحافی ظاہر کیا تھا- از بکی تحریک کی جانب سے لڑنے والے، ایک مرتبہ پھر بن لادن کے عرب فوجی اور پاکستان کے جہادی گروہوں کے افراد نکلے-

وسط ایشیا میں بھی از بکی تحریک کے حملے شروع ہوگئے- کرغیز حکومت کی رپورٹ کے مطابق باتکن کے علاقے میں تاجک کرغیز سرحد کے ساتھ 24اور25 جولائی کی شب دوفوجی پوسٹوں پر، ''ڈاکوؤں'' نے حملہ کردیا- تاجکستان نے فوری پیش بندی کے طور پر گوریلوں کے سرحد عبور کرنے کے واقعے سے انکار کردیا اور اس روسی رپورٹ کو بھی چیلنج کردیا جس کے مطابق تاجک سرحد کے اندر از بکی تحریک اپنی طاقت مجتمع کررہی تھی-

31جولائی کو گوریلوں نے باتکن میں ایک ٹی وی ٹرانسمیٹر پر حملہ کیا- شمالی افغانستان کے ایک مرکز میں مقیم یلدے شیف نے بی بی سی کی ازبک سروس کے نمائندے حامد اسما عیلوف سے باتیں کرتے ہوئے، اس حملے کی ذمہ داری قبول کرلی اور اعلان کیا کہ باتکن کے علاقے میں تحریک کرغیز ٹارگٹس پر حملے کررہی ہے اور موسمِ گرما کے شروع میں ازبک گوریلوں نے سرخندریا میں ازبک فوج سے خاصی سخت لڑائی کی تھی- (ازبکوں کے دعوے کے مطابق یہ بے قاعدہ لڑائی دراصل فوجی مشقیں تھیں) تاہم یلدے شیف اپنے افغان اور تاجک میزبانوں کے تحفظ میں خاصے محتاط تھے- انہوں نے کہا کہ تحریکی لڑاکوں نے سرحد عبور نہیں کی تھی بلکہ وہ لوگ پہلے ہی کرغیزستان اور ازبکستان کے ٹھکانوں میں موجود تھے-

یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہ واقعی تاجکستان سے نہیں آئے تھے بلکہ یہ غالباً تحریک کے ''خاموش'' ساتھی تھے جو پہلے سے کرغیز دیہاتوں میں موجود تھے- انہوں نے جارحانہ حملے کئے اور دوبارہ اپنے شہری ماحول میں گم ہوگئے- یہ پہلا موقع تھا کہ نعمان غنی کی 2000-01ء

کے دوران فرغانہ وادی اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں، اسلحہ سمگل کرنے کی کوششیں بار آور ہوئیں- یوں لگا جیسے اب نعمان غنی کے پاس ازبکستان اور کرغیزستان میں گوریلا فورس کا مستقل ٹھکانہ بن گیا ہے اور ایک نیا، خودمختار کمانڈنگ ڈھانچہ بھی معرض وجود میں آ گیا ہے جو تاجکستان میں ان کی موجودگی کے بغیر بھی کام کرسکتا ہے- چنانچہ نعمان غنی کو اب افغانستان سے تاجکستان کا دشوار گزار سفر کرنے اور اپنی موجودگی سے تاجک حکومت کو ناراض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی-

جب ازبکستان نے یکم ستمبر کو اپنی آزادی کی دسویں سالگرہ منائی تو ملک کی سیاسی اور معاشی صورت حالبہت دگرگوں تھی۔ انسانی حقوق سے متعلق' شدید بین الاقوامی دباؤ کے پیش نظر' کریموف نے آزادی کی سالگرہ کی خوشی میں......ازبک جیلوں میں مقید چونسٹھ ہزار پانچ سو افراد میں سے......مجبوراً 25 ہزار افرد کو عام معافی دے دی۔ مزید پچیس ہزار قیدیوں کی قید کی مدت میں' حکومت نے کمی کردی۔ لیکن اس عام معافی میں اسلامی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے سات ہزار سیاسی قیدیوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ پھر' صرف دس روز بعد' ازبکستان کی صورت حال کے ساتھ ساتھ پورا بین الاقوامی منظر ہی ڈرامائی طور پر بدل کر رہ گیا۔

امریکہ میں گیارہ ستمبر کے دہشت گرد حملوں نے وسط ایشیا میں اہم جیوسٹرٹیجک تبدیلیوں کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ ازبکی تحریک نے مجبوراً اپنے موسم گرما کے جارحانہ منصوبوں کو (عارضی طور پر) روک دیا۔ادھر واشنگٹن نے تاشقند سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں کیونکہ طالبان کے زیر قبضہ افغانستان پر حملہ آور ہونے کیلئے اسے ازبکستان میں فوجی اڈے اور امریکی فضائیہ کی پروازوں کے لئے سہولتیں درکار تھیں۔ امریکہ کے ان مطالبات نے وسط ایشیائی اور روسی حکومتوں کے لئے ایک گھمبیر صورت حال پیدا کر دی ۔ گزشتہ دس سال سے وسط ایشیا روس کی عقبی راہ داری بنا ہوا تھا اور ماسکو کی ہر ممکن کوشش رہی تھی کہ امریکہ اس علاقے میں کسی طرح کی سیاسی یا فوجی اہمیت حاصل نہ کر پائے- ماسکو کو یہ خوف تھا کہ عارضی فوجی اڈوں کے متعلق امریکی مطالبات' افغانستان میں جنگ کے خاتمے کے بعد وسط ایشیاء میں' کہیں مستقل موجودگی کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ وسط ایشیا کے لیڈروں کو اپنی جگہ یہ خطرہ تھا کہ طالبان کے خلاف جنگ میں' امریکہ کی حمایت کرنے سے'

ازبکی تحریک اورحزب التحریر کوشدید باغیانہ پراپیگنڈہ کرنے کا موقع ملے گا اور وہ حکمرانوں کو امریکی چمچے قرار دے دیں گے۔مزید برآں ایسی کاروائیاں طالبان اور ازبکی تحریک دونوں کو انتقامی حربے استعمال کرنے پر مجبور کرسکتی ہیں۔وہ وسط ایشیائی حکومتوں کے خلاف اپنی گوریلا سرگرمیوں کو بھی منصفانہ قرار دے سکیں گے کیونکہ ان کے دعوے کے مطابق یہ حکومتیں نہ صرف اپنے ملک کے مفادات کا سودا کر چکی ہیں بلکہ مسلم افغانستان پر جنگ تھوپنے کی' ایک کافر حکومت کو اجازت دے کر' وسیع تر اسلامی مفادات کے خلاف کام کر رہی ہیں۔

چنانچہ امریکی مطالبات کا ردعمل آہستہ آہستہ آنا شروع ہوا۔اگر چہ روسی صدر ولادی میر پیوٹن اور وسط ایشیا کے دوسرے لیڈروں نے واشنگٹن اور نیویارک میں ہونے والے جانی نقصان پر فوری تعزیت کا اظہار کیا لیکن اڈوں کی فراہمی کے مطالبات پر انہوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔پیوٹن بحیرہ اسود کے ایک تفریحی مقام میں جا چھپے' جہاں سے ان کا تمام علاقائی لیڈروں سے مسلسل رابطہ تھا۔ان کا کہنا تھا کہ چھ ریاستوں کو مشترکہ پالیسی اختیار کر کے' امریکہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہیے۔غالباً وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وسط ایشیا کی اہم پالیسیوں کی تشکیل آج بھی روس کے ہاتھ میں ہے۔لیکن بالآخر 24'25 ستمبر کو پیوٹن اور وسط ایشیائی لیڈروں نے علیحدہ علیحدہ یہ اعلان کیا کہ وہ امریکہ کو محدود فوجی سہولتیں مہیا کریں گے۔

ازبکستان اور تاجکستان نے انٹیلی جنس معاونت' فضائی راستے اور خان آباد ہوائی مستقر کے استعمال کی پیش کش کی لیکن ان کے ذریعے امریکی زمینی دستوں کو افغانستان پر حملے کی اجازت نہیں دی۔کرغیزستان' قازقستان اور ترکمانستان نے بھی فضائی راستے اور مشکل میں پھنسے ہوئے امریکی جہازوں کو اترنے کی سہولت کے استعمال اور خفیہ معلومات کے تبادلے کی پیش کش کی۔لیکن 5 اکتوبر کو امریکی وزیر جنگ رمز فیلڈ کے تاشقند کے دورے کے بعد' ازبکستان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔امریکی فوجوں کو فوجی اڈے مہیا کرنے اور ازبک سرزمین سے جنگی کاروائیوں کی اجازت بھی دے دی گئی۔دسویں پہاڑی ڈویژن کے پندرہ سو امریکی فوجی جنگی ہیلی کاپٹروں کے ہمراہ شمالی افغانستان سے متصل پچاسی میل لمبے ازبک بارڈر کے قریب' ترینہ کے خان آباد ہوائی اڈے پر آپہنچے۔ازبکستان نے طالبان مخالف شمالی اتحاد کو اسلحہ فراہم کرنے کے لئے روس' ایران اور ترکی کو' اپنی سرزمین استعمال کرنے کی بھی

حامی بھر لی۔ شمالی اتحاد کے نئے کمانڈر جنرل رشید دوستم ایک اہمشہر مزار شریف پر قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جواباً' تاشقند نے امریکہ سے ازبک سرزمین کے تحفظ' اپنی سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت اور اپنی افواج کے لیے اہم تیکنیکی معاونت طلب کی۔ ازبک حکومت کے دعوے کے مطابق 17کتوبر کو امریکہ کے ساتھ ایک کلاسیفائیڈ معاہدہ طے پایا جس کے تحت ''سکیورٹی اور علاقائی استحکام کے لیۓ ایک نیا اہم اور طویل مدتی تعلق' قائم کیا گیا۔'' بہرحال معاہدے کی بہت سی شقیں خفیہ رکھی گئیں کیونکہ ازبکستان روس کو ناراض کرنا یا ازبک تحریک کو مزید دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال یہ ایک تاریخی معاہدہ تھا اور مستقبل میں اس کے خصوصاً امریکہ اور نیٹو کے علاقے میں ہمہ وقت موجودگی کے دور رس اثرات مرتب ہونگے۔ پہلی دفعہ مغربی طاقتیں وسط ایشیا کی محصور سرزمین سے اپنی کارروائیاں کر رہی ہونگی۔ تاشقند میں ایک امریکی افسر نے بتایا ''یہ یقیناً تاریخی ہے...... پہلی دفعہ کسی ایسے ملک کے ساتھ یہ ہوا ہے' جو کبھی سودیت یونین کا حصہ تھا۔'' یہ بھی واضح ہوگیا2000 ء میں امریکہ کے ازبک تحریک کو دہشت گرد قرار دینے اور ازبک سکیورٹی حکام' سی آئی اے' اور ایف بی آئی کے مابین روز افزوں تعاون کا شاندار صلہ تاشقند کو اب مل رہا تھا۔ چنانچہ صدر کریموف کے خصوصی ترجمان رتم جمعہ یوف نے یہ بات لکھی کہ ''امریکہ کے ساتھ ہمارے تعاون کا سلسلہ گیارہ ستمبر کے واقعات سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔'' فوراً ہی عالمی بینک نے اپنا وفد تاشقند بھیجنے کا اعلان کر دیا تاکہ وہ حکومت کے ساتھ منجمد تعلقات کو دوبارہ بحال کرے اور معاشی استحکام کو یقینی بنانے کے لیے قرضے فراہم کر سکے...... یہ ازبکستان افغان جنگ کی وجہ سے فرنٹ لائن بن گیا تھا۔

ازبکی تحریک کی ممکنہ جوابی کارروائیوں کے متعلق تشویش کے باوجود' تحریک کی پشت پناہی کرنے والے طالبان کے خاتمے کے امکانات سے روس اور وسط ایشیا کے حکمران خاصے مطمئن تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ امریکہ اور متحدہ فرنٹ کے' طالبان کے زیر قبضہ شمالی افغانستان پر' حملوں سے تحریک کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ روس کا یہ مفاد تھا کہ امریکی افواج طالبان کے لیے لڑنے والے چیچن مجاہدوں کو نشانہ بنائیں گی۔ روس کو اصل تشویش یہ تھی کہ کہیں امریکہ وسط ایشیا میں اس کا اثر ختم نہ کر دے۔ ادھر ازبکستان کو امریکی اتحادی بننے میں بنیادی فائدہ یہ نظر آیا کہ اسے روسی اثر ونفوذ سے آزادی مل جائیگی

اور بین الاقوامی برادری تحریک جیسی دہشت گرد قوتوں کے خلاف' اس کی اپنی جنگ میں بھی' اس کی مکمل مدد کرے گی۔

ازبکی تحریک نے پہلے ہی صورت حال کا اندازہ کر کے طالبان کی مکمل حمایت اور امریکی حملوں کے خلاف مزاحمت کا اعلان کر کے' اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ تحریک نے شمالی افغانستان میں مزار شریف' طالقان اور قندوز میں اپنے مسلح کارکن متعین کر دیئے۔ نعمان غنی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ طالقان میں طالبان فوجوں کی کمانڈ کر رہے تھے۔ 9 اکتوبر کو ایک ریڈیو انٹرویو میں یلدے شیف نے کہا کہ تحریک کی ''خواہش ہے کہ وہ طالبان کے کاندھے سے کاندھا ملا کر دشمن سے جنگ کریں۔'' انہوں نے امریکہ کے لیے ازبکی حکمرانوں کی معاونت کو ''غداری کا عمل'' قرار دیا۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں تحریک انتقاماً جوابی حملے بھی کرے گی۔

تاجکستان میں مخلوط حکومت نے امریکی زیر قیادت الائنس کے ساتھ تعاون کی نوعیت کے متعلق استفسار کیا۔ ''اگر دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ عام افغانوں پر بھی حملے کئے گئے تو یہ افغانستان کے خلاف امریکی جارحیت کے مترادف ہوگا۔'' جماعت احیائے اسلام کے سربراہ سید عبداللہ نوری نے کہا۔ ''تاجکستان کے مسلمان باشندوں میں بے چینی کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔'' تاہم تاجک تعاون کے حصول کے لیے امریکہ نے جاپان کی مدد مانگ لی۔ دوشنبہ میں جاپانی وفد نے تاجک حکومت کو امریکہ کو فضائی اڈے فراہم کرنے اور متحدہ فرنٹ کو رابطہ اور خفیہ معلومات کی سہولتیں مہیا کرنے پر راضی کر لیا۔

افغانستان میں امریکی بمباری شروع ہونے کے بعد' 7 اکتوبر کو' انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں نے اس امر پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا کہ امریکہ وسط ایشیا میں اپنے نئے اتحادیوں کو استعمال کرنے کی خاطر' خصوصاً ازبکستان میں' وسیع تر جمہوریت اور انسانی حقوق کے احترام کے مطالبات کو نظر انداز کرے گا۔ اور درحقیقت ازبکستان نے کسی بھی قسم کی اسلامی سرگرمی کو بری طرح کچلنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ صورت حال کو قابو میں کرنے کے لیئے' حکمران ٹولہ' اس طرح کی سرگرمیوں کو (چاہے وہ ہنگامہ انگیز ہوں یا انتہائی پرامن) براہ راست اسامہ بن لادن سے منسلک کر دیتا ہے۔ اس طرح کسی بھی حکومتی جبر و تشدد کے خلاف مغربی اتحادیوں کی زبان کھل نہیں پاتی۔ اکتوبر میں حزب التحریر کے نو

کارکنوں کی سزا میں یہی حربے استعمال کئے گئے۔ القاعدہ سے تعلق کا اضافی جرم اچانک ہی ان کے سر تھوپ دیا گیا۔ کرغیز حکومت نے بھی یہ نکتہ سمجھ لیا ہے۔ اکتوبر کے آغاز میں بعض اسلام پسند کارکن گرفتار کئے گئے' جن پر ازبکی تحریک یا حزب التحریر سے تعلق کا الزام تھا'...... ان پر القاعدہ سے رابطے کا الزام بھی عاید کر دیا گیا۔

امریکہ کے ساتھ اپنے فوجی الائنس کی آڑ لے کر' وسط ایشیائی حکومتوں نے' اپنے اپنے علاقوں میں' سرگرم اسلامی جماعتوں کو شدید ہراساں کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ ازبکی تحریک' افغانستان میں بمباری کے ذریعے' اپنے ساتھیوں کے خاتمے کا انتظار نہیں کرے گی۔ یہ لازمی امر ہے کہ آئندہ مہینوں میں ازبکی تحریک وادی فرغانہ کے اردگرد کے علاقوں میں اپنی گوریلا کروائی شروع کر کے' اہم ازبک شہروں میں واقع شہری اور حکومتی مراکز کو نشانہ بنائے گی۔ جس طرح آج کریموف کو' ازبکی تحریک کے خلاف جنگ میں مکمل بین الاقوامی معاونت کا یقین ہے' اسی طرح جمعہ نعمان غنی بھی سوچ سکتے ہیں کہ افغانستان پر امریکی جارحیت میں ازبکستان کی شمولیت کے نتیجے میں مقامی مسلمان آبادی کی مکمل حمایت انہیں حاصل ہو جائے گی اور اس طرح کریموف حکمران ٹولے کا تختہ الٹنے کی جنگ میں اور زیادہ شدت آ جائے گی۔

باب 9

نیا عظیم کھیل

امریکہ، روس اور چین

قدیم زمانے میں، یورپ اور ایشیاء کے کناروں تک پھیلی ہوئی وسط ایشیا کی سرزمین، دنیا کا مرکز تصور کی جاتی تھی۔ اس کے خانہ بدوش جنگ جو قبائل نے بارہا روس، یورپ، ہندوستان، چین اور ترکی کو فتح کیا۔ چینی حکمرانوں نے ان خونخوار وسط ایشیائی قبائل کو خود سے دور رکھنے کے لیے دیوارِ چین تعمیر کر ڈالی۔ روس کی ابتدائی تاریخ مسلمان تاتاروں کے خلاف جنگوں سے عبارت ہے۔ (1552ء میں آئیون دی ٹیریبل نے تاتار دارالحکومت قازان پر قبضہ کرنے کے بعد، ماسکو میں ان واقعات کی یاد میں سینٹ باس کا چرچ تعمیر کیا تھا اور اس کے میناروں کے اوپر...... کٹے ہوئے عمامہ پوش سروں کے علامتی اظہار کے طور پر ...... پیازی گنبدنما بنائے تھے۔ وسط ایشیا کی عظیم سلطنتیں......جن میں منگول، تیمور اور شعبانی ازبک شامل ہیں...... نہ صرف آدھی معلوم دنیا پر حکمران رہیں بلکہ انہوں نے مزید سلطنتوں...... مثلاً ہندوستان میں مغل اور ترکی میں عثمانی...... کو بھی جنم دیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں، جدید جیو پالیٹکس کے باوا آدم سر ہال فورڈ میکنڈر نے وسط ایشیا کو دنیا کے

سیاسی مرکز کے طور پر پیش کیا تھا کیونکہ کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت یہاں بہت سرحدیں ملتی ہیں۔ جو بھی وسط ایشیا پر قابض ہوگیا' اسے بے پناہ طاقت حاصل ہوگئی۔''یہ دنیا کا سب سے بڑا قدرتی قلعہ ہے۔قطبین کے عظیم برفانی تودے' صحرا' بے آب و گیاہ سطح مرتفع اور پہاڑوں کے سلسلے اس کے محافظ ہیں۔''

افریقہ' ہندوستان' چین اور امریکہ کے نئے سمندری راستوں کی دریافت نے' شاہراہ ریشم پر آمدورفت کا خاتمہ کر کے' وسط ایشیا کی اہمیت ہی تبدیل کر ڈالی۔ بے بحر وسط ایشیا اب بالکل تنہا ہو کر رہ گیا اور بڑی طاقتوں کی رقابتوں میں اس کی حیثیت محض ایک مہرے کی سی رہ گئی۔عظیم کھیل کے نام سے موسوم' اس پس منظر میں' روس اور برطانیہ طاقت کے نشے میں چور' ایشیائی سرزمین پر اپنی سلطنتوں کو وسعت دیتے رہے۔ وسط ایشیا کے یہ علاقے انتہائی کمزور ہونے اور اپنے جنوبی مسلمان پڑوسیوں سے کٹے ہونے کے باعث بڑی طاقت کے خلاف مزاحمت کے قابل ہی نہیں رہے تھے چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے روسی قربان گاہ میں ذبح ہوتے چلے گئے۔ روسی انقلاب کے بعد' البتہ وسط ایشیا کی جغرافیائی اہمیت' ایک بند کھاڑی کی سی رہ گئی جو سوویت یونین کے ساتھ مضبوطی سے پیوست تھی' چنانچہ بڑی طاقتوں کی اس میں دلچسپی بھی ختم ہوگئی۔ سوویت یونین خود بھی اس علاقے کو اپنی روسی سلطنت کا ایک ضمیمہ سمجھتا تھا۔

1991ء کے بعد یہ سب کچھ بدل گیا۔ وسط ایشیا میں روس کا غالب کردار تو اسی طرح جاری رہا لیکن دوسری بڑی طاقتیں...... امریکہ اور چین بھی سامنے آ گئیں اور ان نئی آزاد وسط ایشیائی ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں میں اہم جیو پولیٹکل تبدیلیوں کے لیے زور آزما ہوگئیں۔ بڑی طاقتوں کی باہمی رقابت' سب سے پہلے بحیرہ کیسپیئن اور وسط ایشیا کے تیل اور گیس کے وسائل پر کھلے مقابلے میں سامنے آئی۔لیکن جلد ہی اس میں سٹرٹیجک اہمیت کے اور بہت سے معاملات......مثلاً افغانستان جیسی شوریدہ ریاستوں سے متصل وسیع وعریض اور پسماندہ علاقوں میں استحکام کیسے پیدا کیا جائے...... شامل ہوگئے۔ وسیع علاقوں پر محیط خطہ ارض کے عین درمیان وسط ایشیا ایک ناکارہ حصہ بنا ہوا تھا۔ بڑی طاقتوں نے مسلسل ایسی پالیسیاں تشکیل دینے کی کوشش کی ہے جن کے ذریعے' وہ ان کی سمندر تک رسائی اور تجارتی راستوں کو' بلا مقابلہ' اپنی تحویل میں لینے میں کامیاب ہوسکیں۔لیکن دوسری مرتبہ بڑی طاقتوں

کو راستہ تلاش کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا ہے اور کھیل تبدیل ہو چکا ہے۔ وسط ایشیائی ملکوں کے حکمران...... جنہیں اپنے اپنے اصولوں کے مطابق' اپنا گیم کھیلنا ہے...... بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں مہرہ بننے سے انکاری ہیں اور اسلام پسند' اپنا ایک بالکل ہی منفرد' کھیل کھیل رہے ہیں۔

امریکہ: تیل اور اسلحہ کا ترپ

معاشیات اور انسانی حقوق

اس علاقے کی اہمیت کو سب سے پہلے سمجھنے والے گروپوں میں امریکی آئل کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ ان نئے ممالک میں امریکی سفارت خانے کھلنے سے بھی پہلے' اہم امریکی کمپنیاں توانائی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے قازقستان میں تیل اور گیس کی تلاش میں، شیوران کے ابتدائی اقدام کے ساتھ ہی یہاں آ چکی تھیں۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد' امریکہ کو دنیا بھر میں نت نئے مسائل کا سامنا تھا' اس لیے وسط ایشیا اس کی ابتدائی ترجیحات میں کہیں نہیں آتا تھا۔ واشنگٹن کا اہم ترین کام غیر کمیونسٹ روس کے ساتھ اپنے تعلقات کو نئی شکل دینا تھا۔ اس کے ساتھ آزاد ہونے والی دوسری سودیت ریاستیں...... اپنے پہلے اہم کام کی تکمیل کے بغیر...... امریکہ کے لیے خاص اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔

صدر کلنٹن کے دور میں' امریکہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وسط ایشیا میں کم مدتی مقاصد کا حصول کس طرح ممکن ہے۔ اگرچہ کچھ حکام نے علاقے کے متعلق اپنا تناظر قائم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کے تصورات کو عملی شکل نہیں دی گئی۔ ابتداء میں امریکہ نے وسط ایشیا کو روس کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہا کیونکہ امریکہ ''پہلے روس'' کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔1990ء کے عشرے کے وسط میں' امریکہ نے دوسری انتہا کی طرف چھلانگ لگائی' باکو آذربائیجان سے جیجون' ترکی تک تیل اور گیس لانے کے لیے پائپ لائن بچھانے کا تصور بہت ہی لاجواب تھا۔ اس کے حامیوں نے اسے جدید شاہراہ ریشم قرار دیا۔ انہوں نے نقشے میں ایرانی اور روسی سرزمین سے پائپ لائن گزارنے سے اجتناب کا اشتعال انگیز رویہ

اختیار کیا۔ پائپ لائن کے راستے کے چناؤ پر' اس طرح بڑی طاقتوں کے درمیان' کا کیشیا اور وسط ایشیا میں جدید عظیم کھیل' ایک بار پھر حقیقت کا روپ دھارنے لگا۔1999ء میں ازبک اسلامی تحریک کے ظہور کے بعد' کلنٹن انتظامیہ نے وسط ایشیا میں دہشت گردی کے مقابلے پر توجہ مرتکز کرنے اور علاقائی حکومتوں کی فوجی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کی پالیسی اختیار کی' لیکن معاشی اور سیاسی اصلاحات کے لیے عملی اقدامات سے علاقائی حکومتوں کی پہلو تہی نے (انسانی حقوق کا تو تذکرہ ہی فضول ہے) امریکی انتظامیہ کی معاونت کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔

جولائی 1997ء میں' امریکی نائب وزیر دفاع سٹروب ٹالبوٹ نے وسط ایشیا کے متعلق' اپنی ایک اہم پالیسی تقریر میں کلنٹن انتظامیہ کی ترجیحات کو شکل دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ امریکہ کو ''عظیم کھیل کے ری پلے'' میں کوئی دلچسپی نہیں ''ہمارا مقصد نہ صرف ایسی صورت حال سے الگ رہنا بلکہ ماضی میں اس کے پیدا شدہ نتائج کے مماثل کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔'' انہوں نے اعلان کیا کہ وسط ایشیائی ریاستوں کو ''موقع ملا ہے کہ وہ شطرنج کے مہرے بننے کا تجربہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیں کیونکہ بڑی طاقتیں' انہی کے بل پر' دولت اور اثر ونفوذ کا کھیل کھیلتی رہی ہیں۔'' ٹالبوٹ نے مزید کہا۔

آزاد معاشروں کا استحکام...... بحیرہ اسود سے پامیر کے پہاڑوں تک ____ ایشیا اور یورپ کے مابین' قدیم شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ' تجارت اور ٹرانسپورٹ کے لیے ایک انتہائی کارآمد راستہ کھول دے گا۔ لیکن اسکے برعکس صورت حال بھی جنم لے سکتی ہے۔ اگر معاشی اور سیاسی اصلاحات کامیاب نہیں ہوتیں- علاقے میں اندرونی اور سرحد پار تنازعات کی آگ بھڑکتی رہتی ہے تو یہ علاقہ دہشت گردی کی تربیت گاہ' مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی کی آماجگاہ اور براہ راست میدان جنگ کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اور اگر قدرتی وسائل۔200 بلین بیرل تیل...... سے مالا مال اس علاقے میں یہ صورت حال ہوگی تو امریکہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علاقے میں امریکی پالیسی کا پہلا مقصد' تنازعات کا مناسب حل ہونا چاہیے۔

ٹالبوٹ کی وارننگ اور مستقبل کی امریکی پالیسی کے متعلق نظریہ' دونوں ہی صحیح پیش بینی کے حامل تھے- مسئلہ صرف یہ ہوا کہ امریکہ ان پر فوری عمل درآمد میں ناکام ہوگیا۔

اگر امریکہ وسط ایشیا کے متعلق اپنے تصورات کے بارے میں سنجیدہ ہوتا تو پالیسی ساز صرف تنازعات کے حل کی بات ہی نہ کر رہے ہوتے بلکہ اس پر عمل درآمد کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتے۔ خصوصاً امریکہ کو' افغانستان کی خانہ جنگی ختم کرانے کے لیے اقوام متحدہ کی کوششوں کی بھرپور مدد کرنا چاہیے تھی۔ وسط ایشیا کو بنیادی خارجی خطرہ اسی کی وجہ سے لاحق تھا۔ امریکہ کو تاجکستان کی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے ترقیاتی فنڈز دینے چاہئیں تھے' آذربائی جان اور آرمینیا کے مابین تنازعہ کے خاتمے کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے تھا۔ ایران سے تعلقات میں بہتری لانی چاہیے تھی۔ پائپ لائن کی تجاویز اور فوجی امداد کو' ان ریاستوں میں اصلاحات کے پروگرام سے منسلک کرنا چاہیے تھا۔ امریکہ اپنے دوستوں کے بجائے دشمنوں کے متعلق زیادہ واضح تھا۔ اس نے دو اہم علاقائی طاقتوں...... روس اور ایران کو اپنے رقیب اور مقابل کے طور پر سامنے رکھا اور ایک اہم علاقائی طاقت کو اپنے اتحادی کے طور پر پہچاننے میں ناکام ہوگیا۔

کھیل کے آغاز میں ہی' ازبکی تحریک کو دہشت گرد قرار دینے کے بعد' امریکہ نے ازبک حکومت اور تحریک کے مابین ثالثی کا موقع خود ہی ضائع کر دیا۔ علاقے میں امریکی اتحادیوں کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے' وہ افغانستان میں بھی متحرک نہ ہو سکا' وسط ایشیا بہت دور تھا اور امریکہ کا اثر و رسوخ وہاں نہ ہونے کے برابر تھا۔ امریکہ' کسی بھی طرح کی پالیسیاں' آزادانہ طور پر وہاں اختیار کرنے کی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ امریکہ کو علاقے میں اتحادی چاہئیں تھے اور ان کے بغیر محدود امریکی پالیسیاں بھی کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔ نئی بش انتظامیہ میں امریکی آئل کمپنیوں کے طاقتور رسوخ کی بدولت' وسط ایشیا پر نگاہ رکھنے والوں کو یہ امید ہوئی کہ امریکہ زیادہ بہتر حکمت عملی اختیار کرے گا لیکن اس کی بھی کوئی خاص علامات نظر نہیں آئیں کیونکہ سال گزرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان اور ازبکی تحریک کے خطرات بڑھتے گئے۔

2000ء کے موسم بہار میں' ازبکی تحریک کے حملوں کا اثر یہ ہوا کہ وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ' سی آئی اے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ اور ایف بی آئی ڈائریکٹر لوئیس فریح سمیت بہت سے امریکی حکام کے تابڑ توڑ دورے شروع ہوگئے۔

جون میں امریکہ نے واشنگٹن میں دہشت گرد مخالف کانفرنس منعقد کی جس میں وسط

ایشیائی اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔ ان رہنماؤں کو سی آئی اے اور ایف بی آئی ہیڈ کوارٹرز میں دعوت دے کر' گویا ان کی عزت افزائی کی گئی۔ سی آئی اے' درحقیقت' فروری میں ہی ازبکی تحریک کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ ''ازبکی تحریک کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں پر' ہمیں گہری تشویش ہے۔ اس انتہا پسند مداخلت کار اور دہشت گرد گروہ کی ازبکستان میں سالانہ کارروائیاں انتہائی سنگین اور خونیں ہوتی جا رہی ہیں۔ وسط ایشیا میں کرپشن' غربت اور دوسری سماجی خرابیاں مسلمان انتہا پسندوں (دہشت گرد نیٹ ورکس' منشیات اور اسلحہ کے سمگلروں) کو' انتہائی زرخیز بنیاد فراہم کر رہی ہیں۔ جن کے اثرات روس' یورپ اور نہ جانے کہاں تک پہنچیں گے۔'' ٹینٹ نے امریکی سینٹ کو بتایا۔ گو ٹینٹ نے مسئلے کو واضح طور پر پیش کر دیا تھا لیکن کلنٹن انتظامیہ نے صرف دہشت گردی کے خلاف اقدامات کئے اور علاقے کو تباہ کرنے والی ''سماجی برائیوں'' کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

البرائٹ کی وسط ایشیا میں موجودگی کے دوران ہی' امریکہ نے وسط ایشیائی سرحد کے لئے حفاظتی اقدامات کی تشکیل کا اعلان کر دیا جس کے تحت کرغیزستان' ازبکستان اور قازقستان کو' مداخلت کے مقابلے کی صلاحیتوں میں بہتری کے لیے' تین ملین ڈالر فی ملک امداد دی گئی۔ 2001ء میں' یہی امریکی معاونت تاجکستان اور ترکمانستان کو بھی پیش کی گئی۔ وسط ایشیائی افواج نے' نئی امریکی یونیفارموں' ہیلمٹوں' اندھیرے میں دیکھنے والی عینکوں اور سکوپس اور باہمی رابطے کے ساز و سامان سے لیس' اپنی تربیت کا آغاز کر دیا۔ نیٹو کے امن پروگرام کے تحت' امریکہ نے قازقستان' کرغیزستان اور ازبکستان کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقیں شروع کر دیں۔ جس سے کئی آزاد ریاستوں کو فائدہ پہنچا۔ البرائٹ نے اپنے دورے کے دوران' بغاوت کو بڑھنے سے روکنے کے لیے حکومتی سیاسی اور سماجی اقدامات پر خاصا زور دیا تاہم امریکی امداد کو اصلاحات کے پروگرام سے منسلک نہیں کیا۔ اس کے بجائے تمام تر زور دہشت گردی کے خاتمے پر دیا گیا۔ بعض امریکی کانگریسی اراکین نے محسوس کیا کہ وسط ایشیا میں گمبھیر ہوتا ہوا بحران' ازبکی تحریک کے بجائے' وہاں کے حکمرانوں کا پیدا کردہ تھا۔ کانگریس کے رکن ڈان بٹن نے' مثال کے طور پر' نوٹ کیا کہ ''قازقستان علاقے کے تاج کا موتی ہے اور اس طرح اسلامی انتہا پسند گروپوں کے لیے ایک اور ممکنہ ٹارگٹ بھی ہو سکتا ہے...... لیکن نذر بایوف کی حکومت' غالباً خود ہی اسلامی انتہا پسندی کے

شعلوں کو ہوا دے گی۔'' لیکن اس طرح کے خیالات امریکی پالیسی پر بالکل اثر انداز نہیں ہو سکے۔ وسط ایشیائی رہنما امریکی لیکچروں کو سنا ان سنا کر دیتے تھے کیونکہ امریکی امداد کا حقیقی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے سے قطعی کوئی تعلق نہیں تھا۔

امریکی سنٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل ٹامی فرینکس نے جب 2001ء کے آغاز میں علاقے کا دورہ کیا' تو انہیں اس خطرے کا احساس ہوا جسے دہشت گردی نے علاقے پر مسلط کر دیا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ دہشت گردوں کا ایک چھوٹا سا گروہ علاقے میں عدم استحکام اور لوگوں کے لیے حقیقی عدم تحفظ کا احساس پیدا کر سکتا ہے۔ امریکہ وسط ایشیا کے اس خطرے کو بڑی سنجیدگی سے لے رہا ہے اور کچھ سالوں سے علاقائی حکومتوں کو اس خطرے سے نمٹنے کا اہل بنانے پر مسلسل کام کر رہا ہے۔''فرینک نے مئی میں تاشقند میں ایک بریفنگ کے دوران بتایا۔ فرینک نے زور دے کر کہا کہ امریکہ اور ازبک فوجوں کے درمیان بہترین اشتراک عمل موجود ہے اور سنٹرل کمانڈ ازبک نان کمیشنڈ افسروں کی تربیت جاری رکھے گی اور امریکی سپیشل فورس ازبک فوج کے ساتھ ایسی مشترکہ مشقیں بھی کرے گی' جن کے لیے امریکی افسران' ہر تربیتی سہولت دینے کے لیے' مستقل طور پر تاشقند میں مقیم رہیں گے۔ بش انتظامیہ کے ابتدائی مہینوں میں ایک مثبت تبدیلی پیدا ہوئی۔ ازبکی افواج کے لیے امریکی تربیت کے دوران' روسی فوجی مشیروں کی موجودگی اور روسی زیراثر تاجکستان کے لیے معاشی اور فوجی امداد کی فراہمی سے یہ واضح ہوگیا کہ امریکہ اور روس ازبکی تحریک اور طالبان کے خلاف لڑائی میں' ایک دوسرے کے سٹرٹیجک دشمن کے بجائے' کم از کم وقتی طور پر' سٹرٹیجک پارٹنر بن گئے۔ جزوی طور پر یہ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ ورکنگ گروپ قائم کرنے کا نتیجہ تھا' جو روس اور امریکہ نے 2000ء میں طالبان سے چیچنوں اور ازبک تحریک تک' ہر چیز کا بغور مطالعہ کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ فرینکس نے تسلیم کیا کہ امریکہ اور روس مزید ایک دوسرے کے حریف نہیں رہے۔ علاقے میں وہ اب ایک دوسرے کے شریک کار ہیں...... یہ اعتراف چند ماہ پہلے تک ناممکنات میں سے تھا۔ وسط ایشیا سے امریکہ کے اثر و نفوذ کو' ایک عشرے تک روکنے کی کوششوں کے بعد' روس نے وسط ایشیا میں اپنی موجودگی قائم رکھنے اور پریشان حال حکمرانوں کی فوجی مدد کرنے کے لیے امریکی معاونت کی ضرورت اور اہمیت کا ادراک کر لیا۔ حالانکہ پیوٹن اور بش کے جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور میزائل

ڈیفنس پروگرام پر شدید اختلافات تھے پھر بھی وہ دہشت گردی اور ازبکی تحریک کا باہم مقابلہ کرنے پر متفق ہوگئے۔

روس: نظریاتی سرحدوں کا تشکیل ساز

سودیت یونین کی شکست وریخت کے بعد' روس اپنی عظیم سلطنت کے بکھر جانے کے صدمے سے نمٹنے اور سابقہ سودیت یونین کی نئی ریاستوں کے ساتھ گزارا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔25 ملین روسیوں کے لیے......جن کے لیے ان کے رہائشی علاقے اچانک غیر ملک بن گئے تھے...... وسط ایشیا میں زندگی گزارنا غیر یقینی اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ واپس نہ جانے والے روسی ماسکو پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ علاقے میں اپنا واضح قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے' انہیں تحفظ فراہم کرے گا۔ لیکن1990 ء کے عشرے کے آغاز میں روسی حکمت عملی آزاد خیالوں قوم پرستوں اور پرانے کمیونسٹوں کے درمیان معلق تھی۔ کمیونسٹ پرانی سودیت سلطنت کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جبکہ آزاد خیال اور بورس یلسن مغرب کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں وسط ایشیا ان کے لیے محض ایک معاشی بوجھ تھا اور ان کا مستقبل مغرب سے منسلک ہو کر زیادہ تابناک ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سابقہ سودیت ریاستوں کو' باقی دنیا سے علیحدہ شناخت کے لیے ''قریبی پردیس'' کا نیا نام دیا۔ گومگو روسی پالیسی اور اس پر بحث مباحثے کے اثرات وسط ایشیا میں بھی نظر آئے۔ یہاں رہنما روسی اثرات سے آزاد ہونا اور قوم پرست عوامی رجحانات کو مضبوط بنانا چاہتے تھے اور متبادل خارجہ پالیسی کے امکانات میں اضافہ کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی روس کی فوجی اور اقتصادی امداد کے بھی خواہاں تھے۔ کوئی بھی وسط ایشیائی ریاست روس سے قریبی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی مگر روس کی مدد کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ1990 کے عشرے کی ابتداء میں روس اور وسط ایشیائی ریاستیں ان دو انتہاؤں کے درمیان معلق رہیں۔ کبھی شرم ولحاظ کا تعلق نظر آتا اور کبھی از حد سرکشی کا- روسی مفادات کو نئی شکل دینے کا موقع پہلی چیچن جنگ (96-1994ء) کے دوران' اس وقت آیا جب چیچنیا کی روسی یونین سے علیحدگی کو روکنے کے لیے چار ہزار سے زیادہ روسی فوجی اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ روس کو اچھی طرح یہ بات سمجھ آ گئی کہ اس کے علاقائی دفاع کی ضرورت ممکن ہے یورال کی پہاڑیوں

تک ہی ہو لیکن اس کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع...... خصوصاً نام ونہاد اسلامی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے...... افغانستان تک پھیل سکتا ہے۔ چیچن آزادی پسندوں کے ساتھ لڑائی کے دوران، روس نے اسلام کو ماورائے تصور بدی قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف واقعتاً صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔ دریں اثناء چیچن دارالحکومت گروزنی کی تباہی اور روسی افواج کے ہاتھوں ہزارہا چیچن شہریوں کی ہلاکت نے وسط ایشیا کے عوام اور لیڈروں، دونوں کو ہی دہشت زدہ کر دیا، گو ان دونوں کی دہشت کی وجوہات الگ الگ تھیں۔ عوام اپنے پڑوسی مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار اور چیچن گوریلوں کی بہادری کی تعریف کر رہے تھے، جبکہ ان کے لیڈروں کو روسی فوجی طاقت کا اندازہ ہوا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر ان کے علاقوں میں، اندرونی اسلامی قوتوں سے ان کی حکومتوں کو اس قسم کا خطرہ پیدا ہوا تو روسی امداد انتہائی ضروری ہو جائے گی۔

پہلی چیچن جنگ نے، وسط ایشیا اور کاکیشیا میں روسی مداخلت کی خواہش کو بھی بےنقاب کر دیا۔ اس طرح کی کارروائی براہ راست فوجی تعاون کی شکل میں بھی ہوسکتی تھی، جیسے جارجیا میں ماسکو کے حامیوں کو دی گئی۔ روس کے حامیوں کو اکٹھا کر کے تاجکستان میں مقامی حکومتوں میں اپنی مرضی کا ردوبدل کرا لیا گیا یا آذربائیجان اور ازبکستان میں خفیہ کارروائیاں جاری رکھی گئیں۔ روس کا اصرار تھا کہ اگر ان کمزور اور پسماندہ ریاستوں کو اپنا وجود قائم رکھنا ہے تو انہیں روسی معاونت اور مداخلت درکار ہوگی۔ وسط ایشیا اور کاکیشیا میں روسی محاذ آرائی اور امریکہ سے اس کی بڑھتی ہوئی مخاصمت کے کئی اور عوامل بھی تھے۔1990ء کے عشرے میں آئل اور گیس پائپ لائن کے راستے پر تنازعہ، تیل پیدا کرنے والی، آذربائیجان اور قازقستان جیسی اہم ریاستوں میں اثر ورسوخ کی جنگ، چیچنیا میں روس کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر مغرب کی مذمت، ایران اور شمالی کوریا (امریکہ ان دونوں کو ''روگ ریاستیں'' قرار دیتا ہے) کو میزائل اور جوہری سامان کی روسی فروخت اور افغانستان میں طالبان کا پھیلاؤ، جن کی نشوونما میں1996ء تک امریکی امداد بھی شامل تھی۔

اپنے جانشین کے طور پر، صدر یلسن کے، سابقہ کے جی بی افسر اور سخت گیر قوم پرست، ولادی میر پیوٹن کے انتخاب نے، زیادہ غیر جانبدار خارجہ پالیسی کے متعلق روسی لبرلز کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پیوٹن بہرصورت یہ چاہیں گے کہ وسط ایشیا اور کاکیشیا بدستور روسی

حلقہ اثر میں رہیں۔ اگر امریکہ دہشت گردی اور اسلامی انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں مدد کرنا چاہتا ہے تو واشنگٹن سے تعاون ممکن ہے۔

دوسری چیچن جنگ نے، جو1999ء میں شروع ہوئی اور2001ء کے موسم خزاں تک تین ہزار روسی فوجیوں کی جان لے چکی تھی، خصوصاً وسط ایشیا میں روسی توجہ زیادہ مبذول کی۔ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ مزید شدید ہوگئی۔ اب ماسکو ''اچھے مسلمان اور برے مسلمان'' کے فرق کو قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ شروع سے ہی روس نے چیچن مزاحمت اور ازبکی تحریک کو عالمی دہشت گردی، اسامہ بن لادن، طالبان اور الجزائر سے انڈونیشیا تک ہر اسلامی گروپ سے منسلک سمجھا، حالانکہ یہ دونوں الگ الگ جہادی تنظیمیں ہیں۔

دوسری طرف، امریکہ نے اسلام کے خلاف آنکھیں بند کر کے، مخاصمت کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ مسلمان دہشت گرد گروہوں اور باقی اسلامی دنیا کے مابین واضح تفریق کی ہے۔2000ء میں مشرق وسطیٰ میں فلسطین، اسرائیل تنازعے میں تشدد آمیز کاروائیوں کے نئے راؤنڈ کے آغاز کے بعد، مسلمان دہشت گردوں کی سرگرمیوں کے لیے ساری اسلامی دنیا کو مطعون کرنے میں، امریکہ نے خاصا محتاط رویہ اختیار کر لیا ہے جبکہ روس کا رویہ انتہا مخاصمانہ رہا ہے۔

سودیت یونین کے خاتمے کے بعد سے، وسط ایشیا میں روس ہی سب سے بنیادی خارجی کردار رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا یہ کردار پیش آمدہ برسوں میں بھی جاری رہے گا۔ لیکن وسط ایشیا میں روسی پالیسی کو، دونوں اطراف کے شبہات نے، بری طرح دھچکا لگایا ہے۔ روس کی یک رنگ، واضح، اور جامد پالیسی کو...... وسط ایشیائی ریاستوں کو اپنے حلقہ اثر میں رکھنا اور اسلامی انقلابیت کو قریب نہ پھٹکنے دینا...... خصوصاً ازبکستان میں بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ وسط ایشیا کی سب سے بڑی ریاست ازبکستان نے1990 کے عشرے کے وسط سے، خود کو روس کی طفیلی ریاست بنائے جانے کی ہر روسی کوشش کی، انتہائی کامیابی سے مزاحمت کی ہے۔ صدر کریموف نے، بے قاعدہ سہی مگر مضبوطی سے ازبک خودمختاری کو بحال رکھا ہے۔ انہوں نے روس کو اتحادی رکھنا چاہا ہے مگر کمبل نہیں بنایا۔ روس کے ساتھ کریموف کے تعلقات کے نتیجے میں، ان کی پالیسی اتار چڑھاؤ کا شکار ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی پالیسی بے انتہا غیر یقینی اور مبہم محسوس ہوتی ہے۔ بجائے ازبک اشرافیہ کی

مشاورت کے، کریموف کے ذاتی رجحانات پر مبنی ان پالیسیوں نے، ازبکستان کے طویل مدتی مفادات کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

فروری1999ء میں کریموف، روس کی سربراہی میں آزاد ریاستوں کے اجتماعی تحفظ کے معاہدے سے علیحدہ ہوگئے اور جارجیا، یوکرائن، آذربائیجان اور مالدووا کے ساتھ، مغرب کے حامی ممالک کے گروپ(GUUAM) کی تشکیل کے لیے اکٹھے ہوگئے۔ ان ممالک نے عہد کیا کہ وہ روسی اثر سے آزاد رہ کر، اپنے مشترکہ سکیورٹی مفادات کے لیے کام کریں گے۔ لیکن دسمبر تک کریموف واپس ہوگئے اور انہوں نے ماسکو کے ساتھ سلامتی اور تحفظ کے ایک نئے معاہدے پر دستخط کر دیئے تاہم انہوں نےGUUAM سے تعلق ختم نہیں کیا۔ پالیسی میں اس قسم کی تبدیلیاں آنے والے سال میں بھی جاری رہیں۔ ''ازبکستان اپنے تحفظ کے لیے سرگرداں ہے۔ وہ خود اپنی سلامتی کی حفاظت نہیں کر سکتا کیونکہ جن طاقتوں سے اسے خطرہ ہے، وہ بے پناہ وسائل کی مالک ہیں۔ اس قسم کی سلامتی کا احساس صرف روس کی شکل میں مل سکتا ہے۔'' کریموف نے مئی2000ء میں اچانک اعلان کیا۔ اور اس طرح اپنے عوام اور اپنی ہمسایہ ریاستوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ اگلے مہینے، ازبکستان نے ماسکو کے ساتھ ایک وسیع تر فوجی تعاون کے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے تحت، ازبکستان کی ساری فضا، حقیقتاً روس کی فضائیہ کی تحویل میں چلی گئی۔ پھر چند ماہ بعد، ستمبر میں کریموف نے بڑی گرجدار آواز میں اعلان کیا۔

''ازبکستان اپنا دفاع خود کر سکتا ہے۔ ہم نے ازبکستان سے باہر کی کسی فوجی طاقت کو کبھی مدعو نہیں کیا، اور نہ ہی ایسا کچھ کرنے جا رہے ہیں۔ ہمیں کسی بھی ملک کی فوجی قوت نہیں چاہیے۔'' یہ روس کی جانب طنزیہ اشارہ تھا۔

مئی2000ء میں، ماسکو کے دورے کے دوران، کریموف نے اور بھی زیادہ سخت لہجہ اختیار کیا۔ انہوں نے نیٹو کے امن پروگرام کی حمایت میں، ماسکو کی سربراہی میں اجتماعی سلامتی کے معاہدے کو مسترد کر دیا۔ آزاد ریاستوں کی نئی کسٹمز یونین میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ روسی افواج کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دینے پر ہمسایہ ریاستوں کی مذمت کی اور تاجکستان میں نئی روسی فوجی بیس بنانے کے ارادوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم اسی مہینے آرمینیا میں منعقدہ کانفرنس میں روس قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے ساتھ

سریع الحرکت فورس قائم کرنے پر متفق ہو چکا تھا۔ یہ فوجی اڈے ازبکی تحریک جیسی دہشت گرد تنظیموں کو نشانہ بنانے کے لیے بشکیک میں قائم ہونا تھے۔ کریموف نے ایسی کسی بھی فورس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا حالانکہ ازبکی تحریک حقیقتاً انہی کا مسئلہ تھی۔

ازبک پالیسی کے دوسرے دائروں میں بھی یہی ڈانواڈول اور غیر یقینی صورت حال' روس کے ساتھ مسائل کو مزید بڑھانے کا باعث بنی۔ طالبان کے خلاف بھرپور معاندانہ رویئے کے بعد' اچانک ان سے' اکتوبر2000ء میں مذاکرات شروع کر دیئے تاکہ انہیں ازبکی تحریک کی حمایت ختم کرنے پر قائل کیا جا سکے۔ طالبان کی حمایت جیتنے کے لیۓ کریموف نے روس پر الزام لگا دیا کہ وہ افغانستان کے خطرے کو بلاوجہ بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے''جو لوگ وسط ایشیا میں افغانستان کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں' وہ ہمارے علاقے تک سرمایہ کاروں کا راستہ روک رہے ہیں اور انہیں خوف زدہ کر رہے ہیں تاکہ وسط ایشیا میں سرمایہ کاری نہ ہو۔'' انہوں نے دعویٰ کیا۔

2001ء کے موسم بہار تک مذاکرات ناکام ہو چکے تھے سو کریموف نے اپنا پرانا موقف دوبارہ اختیار کر لیا کہ طالبان وسط ایشیا میں دہشت گردی اور عدم استحکام کا ذریعہ بن رہے ہیں- طالبان کو اذیت دینے کے لیے انہوں نے طالبان مخالف اتحاد کے وزیر خارجہ ڈاکٹر عبداللہ سے ملاقات بھی کر لی......کئی برسوں میں ازبکستان کی اعلیٰ شخصیت اور طالبان مخالف لیڈروں کے درمیان یہ پہلی ملاقات تھی۔

کریموف کی پالیسیاں' روس کے دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کے تعلقات پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ جب کرغیزستان کو اچھی ہمسائیگی اور ازبکی تحریک کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مدد کی ضرورت ہوتی ہے' کریموف' اس کام میں' ان کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ ازبکستان عرصے سے کرغیزستان کو اپنی طفیلی ریاست بنانے کا خواہاں ہے۔ کریموف نے کبھی بھی صدر آقائیوف کو مطعون کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ فروری1999ء میں انہوں نے ازبک ریڈیو پر اعلان کیا کہ کرغیزستان میں صورت حال بہت ابتر ہوگئی ہے کیونکہ اس کے رہنما مسکرانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ''کرغیزستان ایک غریب ملک ہے اور لوگوں کی دیکھ بھال کرنا میرا کام نہیں۔'' کریموف نے انکشاف کیا۔ انہیں غصہ اس بات پر تھا کہ تاشقند میں بم کار دھماکوں کے کارپردازوں نے' ان کے یقین کے مطابق' کرغیزستان میں

پناہ لی تھی۔ ازبک حفاظتی دستوں نے' ان کے تعاقب میں بغیر اجازت کرغیز سرحد عبور کی تاکہ اوش میں ازبک نسل کے کرغیز شہریوں کو گرفتار کر سکیں۔

ازبکستان' وقتاً فوقتاً بشکیک کی گیس سپلائی بھی روکتا رہا ہے۔ ازبک کرغیز سرحد پر بارودی سرنگیں بچھائی ہیں' خار دار تاریں لگائی ہیں۔ کرغیزستان کے زیر کنٹرول وادی فرغانہ میں آبپاشی کے بہاؤ کو روک دیا ہے۔ کرغیز پریس اور پارلیمنٹ نے بارہا کریموف کو تنقید کا نشانہ بنایا اور صدر آقایوف پر کمزوری کا الزام لگایا ہے لیکن آقایوف کے بس میں کچھ ہے ہی نہیں' کرغیزستان مکمل طور پر توانائی کے خارجی ذرائع کا محتاج ہے اور ازبکستان اپنی 1.9 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کی سالانہ پیداوار کا تقریباً 15% کرغیزستان' قازقستان اور تاجکستان کو برآمد کرتا ہے۔ کرغیزستان حقیقتاً ازبکستان کے خلاف بے بس تھا چنانچہ اس نے روسی سفارتی حمایت کی درخواست کی۔

روسی حمایت انہیں حاصل نہیں ہوسکی کیونکہ روس پہلے ہی آقایوف کی مغرب نوازی پر ان سے ناراض تھا۔ اور وہ ازبکستان کو غیر اہم اور معمولی سے کرغیزستان کے لیے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان پریشرز اور ازبکی تحریک کی مداخلت کاری کی وجہ سے' نہ صرف ہمسایوں کو مطمئن کرنے کے لیے بلکہ اندرونی سیاسی مخالفوں کو دبانے کے لیۓ' آقایوف نے آمرانہ انداز اختیار کر لیا۔ اب وہ اپنی مختصر سی زرمبادلہ کی آمدنی' غیر ملکی قرض ادا کرنے اور معاشی ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے کے بجائے' کرغیز فوج کی تشکیل پر خرچ کر رہے ہیں۔ کرغیزستان کو مسلسل ازبکی تحریک کے حملوں کا سامنا ہے لیکن وسط ایشیائی پڑوسی یا روس اس حقیقت سے آنکھیں چرائے بیٹھے ہیں۔

ترکمانستان نے روس یا امریکہ کی جھولی میں گرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ غیر جانبداری کی خارجہ پالیسی کے اعلان کے بعد' ترکمانستان نے افغان خانہ جنگی کے دونوں حریفوں کی مدد کرنا ختم کر دی ہے۔ ایک جانب وہ طالبان کو تیل فراہم کرتا ہے اور روسی وسط ایشیائی طالبان مخالف اتحاد میں شرکت سے انکار کرتا ہے (اسی وجہ سے ترکمانستان ازبکی تحریک سے ابتک محفوظ ہے)۔ لیکن اسی دوران ترکمانستان نے طالبان مخالف اتحاد سے بھی تعلقات رکھے ہیں اور حکومت نے اقوام متحدہ کے زیر اہتمام افغانستان کے متعلق امن مذاکرات میں بھی حصہ لیا ہے۔ ترکمانستان کو امید تھی کہ افغانستان میں امن و امان کے بعد'

ترکمانستان سے پاکستان تک گیس پائپ لائن کی تعمیر کا کام ممکن ہو جائے گا۔ لیکن افغانستان میں مسلسل خانہ جنگی اور تمام ملک پر کنٹرول میں طالبان کی ناکامی اور اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کی وجہ سے بین الاقوامی برادری کا انہیں تسلیم نہ کرنا' یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اس پراجیکٹ کی تکمیل کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔

ترکمانستان وسط ایشیا کا وہ واحد ملک ہے جس کے پاکستان سے بہترین تعلقات ہیں۔ پاکستان طالبان کو فوجی سپلائی دینے کے لیے ترکمان سرزمین استعمال کرتا رہا ہے۔ اسی اثنا میں' ترکمانستان نے روس کو بھی ناراض نہیں کیا اور ایران کے ساتھ اپنی سرحد کی حفاظت کے لیئے' روسی فوجی دستوں کو وہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ روس کی من مانی کم قیمتوں پر' روسی پائپ لائن کے ذریعے یورپ کو گیس منتقل کر رہا ہے اور ترکمانستان میں مقیم روسیوں کو دوہری شہریت کا حق دے کر' انہیں ہجرت کرنے سے باز رکھا ہے۔ لیکن صدر سپر مراد نیازوف کی کوتاہ اندیشی اور عجیب وغریب پالیسیوں کے نتیجے میں ملک شدید تنہائی کا شکار ہے۔ آمریت میں بری طرح دھنسے ہوئے علاقے میں' بدترین آمرانہ حکومت صدر نیازوف کی ہے (ان کی شخصیت میں سٹالن کا رنگ خاصا جھلکتا ہے) گذشتہ عشروں میں' معاشی اور سیاسی اصلاحات کے نہ ہونے کی وجہ سے' گیس کے بے پناہ ذخائر کے باوجود غیرملکی سرمایہ کاری بالکل رک گئی ہے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ نیازوف اپنی ریاست کو کب تک اسلامی انقلابیت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں یا ازبکی تحریک اور حزب التحریر ترکمانستان کے مظلوم اور غربت زدہ عوام کو' اپنے وسیع تر اسلامی مقاصد کے لیئے' متحرک کرنے کی کوششیں اور کتنا ملتوی کر سکتے ہیں۔ طالبان اور ازبکی تحریک نے' پہلے ہی کرپٹ ترکمان حکام کی مدد سے' ترکمان سرزمین کو' افغان ہیروئین کی یورپ تک سمگلنگ کے لیئے' راستہ بنایا ہوا ہے۔ وسط ایشیا میں منشیات کی تجارت کے لیے ترکمانستان' سب سے اہم ٹرانزٹ کوریڈور بن گیا ہے۔ انٹرپول نے اس تجارت میں ملوث اعلیٰ ترکمان حکام کی ایک لمبی خفیہ فہرست بنائی ہوئی ہے۔ کچھ سالوں سے چیچن باغیوں اور خلیجی ریاستوں کے عرب انتہا پسندوں نے بھی' افغانستان اور پاکستان جانے کے لیئے' ترکمان سرزمین کو راہداری کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سہولت روس کو بہت گراں گزرتی ہے۔ نیازوف حکومت کو اگرچہ کسی مخالفت کا سامنا نہیں تاہم' علاقائی خفیہ

اسلامی تحریکیں کسی بھی وقت حکومت مخالف جذبات کو ابھار سکتی ہیں۔ اگر نیازوف کی حکومت عدم استحکام کا شکار ہوتی ہے تو روس وہاں بغاوت کے ذریعے' اپنی من پسند نئی قیادت لانا چاہے گا تا کہ اس کے ذریعے ترکمانستان کو' اسلام مخالف صلیبی جنگ میں شامل کر سکے۔

قازقستان' دونوں براعظموں پر محیط اپنی وسیع وعریض سرزمین، تیل اور گیس کی دولت کی وجہ سے روس اور امریکہ' دونوں ممالک کے لیے ہی بہت اہم ہے۔ صدر نذر بایوف بوقت ضرورت دونوں ممالک سے استفادہ کرتے ہیں لیکن انہیں ضرورت سے زیادہ قریب نہیں آنے دیتے۔ انہوں نے تیل اور گیس کے شعبوں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے امریکہ کو دعوت دی ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کی مطلوبہ معاشی اصلاحات بھی کی ہیں۔ لیکن آمریت کا دباؤ یا کرپشن کم کرنے یا زیادہ جمہوریت اور سیاسی اصلاحات جیسے مسائل پر انہوں نے انتہائی بے رخی ظاہر کی ہے۔ قازقستان کے صدارتی انتخابات میں بری طرح دھاندلی' پورے وسط ایشیائی لیڈروں کے لیے' ماڈل بن گئی ہے۔ نذر بایوف بھی روس کے ساتھ' اسی طرح کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ اگرچہ شمالی قازقستان میں خاصی بڑی روسی النسل آبادی کی طرف سے انہیں مسلسل سیاسی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ تاہم انہوں نے امن و امان بحال رکھنے کے لیے' روسیوں کو اس حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مقامی قازق آبادی میں ناراضگی نہ پھیلے۔ مغربی آئل کنسورشیئم کے تحت' نئی پائپ لائن بچھائے جانے تک' قازقستان کو اپنا آئل اور گیس برآمد کرنے کے لیے روسی ملکیتی پائپ لائنوں پر ہی انحصار کرنا ہے۔ ازبکی تحریک کی جانب سے خطرہ محسوس ہونے کی وجہ سے بھی اسے روسی فوجی امداد کی ضرورت ہے۔ قازقستان نے روس کی سربراہی میں وسط ایشیا کی سریع الحرکت فورس کی تشکیل کی کوششوں میں بھی شمولیت کر لی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے' اپنے افسران کی تربیت اور فوجی معاونت کے لیے امریکی پیش کش بھی قبول کر لی ہے۔ 2000ء سے قازقستان نے ازبکی تحریک کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے' اپنی فوجی استعداد میں اضافے پر بھی اخراجات کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ روس کے ساتھ قازقستان کے مسائل میں روسی تسلط سے آزاد پائپ لائن کی تعمیر اور ان کی ترکی یا ایران سے راہ گزر یا چین کی انتہائی منافع بخش مارکیٹ تک رسائی کے بعد' اور بھی اضافہ ہوگا۔

چین: پرانے کھلاڑی کی وسط ایشیا واپسی

تین بڑی طاقتوں میں، چین کا کردار وسط ایشیا میں سب سے زیادہ ناقابل فہم رہا ہے۔ لیکن بیجنگ ہی مستقل کا سب سے اہم کھلاڑی نظر آتا ہے1991ء سے چین نے وسط ایشیا کی ساری ریاستوں سے قریبی دوطرفہ تجارتی اور سرمایہ کاری تعلقات قائم کئے ہیں۔ ماضی قریب تک چین نے علاقے میں فوجی اور سکیورٹی معاہدے نہ کر کے روس امریکہ محاربت سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ لیکن اب صورت حال بدلتی جا رہی ہے کیونکہ ازبکی تحریک اور طالبان اوئی غرز جہادیوں اور چین کے واحد مسلمان صوبے زن جیانگ کے علیحدگی پسندوں کو اپنے ساتھ شامل کر رہے ہیں اور چینی سلامتی کی افواج کے خلاف گوریلا حملوں کے ذریعے مزید سیاسی بے چینی پیدا کر رہے ہیں۔

1990ء کے عشرے میں چین کا بنیادی مقصد وسط ایشیائی ریاستوں سے صرف یہ امر یقینی بنانا تھا کہ وہ اوئی غر سیاسی سرگرمیوں کو سختی سے کنٹرول کریں اور اپنی اوئی غر اقلیتوں کو زن جیانگ صوبے میں اوئی غر آبادی کی حمایت اور امداد سے باز رکھیں۔ وسط ایشیائی ریاستوں نے اوئی غر مطبوعات اور دفاتر پر پابندی لگا کر، چینی پالیسیوں کے نقاد اوئی غروں کو گرفتار کر کے، تجارت کے لیے چین کے ساتھ اپنی سرحدوں کو کھلا رکھ کے اور اسلحہ، پراپیگنڈہ یا فنڈز کی فراہمی...... اوئی غر علیحدگی پسندوں کو...... روک کے، چین کو مطمئن رکھا۔

چین کے بعض دوسرے اہم مفادات یہ تھے کہ وسط ایشیا اور روس کے ساتھ طویل سرحدوں پر کشیدگی کا خاتمہ کیا جائے۔ ان سرحدوں پر تعینات چینی فوجوں کو کم کیا جائے اور زار کے زمانے سے چلے آنے والے تنازعات...... ایک دوسرے کے علاقوں پر دعوے...... کو طے کیا جائے۔ انہی تنازعات کی وجہ سے چین اور روس کے تعلقات میں گھن لگا ہوا تھا 1990ء کے عشرے کے وسط میں، چین نے روس، قازقستان اور کرغیزستان کے ساتھ مشترکہ سرحدی کمیشن قائم کئے، جنہوں نے سالہا سال بعد سینکڑوں سرحدی تنازعات میں سے بیشتر کو حل کر لیا، تاہم تاجکستان کے ساتھ علاقائی تنازعہ حل نہیں ہو پایا۔ گورنو بدخشان میں...... جہاں سونے کے ضخیم ذخائر موجود ہیں...... چین تاجک سرحد کے ساتھ، چین کا30% تاجک علاقے پر دعویٰ ہے۔ انہی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے، چین نے1996ء میں شنگھائی میں پانچ

ملکوں کی سمٹ کانفرنس منعقد کرا کے' وسط ایشیا میں انتہائی اہم قدم اٹھایا تھا۔ ان پانچ ملکوں...... چین' روس' تاجکستان' کرغیزستان اور قازقستان...... کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ سمٹ کے نتیجے میں فوجوں کی تعداد میں کمی اور سرحدوں کی نشان دہی کا عمل شروع ہوگیا۔ اسی میل چوڑا شفاف زون بنایا گیا' جہاں مشترکہ فوجی نگرانی رکھی گئی۔ شنگھائی فائیو کا قیام اس کانفرنس کا سب سے اہم کارنامہ تھا۔ اس طرح ایک مستقل گروپ وجود میں آ گیا جس نے سالانہ باہمی کانفرنس کرنے کا عہد کیا۔

شنگھائی فائیو آہستہ آہستہ وسیع رینج کا فوجی' سکیورٹی اور اقتصادی معاہدہ بن گیا۔ اگست 1999ء میں جب پانچوں ممالک کے سربراہ بشکیک میں ملے تو ازبک تحریک نے کرغیزستان پر اپنے حملوں کا آغاز ہی کیا تھا اور جاپانی ماہرین ارضیات کو اغوا کر کے' کانفرنس کے میزبان صدر آقایوف کو خاصی مشکل میں ڈال دیا۔ کانفرنس' اسلامی بنیاد پرستی' منشیات اور اسلحہ کے پھیلاؤ میں افغانستان کے کردار اور وسط ایشیا کے عدم استحکام کے خطرات پر بحث و مباحثے کا فورم بن گئی۔ کانفرنس کے آخر میں' پانچوں لیڈروں نے ''بین الاقوامی دہشت گردی' منشیات کی غیر قانونی تجارت' اسلحہ کی آمد و رفت' غیر قانونی ہجرت' علیحدگی پسندی اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف جنگ'' میں باہمی تعاون میں اضافے کے معاہدے پر دستخط کیے۔ انہوں نے ''کثیر قطبی دنیا'' کی تشکیل پر اتفاق کیا۔ کثیر قطبی دنیا' روسی نظریئے سے متاثر فارمولا تھا جو بنیادی طور پر امریکی مطلق العنانیت کے خلاف تھا۔ روسی صدر بورس یلسن اور چینی صدر جیانگ زیمن نے' صبح کے ناشتے کے دوران' ملاقات میں ''اپنی اہم شراکت'' کو وسیع کرنے کے طریقوں پر گفتگو کی۔ پیغام بالکل واضح تھا...... روس' چین اور وسط ایشیا نے انقلابی اسلام کو مشترکہ خطرہ سمجھا اور اس سے اچھی طرح نمٹنے کے لیے انہوں نے اپنے اختلافات ایک طرف رکھ دیئے۔ وسط ایشیائی ریاستیں' پہلی دفعہ فوجی تعاون کے لیے چین کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اگلے سال 2000 دوشنبہ میں شنگھائی فائیو' شنگھائی فورم میں تبدیل ہوگیا کیونکہ ازبکستان کو...... چین کے ساتھ مشترکہ سرحد نہ ہونے کے باوجود...... اس میں آبزرور کا درجہ دے دیا گیا۔ سمٹ نے پہلی دفعہ فوجی تعاون میں اضافے...... دہشت گردی کے خلاف بشکیک میں

مشترکہ مرکز قائم کرنے_____ کا فیصلہ کیا تاکہ ازبکی تحریک اور طالبان کے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اب فورم علاقے کا اہم ترین جیوسٹریٹجک الائنس بن چکا تھا اور سکیورٹی کے ساتھ ساتھ معاشی' سیاسی اور دوسرے ایجنڈے کے مشترکہ پروگرام تشکیل دے رہا تھا۔ ہندوستان' پاکستان' منگولیا' جنوبی کوریا اور ایران جیسے ممالک اس میں شمولیت کے خواہاں تھے جبکہ ازبکستان مکمل رکنیت پر مصر تھا- وسط جون2001میں شنگھائی کانفرنس میں' ازبکستان کو مکمل رکن بنا لیا گیا جبکہ دوسرے ممالک کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔فورم نے دوبارہ اپنا نام بدل کر شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن(SCO) رکھ لیا۔اس کے رہنماؤں نے قومی سلامتی کے تحفظ کے ایک نئے معاہدے پر دستخط کئے اور ساتھ ہی ان ممالک کے مابین تجارت اور سرمایہ کاری میں اضافہ کا عہد بھی کیا۔

لیڈروں کا بنیادی مسئلہ وہی تھا۔''شنگھائی کنوینشن علیحدگی پسندی' دہشت گردی اور انتہا پسندی کی قوتوں سے نمٹنے کے لیے مشترکہ کوششوں کو قانونی بنیاد فراہم کرتا ہے۔'' نیا معاہدہ کئے جانے کے بعد صدر زیانگ نے کہا۔ قازق صدر نذر بایوف نے اس میں اضافہ کیا۔ ''افغانستان میں عدم استحکام دہشت گردی' علیحدگی پسندی اور انتہا پسندی کی اصل وجہ ہے۔'' لیڈروں نے بشکیک میں دہشت گرد مخالف سنٹر کو مزید فعال بنانے کا عہد کیا۔اب تک چین وسط ایشیائی ممالک کو ازبکی تحریک کو روکنے کے لیے فوجی امداد فراہم کر رہا تھا۔2000ء اور 2001میں' چین نے ازبکستان اور کرغیزستان کو علیحدہ علیحدہ1.3 ملین ڈالر مالیت کی فوجی اور تیکنیکی امداد دی۔ اس میں ان کے سرحدی محافظوں کے لیے سنپر رائفلیں اور دوسری مادی امداد بھی شامل تھی۔ بعدازاں چین نے کرغیز سرحدی محافظوں کے لیے بنکرز اور رہائش کے لیے مالی امداد دینے کی حامی بھی بھر لی۔ چین کے لیے ازبکی تحریک کا خطرہ مسلسل سنگین ہوتا جا رہا تھا کیونکہ وسط ایشیائی اور چینی اوئی غروں کو' شمالی افغانستان میں ازبک تحریک کے کیمپوں میں فوجی تربیت دی جا رہی تھی۔''زن جیانگ میں اوئی غر بیجنگ کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور چین اسے ایک ایسا بین الاقوامی خطرہ سمجھتا ہے۔ جسے صرف زن جیانگ سے

ختم نہیں کیا جا سکتا۔ چین کی رائے ہے کہ از بکی تحریک کی کامیابی کی صورت میں' اور زیادہ اوئی غروں کو نعمان غنی کی امداد اور پشت پناہی ملنے لگے گی۔'' تاجکستان کی جماعت احیائے اسلام کے رہنما محی الدین کبیر نے وضاحت کی۔ درحقیقت اوئی غر' علاقے کے اسلامی جہاد میں 1980ء کے عشرے سے ہی ملوث ہوگئے تھے' جب وہ افغان مجاہدین کی جماعتوں میں شامل ہونے کے لیے جنوب میں' پاکستان آئے تھے۔ سینکڑوں اوغر پاکستانی مدرسوں میں تعلیم پانے لگے۔ انہوں نے پہلے حزب اسلامی اور بعد میں طالبان کے ساتھ مل کر' افغانستان میں خوب جنگی مہارت حاصل کی۔ مسعود نے بعض اوئی غر گوریلوں کو' طالبان کے ہراول دستوں میں سے' گرفتار کیا تو انہیں بڑے فخر سے غیر ملکی پریس کے سامنے پیش کیا۔ چین اور اس کے اتحادی پاکستان کے دباؤ کے تحت' طالبان نے اوئی غر لڑاکوں کو 2000ء میں کابل کی فرنٹ لائن سے شمالی افغانستان منتقل کر دیا' وہاں ان کی از بکی تحریک میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ طالبان ان کے تعلق سے خود کو بری الذمہ قرار دے سکیں۔

کھیل میں تبدیلی

چین' روس اور امریکہ کی' وسط ایشیا میں مخاصمت چلتی رہے گی لیکن عظیم کھیل میں تبدیلی آ گئی ہے۔ انیسویں صدی میں روس اور برطانیہ نے وسط ایشیائی ریاستوں کو مہروں کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن آج بڑی طاقتیں اپنے ہی ہاتھوں تشکیل شدہ قوتوں کے آگے بے بس نظر آتی ہیں اور انہیں کنٹرول کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ افغانستان سے ظاہر ہونے والے طالبان' اسامہ بن لادن اور از بکی تحریک کے خطرات نے تین عظیم طاقتوں کی کمزوری اچھی طرح ظاہر کر دی ہے اور انہیں باہمی معاہدے کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بڑی طاقتیں پائپ لائنوں کی راہ گزر اور وسط ایشیا کے قدرتی وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں متحارب ہونے کے باوجود' طالبان اور از بکی تحریک کو نیچا دکھانے اور وسط ایشیائی ممالک کی فوجی طاقت کو بہتر

بنانے کے مسائل پر' ان کے درمیان قطعی کوئی اختلاف نہیں۔

گیارہ ستمبر کے واقعات نے کھیل کو ڈرامائی انداز میں تبدیل کر دیا ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے خاتمے کے لیئے روس اور چین نے امریکہ سے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ اس صورت حال نے تینوں طاقتوں کو افغانستان اور وسط ایشیا میں دہشت گردی اور اسلامی انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں فوراً متحد کر دیا۔ اب تینوں کو یہ امید ہوگئی کہ طالبان کی شکست کے بعد' افغانستان میں نئی وسیع بنیاد' کثیر نسلی حکومتی قائم ہو گی اور ازبکی تحریک کا خطرہ وسط ایشیا اور چینی صوبے زن جیانگ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ مزید براں' چین کو یہ بھی یقین تھا کہ امریکی حملوں کی بدولت اوئی غر علیحدگی پسندوں اور پاکستان اور افغانستان کی اسلامی انقلابی جماعتوں کے مابین تعلق بھی کمزور ہوجائے گا۔ امریکی افواج کی علاقے میں آمد کے ساتھ ہی' چین نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے زن جیانگ صوبے میں فوجی مشقیں شروع کر دیں۔ افغانستان اور پاکستان سے ملحقہ سرحد پر مزید چینی افواج کی پٹرولنگ ہونے لگی۔ ان سرحدوں سے لوگوں کی آمدورفت بند کر دی گئی۔ طالبان اور القاعدہ کے خلاف الائنس کے حملوں کے دوران' بلاشبہ' تینوں طاقتیں یک جان نظر آ رہی تھیں۔ مگر مسئلہ غیر یقینی یہ تھا کہ ان حملوں کے بعد' باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔

اگر روسی خوف کے مطابق' امریکہ وسط ایشیا میں اپنی مستقل فوجی موجودگی چاہتا ہے تو عظیم کھیل کی رقابتوں کا ایک نیا دور یقینی ہو جائے گا۔ بہت سے ایشوز پر' خصوصاً امریکہ کو واحد عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے سے روکنے کی خواہش پر چین اور روس قریبی باہمی تعلق قائم کر رہے ہیں۔ تاہم وسط ایشیا میں' سلامتی کے مسائل پر مشترکہ تشویش کے باوجود' روس اپنے عقبی علاقے میں چینی فوجی کردار کا دل سے حامی نہیں ہوگا اور اسی طرح وسط ایشیائی ممالک بھی چینی موجودگی کو پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ اپنی اوئی غر اقلیتوں سے پہلے ہی خاصے ہراساں ہیں اور چین کے ساتھ قریبی تعاون اوئی غروں کو مزید ناراض کر سکتا ہے۔ سو وسط ایشیائی ممالک کو انتہائی دشوار توازن قائم رکھنا پڑ رہا ہے۔ وہ اپنی افواج کے لیے چینی

امداد تو چاہتے ہیں مگر وسط ایشیا میں چین کی فوجی موجودگی یا اس کا اثر و رسوخ ہرگز نہیں چاہتے۔

چین اور امریکہ کو وسط ایشیا میں، ابھی اپنا مشترکہ کردار متعین کرنا ہے۔ امریکی الائنس میں چینی شمولیت کے علاوہ، امریکہ...... اوئی غر جہادیوں کے طالبان اور ازبکی تحریک سے تعلق کے متعلق...... بیجنگ سے خفیہ معلومات کا تبالہ بھی چاہتا ہے۔ امریکہ اور چین دوسرے کئی شعبوں میں باہم متحارب ہیں۔ فوجی خطرات کے ختم ہونے کے بعد، اگر وسط ایشیائی ریاستیں اپنی معاشی اور سیاسی صورت حال میں بہتری پیدا کر لیتی ہیں تو سہ طرفہ محاذ آرائی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ وسط ایشیا کا اپنا مفاد یہ ہے کہ تینوں بڑی طاقتوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لے آیا جائے جو نہ صرف ان کی سلامتی کے خطرات کا سامنا کرے بلکہ وسط ایشیا کے قدرتی توانائی وسائل کے ارتقاء اور اصراف میں برابری کی بنیاد پر شامل ہو۔ اس کے نتیجے میں وسط ایشیا میں معاشی ترقی اور سیاسی آزادیوں کا عمل تیز کیا جا سکتا ہے۔

پھر بھی امید ہے، تینوں طاقتیں پہلی دفعہ وسط ایشیائی علاقائی سلامتی کے دفاع اور وہاں موجود دہشت گردی کے مشترکہ مفاد کی خاطر اکٹھی ہوئی ہیں۔ شاید مستقبل میں وہ وسط ایشیا سے آئل اور گیس کی پائپ لائن بیرونی ممالک میں لے جانے، پسماندہ وسط ایشیائی ریاستوں کی معیشتوں کو ترقی دینے اور افغانستان کی سیاسی اور معاشی صورت حال کو استحکام دینے...... تاکہ وہ دوبارہ بین الاقوامی برادری کا حصہ بن جائے...... کے عمل میں بھی باہمی تعاون پر تیار ہو جائیں۔ افغانستان پر امریکی بمباری کے ساتھ، 7 اکتوبر 2001ء کو شروع ہونے والی خوفناک جنگ شاید، علاقے کی تاریخ میں پہلی دفعہ، باہمی مخاصمت کے بجائے باہمی تعاون پر منتج ہو۔

باب 10

وسط ایشیا اور پڑوسی

جنوب میں وسط ایشیا کے پڑوسی مسلمان ممالک کے اپنے بے پناہ متصادم مفادات اور مخاصمتیں ہیں، جنہیں وسط ایشیائی ممالک پچھلے عشرے میں انتہائی شعبدہ بازی سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ پڑوسی ممالک پاکستان، ایران اور ترکی......معاشی تعاون کی تنظیم، اسلامی کانفرنس اور اقوام متحدہ جیسی کثیرجہتی تنظیموں کے بندھن میں وسط ایشیائی ممالک سے منسلک ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کے لئے خاصی گرم جوشی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ تاہم ان کی اندرونی رقابتوں اور ذاتی ایجنڈے نے علاقائی عدم استحکام کو مزید تقویت دی ہے۔ اس کے علاوہ عرب خلیجی ریاستوں کی جماعتوں اور افراد نے ازبکی تحریک کی مالی امداد اور پشت پناہی ضرور کی ہے لیکن اسلامی دنیا نے وسط ایشیا کو عالمی برادری میں جگہ دلانے کے لئے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔

افغانستان میں مسلسل خانہ جنگی، ازبکی تحریک اور دوسرے جہادی گروپوں کی پشت پناہی میں طالبان کا کردار وسط ایشیا کے اہم ترین مسائل ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ روس اور امریکہ کی طرح پڑوسی مسلم ممالک نے بھی خانہ جنگی کو،ایک یا دوسرے گروپ کی فوجی یا مالی معاونت کرکے، نہ صرف جاری رکھا بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی، ان کی مرضی کے بغیر، اس لڑائی کو وسعت دی۔

افغانستان سے خطرہ

افغانستان کا بحران، وسط ایشیا میں بڑھتے ہوئے عدم استحکام کا سب سے اہم واحد خارجی عامل ہے۔ افغانستان تاریخی اور ثقافتی طور پر، طویل عرصے سے، وسط ایشیا سے منسلک ہے۔ صدیوں دونوں علاقے مختلف سلطنتوں میں اکٹھے رہے ہیں اور شمالی افغانستان میں موجود مختلف نسلی گروپ ازبکوں، تاجکوں اور ترکمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ افغانستان اور وسط ایشیا کے مابین مذہبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی ہم آہنگی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان علاقوں کے مابین لین دین کو کوئی تاریخی مغالطہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ اس تاریخی عمل کا تسلسل ہے جو سوویت یونین کے چوہتر سالہ دور میں وقتی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

تاریخی مفہوم میں، افغانستان میں ازبکی تحریک کی پسپائی، مہمان نوازی اور پشت پناہی کی انتہائی قدیم روایت کا ایک تسلسل ہے۔ بیسویں صدی میں (روسی انقلاب کے بعد) افغانستان کے مہمانوں میں بخارا، خیوا اور قوقند کے حکمران، بالشویکوں سے بچ کر بھاگ آنے والے بسماچی، تاجک خانہ جنگی کے دوران جماعت احیا کے اراکین اور ازبکی تحریک کے مجاہد شامل تھے۔ ازبکی تحریک تو وسط ایشیا کی جنگ ہی افغانستان کے ٹھکانوں سے لڑ رہی تھی۔ خود افغان بھی1979ء کی جنگ کے بعد سے وسط ایشیا میں پناہ لیتے رہے ہیں۔

لیکن صرف روایت اور مسلمان مہمان نوازی، ازبکی تحریک کی امداد کے لئے طالبان کی خواہش کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتی۔ گیارہ ستمبر کے واقعات سے پہلے طالبان مسلم دنیا کے اکثر انتہا پسند اسلامی گروہوں کی مہمان نوازی میں مصروف تھے اور ان کے مقاصد واضح طور پر جہادی تھے۔ افغانستان میں یہ گروپ طالبان کے لئے لڑتے تھے اور جواباً انہیں فوجی تربیت، جنگی تجربہ، اسلحہ، مالی امداد، منشیات کی تجارت تک رسائی اور تمام اسلامی انقلاب پسندوں سے مضبوط رابطے ملتے تھے۔

صدیوں پر محیط تاریخ یہ بھی وضاحت نہیں کرتی کہ افغانستان کیوں دنیا بھر کے مسلمان انتہا پسندوں کا میزبان بنا۔ اس کا جواب حالیہ واقعات ہی میں موجود ہے۔1980ء کے عشرے میں سوویت یونین کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کی امریکی کاروائیاں اس کا بنیادی سبب بنیں۔ جب امریکہ نے پاکستان کی آئی ایس آئی کے ذریعے افغان مجاہدین کو اسلحہ کی

فراہمی شروع کی تو آئی ایس آئی نے انقلاب پسند افغان اسلامی جماعتوں کو فوقیت دی کیونکہ انہیں سوویت یونین کے خلاف جہاد کے لئے باآسانی قائل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح معتدل افغان قوم پرستوں اور اسلامی جماعتوں کو ایک طرف کر دیا گیا۔ اس وقت سی آئی اے نے اس پالیسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ طالبان اسی جنگ اور پسندیدگی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی دیوبندی مسلک کی متشددانہ تعبیر اور اسی مسلک کو افغانستان میں عملاً نافذ کرنے کی خواہش افغان اسلامی روایات کے بالکل برعکس ہیں۔

افغانستان میں پہلے سے موجود اسلامی رجحانات یا1980ء کے عشرے میں جہاد کے دوران ابھرنے والے تصورات میں سے کسی کی بھی طالبان میں جھلک نظر نہیں آتی۔ وہ اخوان المسلمین سے بھی متاثر نظر نہیں آتے اور نہ ہی وہ صوفیا کے مسلک کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ محض علماء پر بھی اپنے دین کے لئے تکیہ نہیں کرتے۔ ان مختلف اسلامی نظریات کی افغانستان میں واضح تاریخی جڑیں ہیں یا جہاد کے دوران انہیں مقبولیت ملی تھی۔ خود اپنے علاقے میں طالبان کی نہ تو قبائلی بنیاد ہے اور نہ ہی ان کے اپنے اکثریتی پشتون قبائل کی مکمل حمایت انہیں حاصل ہے۔ مختلف پشتون قبائلی رہنما طالبان کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور پاکستان بھاگ آئے ہیں۔ درحقیقت 1979ء سے 1994ء کے درمیان افغانستان میں ابھرنے والے اسلامی قوم پرست نظریات کے تناظر میں ان کا وجود صحیح نظر آتا ہے۔ تاہم دیوبندی عقیدے کے نظریے کا زیادہ تر حصہ پاکستان سے درآمد ہوا ہے۔96-1994ء کے دوران ان کی ابتدائی مقبولیت محض اسلامی جذبے کے بجائے اور کئی عوامل کی مرہون منت تھی۔ مثلاً کابل میں تاجک کنٹرول کے مقابل پشتون قومیت کا احیاء، امن و امان کی بحالی، سڑکوں کا دوبارہ کھولنا اور درندہ صفت سرداری نظام کا خاتمہ۔1996ء میں غیر ملکی جہادی گروپوں کی میزبانی سے قبل طالبان کا ابتدائی ایجنڈا انہی مسائل سے عبارت تھا۔

1996ء میں کابل پر قابض ہونے کے بعد جب تک طالبان کا اسامہ بن لادن اور دوسرے غیر افغان اسلامی گروہوں سے رابطہ نہیں ہوا تھا، طالبان کا کوئی بین الاقوامی اسلامی ایجنڈا نہیں تھا۔ شروع میں بعض طالبان لیڈروں نے بخارا اور سمرقند کے مقدس اسلامی مقامات کی ''آزادی'' کا خواب ضرور دیکھا تھا لیکن اکثر لوگ ان علاقوں کے محل و وقوع سے بھی لاعلم تھے۔ ہزاروں پاکستانی جہادیوں اور ہزارہا وسط ایشیائی، عرب، افریقی اور مشرقی

ایشیائی لوگوں نے، جو اس وقت طالبان کے لئے جنگ آزما تھے...... انہیں اسلامی انقلاب پسندی کا عالمی تصور دیا، جسے طالبان نے اپنالیا۔ اب اسامہ بن لادن اور ان کے عرب ساتھی طالبان لیڈرشپ کے اندر فیصلہ سازی کے عمل کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے طالبان کو افغانستان سے باہر وسط ایشیا میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اکسایا۔ میں نے اپنی کتاب طالبان میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ جس طرح غیرملکی گروہ طالبان کی پشت پناہی کے محتاج ہیں، بالکل اسی طرح طالبان اپنے نظریات کی توسیع کے لئے ان غیرملکی لڑاکوں پر کلی انحصار کر رہے ہیں۔

جب تک افغانستان میں امن قائم نہیں ہوجاتا یا موجودہ طالبان قیادت کو ہٹا نہیں دیا جاتا...... بہت ممکن ہے، اسامہ بن لادن کے خلاف موجودہ امریکی فوجی مہم کا نتیجہ کچھ ایسا ہی ہو...... طالبان کا اپنی موجودہ پالیسی سے انحراف ناممکنات میں سے ہے۔

جدید سیاسی ریاست کی تعمیر کی خواہش سے عاری طالبان اپنے لڑاکوں کی حمایت اور وفاداری کو قائم رکھنے کے لئے طالبان مخالف یونائیٹڈ فرنٹ کے خلاف جنگ کے تسلسل ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اگر یونائیڈ فرنٹ والے شکست کھا کر تاجکستان میں پسپائی اختیار کرتے ہیں تو غالباً موجودہ طالبان قیادت کا انداز وسط ایشیائی حکمرانوں کے خلاف اور زیادہ جارحانہ ہو جائے گا۔ نئی دشمنیوں کی شعبدہ بازی کے ذریعے جہاد کا تسلسل قائم رکھا جا سکتا ہے اور اس طرح فوج کو متحد اور متحرک رکھا جا سکتا ہے۔ دشمنی کا پہلا نشانہ غالباً تاجکستان کو بنایا جائے گا کیونکہ وہاں روسی افواج تعینات ہیں۔ بعد میں ازبکستان کی باری آئے گی۔ طالبان کا المیہ یہ ہے کہ ان کی قیادت کو خوف ہے کہ امن ہوتے ہی ان کی تحریک ختم ہو جائے گی کیونکہ ان کے پاس ملکی تعمیروترقی کا کوئی منصوبہ نہیں ، چنانچہ وہ اپنی پالیسیاں بدلنا ہی نہیں چاہتے۔

اگرچہ طالبان کے خلاف امریکی بمباری کی مہم کے آغاز (9 اکتوبر 2001ء) نے یہ امر یقینی بنا دیا ہے کہ افغانستان سے طالبان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ جنگ ختم ہوتے ہی، مختلف نسلی گروہوں، جنگی سرداروں اور بچے کھچے منحرف طالبان کے درمیاں شدید چپقلش شروع ہو جائے گی کہ کون نئی حکومت تشکیل دے۔ افغانوں کے لئے بہترین صورت تو یہ ہے کہ وہ سابق بادشاہ ظاہر شاہ کے گرد مجتمع ہو جائیں، جنہوں نے طالبان کے مخالف وسیع بنیاد کثیرنسلی

اتحاد کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ یہ کولیشن کابل میں نئی بین الاقوامی طور پر مسلمہ اور قابل قبول حکومت کی بنیاد بن سکتی ہے۔ جنگ کے بعد اس قسم کی حکومت کی کامیابی کے لئے افغانستان میں مغرب کی موجودگی ازحد ضروری ہوگی۔ نہ صرف اقوام متحدہ کی امن فوج کو علاقے کے استحکام کے لئے یہاں تعینات کئے جانے کی ضرورت ہے بلکہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے بے تحاشا مالی امداد کی فراہمی بھی لازمی ہوگی۔ علاقے کی تعمیر نو کے لئے فیصلہ کن اور مسلسل بین الاقوامی کوششیں درکار ہوں گی تاکہ بین الاقوامی برادری میں افغانستان کی واپسی کو ممکن بنایا جاسکے۔

پاکستان: مسلمان مجاہدوں کا استاد

پاکستان نے طالبان کو جنم نہیں دیا تاہم افغانستان کے متحارب عوامل میں طالبان اسلام آباد کی مدد کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ درحقیقت علاقے میں پاکستان کے اثر ونفوذ کا خوف بھی طالبان کے خلاف، وسط اشیائی ریاستوں کو ماسوائے ترکمانستان متحرک کرنے کا ایک اہم سبب رہا ہے۔ وسطی ایشیائی قیادت کو یقین ہے کہ آئی ایس آئی ازبکی تحریک اور دوسرے اسلامی انقلاب پسند گروپوں کی، ان کے ممالک میں مکمل پشت پناہی کرتی رہی ہے۔ یہ حضرات 1980ء کی دہائی کے واقعات بھولے نہیں ہیں (ان دنوں سوویت یونین کے تحت یہی لوگ برسراقتدار تھے) جب پاکستان کی فوجی حکومت کے جنرل ضیاء الحق نے وسط ایشیاء پر افغان مجاہدین کے حملوں کی حوصلہ افزائی کی تھی اور سی آئی اے نے اس مقصد کے لئے آئی ایس آئی کے ذریعے مجاہدین کو اسلحہ کی ترسیل کی تھی۔ درحقیقت انتہائی پرامن اسلامی سرگرمیوں یا اسلامی تشخص سے ان رہنماؤں کی نفرت، جزوی طور پر افغان جنگ کا نتیجہ ہے۔ پاکستان اس وقت ان کی مخالف سمت میں تھا۔ طالبان کے لئے پاکستان کی مسلسل حمایت اور غیرپشتون گروپوں کی پاکستان کے مفادات سے لاتعلقی کی وجہ سے صدر مشرف کے ان کے خلاف 2001ء کے موسم گرما میں واضح استرداد کی بناء پر وسیط ایشیائی قیادت مزید برہم ہوئی ہے۔1999ء میں فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے والے جنرل مشرف کی کوتاہ اندیش خارجہ پالیسیوں نے پاکستان سے اپنے شمالی ہمسایوں کو مزید بیگانہ کیا ہے۔

اگرچہ یکے بعد دیگرے پاکستانی حکومتوں نے وسط ایشیائی قیادت سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آئی ایس آئی کے ذریعے پاکستان کی اسلامی جماعتوں کو، طالبان اور دوسرے وسط ایشیائی جہادی گروپوں کو دی جانے والی امداد ختم کر دیں گی اور ان کے علاقوں کے جہادیوں کی پاکستانی مدرسوں میں تعلیم ممنوع کر دیں گی لیکن اسلام آباد اپنے ذاتی مفاد میں یا مقامی اسلام پسندوں کی ہنگامہ آرائی کے خوف سے اس سلسلے میں عملی اقدامات کرنے میں ناکام رہا۔ درحقیقت حالیہ سالوں میں وسط ایشیائی اور اوئی غر جہادی پاکستانی دیوبندی مدرسوں میں تعلیم کی غرض سے مسلسل آتے رہے ہیں۔ ازبک تحریک، حزب التحریر اور چیچن باغیوں نے اپنے نوجوانوں کو پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا ہے جبکہ پاکستان کی اسلامی جماعتیں اپنے وسط ایشیائی طلبہ کے ذریعے علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ افغانستان کے جنگی میدانوں سے کہیں زیادہ ان مدرسوں کی تعلیم اور ان کے زیر اثر جہاد کے کلچر کا فروغ وسط ایشیا میں مستقبل کی لڑائی کے لئے نظریاتی اسلامی انقلاب پسندوں کو جنم دے رہا ہے۔

پاکستانی پالیسیوں کی تشکیل میں جزوی طور پر پاک و ہند مخاصمت اور جنوبی ایشیا میں بھارتی بالادستی کے خوف کا خاصا دخل رہا ہے۔ کابل میں بھارت کے ابتدائی اثر و رسوخ نے پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اسی وجہ سے پاکستان 1950ء کے عشرے سے ہی وہاں ایک دوست پشتون حکومت کے قیام کا خواہاں رہا ہے اور 1980ء کے عشرے سے پاکستان افغانستان کو جنرل ضیاء الحق کے الفاظ میں (بھارت سے جنگ کی صورت میں) ''سٹریٹجک گہرائی'' کا اہم وسیلہ قرار دیتا ہے۔ بھارت کا افغانستان میں اثر و رسوخ ختم کرنے پر مصر، پاکستان نے 1989ء میں بھارتی کشمیر میں ابھرتی ہوئی مقامی مزاحمت کو مزید بھڑکانے میں بھرپور مدد کی۔ جب بھارت اور امریکہ نے پاکستان پر کشمیریوں اور پاکستانی مجاہدوں کی تربیت اور انہیں اسلحہ دینے (اور اس طرح دہشت گردی کی مدد) کرنے کا الزام لگایا......تاکہ وہ کشمیر میں جاکر لڑسکیں......تو طالبان نے انہیں صاف انکار کا ایک راستہ دکھا دیا، بالکل اسی طرح جیسے طالبان پاکستانی یا چینی لڑاکوں کو ازبکی تحریک میں شامل ہونے بھیج دیتے تھے تاکہ ان کی امداد سے مکر سکیں۔ چنانچہ پاکستان نے بھی اپنے کشمیری مجاہد طالبان کے پاس تربیت کے لئے بھیج دیئے۔ اب کئی پاکستانی گروپ اسے

پالیسی کے طور پر لیتے ہیں کہ ان کے نوجوان گوریلے کشمیر جیسے کٹھن گوریلا فرنٹ پر جانے سے پہلے طالبان کے لئے جنگ میں حصہ لیں۔

1991ء میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد وسط ایشیا اور افغانستان میں سٹریٹجک گہرائی کی ضرورت کے متعلق ضیاء الحق کا حوالہ بہت اہمیت کا حامل ہوگیا۔ کچھ وقت کے لئے بہت سے پاکستانیوں کو یوں لگا جیسے وسط ایشیا میں اسلام کا احیاء اور تاجکستان کی خانہ جنگی سوویت یونین کی تربیت یافتہ قیادت کی موجودہ نسل کو اڑا کر پھینک دیں گے۔ چنانچہ پاکستانی فوج نے کابل میں اپنی ہمدرد حکومت کو جنم دینے کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ اس کے ذریعے وسط ایشیا تک آسان اور مکمل رسائی ہو سکے۔1991ء میں اعتدال پسند یہ کہا کرتے تھے کہ اسلام آباد کو افغان خانہ جنگی کے خاتمے میں مدد دینی چاہیے تاکہ کابل میں برسراقتدار آنے والی کوئی بھی حکومت پاکستان کو تجارتی راستے مہیا کر سکے۔ ان اعتدال پسندوں کو خاموش کرا دیا جاتا تھا۔ فوج نے سٹریٹجک گہرائی کے تصور کو وسط ایشیا تک وسعت دے دی کیونکہ افغانستان میں ان کی پالیسیوں کا فطری اور منطقی نتیجہ یہی نکلنا تھا، جبکہ پاکستان کی منتخب حکومتوں نے زیادہ مثبت پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے اور وسط ایشیا کے ساتھ اقتصادی بندھن مضبوط کرنے کی کوششیں کیں۔

1991ء میں وزیراعظم نواز شریف کی منتخب حکومت نے وسط ایشیا کے ساتھ تعلقات کو تجارت، پائپ لائن کے راستے سرمایہ کاری اور مشترکہ اقتصادی ترقی کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ یہ انتہائی اہم اور مثبت سوچ تھی۔ وسط ایشیائی ریاستوں کے لئے کراچی نزدیک ترین بندرگاہ ہے اور اسلام آباد فاصلے کے اعتبار سے کراچی کی نسبت دوشنبہ کے زیادہ قریب ہے۔ دوشنبہ سے کراچی تک کا فاصلہ بذریعہ سڑک صرف ایک ہزار سات سو میل ہے جبکہ اس کا ایرانی بندرگاہ بندر عباس سے فاصلہ 2125 میل، مغربی روس میں روستوف آن ڈان سے 2625 میل اور مشرقی روس میں ولادی داس ٹاک سے 5940 میل ہے۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے افغانستان میں امن کا قیام بنیادی ضرورت تھا۔ لیکن آئی ایس آئی نے اس موقع کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ نواز شریف اور ان کے وزیر برائے اقتصادی امور سردار آصف علی کی کوششوں پر پاکستانی اسلامی جماعتوں کی وسط ایشیا میں دخل اندازی نے پانی پھیر دیا۔ ان اسلامی جماعتوں کو یہ بے داغ اور شفاف سرزمین اپنے مخصوص

اسلامی عقیدے کے پھیلاؤ کے لئے بہت زرخیز محسوس ہوئی۔ طاقتور جماعت اسلامی کے سربراہ قاضی حسین احمد نے نواز شریف کو مشورہ دیا کہ وہ ''وسط ایشیا کو اقتصادی امداد دینے کے بجائے اسلامی رہنمائی فراہم کریں۔'' اسی دوران وہابی مسلک کے بعض پاکستانی اور عرب گروپوں کو سعودی عرب مالی امداد دے رہا تھا تاکہ وہ خشکی کے راستے وسط ایشیا پر حملہ آور ہو سکیں۔ ابتداً سعودی عرب کی مالی امداد سے چلنے والے، پاکستانی انتہا پسند گروہ لشکر جھنگوی اور سپاہ صحابہ کے بہت سے لڑاکے' ازبکی تحریک کے ساتھ مل کر لڑائی میں حصہ لے رہے ہیں۔1994ء میں طالبان کے ظہور کے بعد وسط ایشیا کے ساتھ (ماسوائے غیر جانبدار ترکمانستان سے خوشگوار تعلقات کے) پیداواری تعلقات کی پاکستانی امیدیں بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئیں۔ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اس کی وجہ آئی ایس آئی نہیں بلکہ پاکستان کی حالیہ تاریخ کی انتہائی لبرل اور سیکولر وزیراعظم بےنظیر بھٹو تھیں۔ انہوں نے وسط ایشیا کے ساتھ تعلقات کو بالکل ہی درہم برہم کر دیا۔ افغانستان میں وسیع تر امن پراسیس کی حمایت کے بجائے، جو وسط ایشیا اور پاکستان کے درمیان شمال اور جنوب کی تجارت کے قدرتی راستے کھول دیتا، بےنظیر بھٹو نے طالبان کی حمایت شروع کر دی اور ترکمانستان سے جنوبی افغانستان کے راستے پاکستان تک مغرب سے مشرق کی جانب تجارت اور پائپ لائن کی راہ گزر کو عملی شکل دینے کے لئے فوراً اور بے سوچے سمجھے ایک نئی پالیسی اختیار کر لی۔ اس روٹ کے تحفظ کی ذمہ داری طالبان کی تھی۔ آئی ایس آئی نے فوراً ہی اس پالیسی کی حمایت شروع کر دی کیونکہ اس کے افغان سرخیل گلبدین حکمت یار کابل پر قبضہ کی کوشش میں ناکام رہے تھے جبکہ طالبان کی قوت یہ کام سرانجام دینے کی بخوبی اہل تھی۔ باقی وسط ایشیاء کو نظرانداز کر کے ترکمانستان کی حمایت اور افغانستان میں طالبان کی بھرپور امداد نے پاکستانی عزائم کے بارے میں وسط ایشیائی قیادت کے ذہنوں میں مزید گمبھیر شبہات کو جنم دیا۔

جواباً، وسط ایشیائی قیادت نے پاکستان کو ہراساں کرنے کے لئے اس کے دو پرانے دشمنوں بھارت اور روس سے پینگیں بڑھانی شرع کر دیں جبکہ دوسرے دو حریفوں ایران اور ترکی نے علاقے میں مداخلت شروع کر دی۔ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں پاکستانی فوج کا ہمیشہ اہم کردار رہا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات کی کوئی امید ہی نہیں تو پاکستان نے طالبان سے اور زیادہ ہم آہنگی پیدا کر

لی اور طالبان مخالف اتحاد سے ان کا رویہ مزید درشت ہوگیا۔ ادھر وہ کشمیر کے تنازعے میں بھی مزید ملوث ہوگیا، کیونکہ کارگل میں پاکستان کی فوج کی مداخلت سے صورت حال خاصی گمبھیر ہوگئی تھی......غرض اسلام آباد اور وسط ایشیائی رہنماؤں کے مابین تلخیاں اور بڑھ گئیں۔ انہوں نے شمال کی جانب طالبان کی ہر اہم پیش قدمی میں پاکستانی فوج کی معاونت یا حمایت کا الزام لگانا شروع کر دیا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ 1990ء کے عشرے میں یلدے شیف کو پناہ دینا اور نعمان غنی کے پاکستان کے مسلسل خفیہ دورے، آئی ایس آئی کی از بکی تحریک کے لئے مسلسل حمایت کا نتیجہ تھے۔ از بکی تحریک کو آئی ایس آئی اتنی بڑی طاقت نہیں سمجھتی جو از بک حکومت کو اکھاڑ پھینکے گی لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعے وسط ایشیا کی قیادت کو اچھی طرح جھنجھوڑ نے کیلئے ضرور استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت نے بھی کئی کارڈ چھپا رکھے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ وہ حکومتوں اور از بکی تحریک کے مابین صلح کی کوششوں میں کردار ادا کرکے ان کی دوستی جیت سکتی ہے۔ کیونکہ پاکستان کو از بکی تحریک کے اسلامی نظریات سے کوئی خاص لگاؤ نہیں اور نہ ہی وہ انہیں اقتدار کے حصول کے لئے مدد دے رہا ہے۔ وہ اسے وسطی ایشیا میں صرف اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ تاہم آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسران کو یقین ہے کہ از بکی تحریک کا روس کے ساتھ قریبی انٹیلی جنس تعلق موجود ہے۔ افغان تاجک سرحد پر تحریک کی کاروائیوں کا نہ ہونا اس حقیقت کا غماز ہے۔ اس قسم کے تعلقات روس مخالف طالبان کے مقابلے میں از بکی تحریک کے طویل مدتی کردار کو ناقابل اعتبار بنا دیتے ہیں۔ پاکستان کو پتہ ہے کہ وسط ایشیا میں روس کے ساتھ اثر ورسوخ اور طاقت بڑھانے کی اس جنگ میں اس کی کھلی مخاصمت ہے۔ اس لئے وہ از بکی تحریک پر اعتماد نہیں کرتا، تاہم محارابانہ وجوہات کی بناء پر اس نے تحریک کو اپنے پے رول پر بھی رکھا ہوا ہے۔

از بکی تحریک کی حمایت سے پاکستان کے مسلسل انکار کے باوجود گیارہ ستمبر تک فوجی حکومت وسط ایشیائی حکومتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا راستہ ہموار کرتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اپنی زیادہ اہمیت منوانے کے لئے ان کے باغیوں کی مدد بھی کر رہی تھی۔ اسلام آباد کا خیال ہے کہ وسط ایشیائی قیادت کی موجودہ نسل کی جگہ اسلام پسند قیادت آنی

چاہیے کیونکہ وہ لوگ روس اور بھارت کے بجائے امداد کیلئے پاکستان کی طرف دیکھیں گے۔ چنانچہ وسط ایشیائی حکومتوں کے ساتھ پاکستان کے تعلق کو شبہات، الزام اور جوابی الزام طرازی کے شیطانی چکر کا سامنا ہے۔

اسی دوران پاکستان کے پے در پے اندرونی بحرانوں نے ریاستی طاقت کو کمزور کر دیا اور غیر ریاستی طاقتوں کا عمل دخل بہت بڑھا دیا۔ ان میں انتہاپسند اسلامی جماعتیں اپنے مدرسہ کلچر اور جہادی حکمت عملی سمیت شامل تھیں۔ مثلاً القاعدہ جیسے عرب دہشت گرد گروپ، ٹرک اور ٹرانسپورٹ کے سمگلر مافیا، منشیات کے تاجر...... ان سب لوگوں کا طالبان اور ازبکی تحریک سے رابطہ تھا۔ ان روابط کا آئی ایس آئی اور اس کی پالیسیوں سے قطعی کوئی تعلق نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے مختلف گروپوں میں ذاتی مفادات کی وجہ سے ٹکراؤ ہوگیا۔ ان میں افغان خانہ جنگی اور وسط ایشیا میں اسلامی انقلاب پسندی کے ظہور سے فائدہ اٹھانے والے اسلامی اور غیر اسلامی گروپ دونوں ہی شامل تھے۔ ان گروہوں کو امن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ریاستی اقتدار کی کمزوری پاکستان میں ہی نہیں بلکہ تمام علاقے میں ان کے کاروباری مفادات اور اسلامی ایجنڈے کی توسیع میں معاون تھی۔

لیکن گیارہ ستمبر کے واقعات نے صدر مشرف کی فوجی حکومت کو ڈرامائی یوٹرن لینے پر مجبور کر دیا۔ صدر جارج بش کے الٹی میٹم نے...... ریاستوں کو ہمارا لازمی ساتھ دینا ہے یا وہ ہماری مخالف ہیں...... پاکستان کے لئے طالبان کی حمایت ختم کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا اور انہیں طالبان اور القاعدہ کو شکست دینے کی امریکی مہم کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا۔ مشرف کا یہ اقدام اندرون ملک خاصا متنازعہ سمجھا گیا کیونکہ جہادی جماعتوں نے مغربی اتحاد کا ساتھ دینے کے فیصلے کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف پاکستان میں مظاہرے بھی کئے گئے۔ البتہ پاکستانی عوام کی اکثریت نے فیصلے کی حمایت کی۔ پاکستان کو وسط ایشیاء کے بارے میں اپنی پالیسیاں تبدیل کرنے اور خود اپنے گھر کو درست کرنے کا ایک موقع ملا ہے۔

اگر پاکستان طالبان اور ازبکی تحریک کے خاتمے کا ساتھ دیتا ہے اور کابل میں ایک نئی بین الاقوامی طور پر قابل قبول حکومت کی حمایت کرتا ہے تو وہ دوبارہ وسط ایشیا کا اعتماد جیت سکتا ہے۔ اس اقدام کے ذریعے پاکستان کو وسط ایشیا سے افغانستان اور پاکستان کے راستے، خلیج تک جانے والی آئل اور گیس کی نئی پائپ لائن میں شراکت کے نئے مواقع

حاصل ہو سکتے ہیں۔ بالآخر افغانستان کے متعلق فوجی حکومت کی پالیسی میں معکوس تبدیلی کشمیری حریت پسندوں کی پاکستانی حمایت پر بھی اثر انداز ہوگی اور اسے بھارت سے بہتر تعلقات پر مجبور کر دے گی اور آخری بات یہ کہ حکومت کو مدرسہ کلچر پر......جس نے پورے علاقے میں بے چینی کی فضا پیدا کر رکھی ہے...... پابندی لگانے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ پاکستان کے لئے اپنی بین الاقوامی ساکھ کو بحال کرنے اور وسط ایشیا سے دشمنی کے بجائے دوستی پیدا کرنے اور علاقے میں اپنی سیاسی تنہائی کو دور کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فوج اور آئی ایس آئی اپنے پچاس سال پرانے تصورات پر مبنی حکمت عملی سے نجات حاصل کریں اور ایک ایسی واضح صورت وضع کریں جو وسط ایشیا میں دشمنی کے بجائے دوستی کا ماحول پیدا کرے۔

ایران: شیعہ سنیوں کے درمیان

ایران نے اپنی مخصوص اسلامی جذباتیت کے باوجود وسط ایشیا میں سب سے محتاط اور ہمہ گیر کردار ادا کیا ہے۔ ابھی سوویت یونین خاتمے کی دہلیز پر ہی تھا کہ ایران خاموشی سے علاقے میں آ داخل ہوا۔ نومبر 1991ء میں وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے پانچوں ریاستوں کا دورہ کیا اور فارسی بولنے والے تاجکستان میں، جو ان دنوں ازبک ترکش اثر ونفوذ سے نبرد آزما تھا اور ترکمانستان میں، جو اپنی برآمدات کیلئے سمندری راستہ چاہتا تھا- بے پناہ ایرانی مفادات حاصل کر لئے۔ ایران نے جماعت احیائے اسلام کے لئے تاجک خانہ جنگی میں بھی مختصر سی مداخلت کی مگر فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ روس سے بنائے رکھنے کے لئے اسے اس تنازعے میں نہیں پڑنا چاہیے، حالانکہ بہت سے جماعتی اراکین تہران میں مقیم تھے، پھر بھی ایران نے تاجک خانہ جنگی کو ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا- ایران نے ترکمانستان سے مشہد (مشرقی ایران) تک ایک ریلوے لائن اور گیس پائپ لائن کی تعمیر کے لئے فنڈز بھی مہیا کئے تاکہ ترکمانستان نہ صرف ایران کو بلکہ ایرانی بندرگاہوں کے ذریعے دوسرے ممالک کو بھی اشیا اور گیس برآمد کر سکے-

1990ء کے عشرے کے ابتدائی عرصے میں، روس سے قریبی دوستانہ تعلقات، ایران کا بنیادی سرمایہ تھے-1989ء اور1993ء کے درمیان عراق کے ساتھ تباہ کن جنگ کے خاتمے

کے بعد، ایران نے اپنی مسلح افواج کے لئے روس سے دس بلین ڈالر کی مالیت کے ہتھیار خریدے۔ ایران نے، امریکی اعتراضات کے باوجود روسی ایٹمی اور میزائل ٹیکنالوجی بھی خریدنا شروع کی اور ماسکو کے ساتھ تجارت اور توانائی سے متعلق تعلقات کو بے پناہ وسعت دی۔ وسط ایشیائی قیادت، ان تعلقات اور اسلامی انقلاب پسندی کی برآمد میں واضح ایرانی عدم شمولیت کی وجہ سے، ایران سے معاملات طے کرنے میں خاصی مطمئن تھی۔ درحقیقت ایران اور روس طالبان اور امریکہ کے اثر و رسوخ کو علاقائی استحکام کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھنے میں مشترکہ سوچ کے حامل تھے۔ دونوں وسط ایشیا کے توانائی کے وسائل پر امریکی برتری کی کوششوں کو ناکام بنانے پر بھی متفق تھے۔ امریکہ کا انداز جارحانہ تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ایران نے وسط ایشیا کے آئل اور گیس کی برآمد کے لئے خود کو فطری روٹ کے طور پر پیش کیا تو وہ ایسی کوششوں کو ناکام بنا دے گا۔ حالانکہ ایران کی کیسپئین اور بحیرہ عرب میں موجود بڑی بندرگاہیں، اس کی پائپ لائنوں کا وسیع وعریض ڈھانچہ اور انجینئر نگ کی سہولتیں، حقیقتاً اسے آئل اور گیس کی پائپ لائن کا فطری مخرج ظاہر کرتی ہیں۔

حالانکہ امریکی آئل کمپنیوں پر ایران میں کاروبار کرنے پر، امریکی امتناعی قانون کی وجہ سے پابندی ہے، پھر بھی یورپی اور ایشیائی آئل کمپنیاں تہران میں اپنے دفاتر کھول رہی ہیں تاکہ وہ نہ صرف ایرانی آئل اور گیس فیلڈز میں سرمایہ کاری کر سکیں بلکہ وسط ایشیا سے برآمدی راستوں کے مختلف آپشنز کا بھی جائزہ لے سکیں۔

واشنگٹن، اسی اثنا میں مغربی آئل کمپنیوں اور وسط ایشیائی قیادت دونوں پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ ترکمانستان اور قازقستان سے خلیج میں ایرانی بندرگاہوں تک اہم پائپ لائن روٹ کی تعمیر سے ایران کو باز رکھا جائے۔ لیکن پائپ لائن بس کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔ ترکی یا چین تک لمبی پائپ لائن کی تعمیر کے مقابلے میں، ایرانی آپشن کہیں زیادہ قابل فہم ہے۔ اسی اثنا میں، ایرن نے تیل کے تبادلے کا شاندار انتظام کر ڈالا۔ بحیرہ کیسپئین کی ایرانی بندگاہوں تک پہنچنے والا وسط ایشیائی تیل ایرانی صنعت میں استعمال ہوگا۔ اور بدلے میں خلیج میں موجود اپنی بندرگاہوں کے قریب نکلنے والا تیل ایران' بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کے لئے، وسط ایشیائی ریاستوں کو فراہم کرے گا۔ جس طرح امریکہ نے وسط ایشیا میں ایرانی پائپ لائن تعمیر کرنے کی کوششوں کو روک دیا تھا، اسی طرح ایران نے بھی امریکی کمپنی یونوکال کے ترکمانستان سے پاکستان تک کے پائپ لائن کے مجوزہ پراجیکٹ کو روک کر امریکی آئل

کمپنیوں کو علاقے سے باہر رکھا ہے۔

ایران وسطی ایشیا میں صرف اقتصادی وجوہ کی بنا پر ہی محتاط نہیں۔ معاملہ فہم ایرانی علما نے شروع میں ہی سمجھ لیا تھا کہ سنّی وسط ایشیا میں شیعہ نظریات کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا چنانچہ ایران نے اپنے نظریاتی پروگرام کو ایک طرف کر کے، ریاستی تعلقات اور تجارتی روابط پیدا کرنے کو اہمیت دی۔ مشرقِ وسطٰی میں اپنی سرگرمیوں کے برعکس، وسط ایشیا میں ایران نے کہیں بھی شیعہ مسلک یا اسلامی انقلاب کی خصوصیات یا فوائد کو اجاگر نہیں کیا۔ درحقیقت، ایران کا دوسرا اہم ترین مقصد، روس کی طرح اسلام کے سنّی انقلابی عقیدے کو کچلنا ہے، چاہے وہ طالبان کی شکل میں ہو، ازبکی تحریک ہو یا پاکستان میں سنّی انتہا پسند جماعتیں ہوں۔

جدید سنّی انقلاب پسند تو شیعہ فرقے کو اسلام کا جائز فرقہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ شیعوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ وہابیت اور دیوبند مسلک سے متاثر نئے سنی جہادی عالمی تناظر میں شیعوں کو امریکہ یا روس کی نسبت ذرا کم برائی سمجھا جاتا ہے۔ اپنے عقیدے کی اشاعت سے باز رہتے ہوئے، ایران ایسے حملوں کا جواب دینے پر بہرحال مجبور رہے کیونکہ وہ پوری دنیا میں خود کو شیعہ مسلک کا محافظ سمجھتا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں سنّی انتہا پسندوں اور افغانستان میں طالبان کے ہاتھوں شیعوں کے جابجا قتل عام پر، ایران نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ پاکستان سے اظہار ناراضگی کے علاوہ کئی دفعہ انہوں نے طالبان کے زیر قبضہ افغانستان کی سرحد کو مکمل بند کر دیا۔ روس اس لئے بہت خوش ہے کہ اسلامی انقلاب پسندوں کے درمیان، گو شیعہ مسلک کا ہی سہی ایک انتہائی مخلص اور بے ضرر اتحادی اسے مل گیا ہے۔

ایران کے وسط ایشیا میں، اہم ترین تعلقات ازبکستان سے ہیں اور ان میں بہت اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ صدر کریموف ایک دن تہران سے تعلقات توڑ ڈالتے ہیں اور پھر فوراً ہی دوبارہ بحال کر لیتے ہیں۔ کریموف ایران پر اعتماد نہیں کرتے لیکن وہ ترکی اور پاکستان کو بھی زیادہ اچھا نہیں سمجھتے اور وہ بیک وقت اپنی جنوبی سرحد کے قریب بہت سے طاقتور دشمن بنانے کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ ادھر ایران ازبکی تحریک کے لیڈروں کے انٹرویو فارسی اور ازبک ریڈیو سروس پر نشر کر کے، ازبکستان کو چارہ ڈالتا رہتا ہے۔1990ء کے عشرے کے درمیان ایرانی خفیہ سروس کے ایجنٹوں نے یلدے شیف سے اس امید میں ملاقات کی تھی کہ

وہ ازبکی تحریک کو، ان کے نسلی تعلق کی بنا پر، طالبان اور پاکستان کے ایجنڈے کے خلاف، اپنے کھیل میں شریک کرسکیں۔ممکن ہے مستقبل میں ازبکی تحریک، وسط ایشیا میں ایران کی معاونت پر تیار ہوجائے۔ بہت سے ازبک حکام کا خیال ہے کہ ازبکی تحریک نے ایرانی خفیہ محکموں سے مالی امداد لی ہے لیکن تحریک خود کو طالبان سے منسلک کرتی ہے جو انتہا پسند سنی اور شیعہ مخالف ہیں۔ ایران اس وقت طالبان مخالف قوتوں کو ہتھیار اور گولہ بارود کی شکل میں سب سے زیادہ امداد دے رہا ہے اور تہران کی طالبان کے لئے مخالفت نے، اسے وسط ایشیائی دارالحکومتوں میں بے پناہ پذیرائی بخشی ہے۔

ترکی: پان ترکش اتحاد کا حامی

ترکی کے تعلقات بھی وسط ایشیا سے خاصے پیچیدہ نوعیت کے ہیں-1991ء میں ترکی کو زبردست امید تھی کہ وہ علاقے میں سب سے بااثر کردار ادا کرے گا کیونکہ ترکی کے لوگ ہم نسل اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے وسط ایشیا کے بہت قریب تھے۔ ترکش بین الاقوامیت پسند، بحیرہ روم سے چین تک وسیع، ترکی زبان کے حامل متصل ملکوں کے بلاک کا خواب دیکھ رہے تھے۔ پان ترک ازم کا قدیم خواب ___1924ء میں عثمانی سلطنت کے کمال اتا ترک کے ہاتھوں خاتمے کے بعد___ ایک بار پھر جنم لے رہا تھا۔ ترکی نے اس وقت مشرق سے اپنا ناطہ توڑ کر، مغرب کی جانب رخ کر لیا تھا۔ ترکی کی امریکہ اور نیٹو کی طرف سے خاصی حوصلہ افزائی بھی کی گئی کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ وسط ایشیا، مغرب پرستی، سرمایہ داری اور سیکولر ازم کے مکمل ماڈل ترکی کی پیروی کرے۔ امریکی سفارت کاروں نے وسط ایشیائی قیادت کو ترکی کی تقلید کرنے کے لئے کچھ اسطرح زور ڈالا کہ وہ ترکی کا دورہ کریں اور دیکھیں کہ ایک جدید اور سیکولر مسلمان قوم نے کس طرح ترقی کی ہے۔ دوسری طرف انہوں نے امریکی کمپنیوں سے ایسے ترک بزنس پارٹنرز تلاش کرنے کو کہا، جو وسط ایشیائی مارکیٹ تک رسائی میں، ان کی مدد کرسکیں۔

اور کچھ وقت کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وسط ایشیائی قیادت ترکی کو ایک ماڈل کے طور پر قبول کر رہی ہے۔ ترکی، اپنے اسلامی اور ترک تشخص کے ساتھ، امیر، مغرب زدہ اور سیکولر بھی لگتا تھا۔ اندرونی امن و امان کے لئے بھی ترکی کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانا فطری

محسوس ہوا کیونکہ عوام میں ترکی کے لئے کشش بڑھتی جارہی تھی- سیٹلائٹ کی ذریعے ترک چینل گھر گھر دیکھے جارہے تھے- ہزار ہا لوگ ترک سکالرشپ اور تربیتی پروگرام کے لئے ترکی آئے- دسمبر1992ء تک، آزادی کے صرف ایک سال بعد وسط ایشیا کو ترکی کی جانب سے 1.2 بلین ڈالر مالیت کے قرضے مل چکے تھے- ترکی کے نجی شعبے کے ساتھ تجارت اور مشترکہ منصوبوں پر کام ہو رہا تھا- ترکی نے وسط ایشیا میں ریاستی امداد سے چلنے والے مدرسے اور سکول تعمیر کرنا شروع کردیئے، جہاں اسلامی انقلاب پسندی کو مسترد کر کے ترکی کا اسلام پڑھایا جاتا تھا- لیکن جلد ہی ترکی مختلف سیاسی اور معاشی بحرانوں میں الجھ گیا اور انقلابی سیاسی اسلام ترک معاشرے میں بھی پروان چڑھنے لگا- پان ترک ازم کے نعرے میں انقلابی اسلامی رنگ چڑھنے لگا جس سے وسط ایشیائی قیادت خوف زدہ ہوگئی-

بہرحال، ترکی نے ہمیشہ وسط ایشیاء میں، دونوں جانب اپنا کردار ادا کیا ہے- ترکی حکومت اور خفیہ اداروں کا وسط ایشیائی اپوزیشن تحریکوں سے قریبی تعلق رہا ہے- ترکمانستان یا ازبکستان سے جلاوطن کئے گئے رہنماؤں کو ترکی میں پناہ ملتی رہی ہے-1999ء میں، ازبک حکومت نے صوفی عالم فتح اللہ گولن کی سرپرستی میں چلنے والے ترکی سکولوں کے سارے سلسلے کو بند کردیا- الزام یہ لگایا کہ وہ اسلامی انقلاب پسندوں اور ارک نامی خلافِ قانون اپوزیشن پارٹی کی مدد کرتے ہیں- دراصل ازبک تحریک کے رہنماؤں نے مالی امداد کے حصول کے لئے ترکی کا دورہ کیا تھا اور کچھ امداد انہیں ملی بھی تھی- چونکہ ترکی طالبان کے خلاف ازبک لیڈر رشید دوستم کی مالی معاونت کر رہا تھا اس لئے ازبکی تحریک نے بھی اسلامی بنیاد پرستی کے بجائے پان ترک ازم کے جذبے کے تحت معاونت کی اپیل کی- ترکی نے ابتدا میں ازبکی تحریک کی، اپنے آپشنز کو چھپانے اور ازبکی تحریک کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے، مدد بھی کی مگر جب ازبکی تحریک نے خود کو طالبان اور اسامہ بن لادن سے منسلک کیا تو ترکی نے امداد روک دی- بعض رپورٹوں کے مطابق ترک اسلام پسندوں کو حال ہی میں افغانستان میں دیکھا گیا ہے-

ترکی اب، ازبکی تحریک کو وسط ایشیا کی لئے خطرہ سمجھنے لگا ہے اور ازبکستان کو فوجی امداد مہیا کر کے اور ازبک اور کرغیز افسروں کو ترکی کے فوجی سکولوں میں تربیت کی پیش کش کر کے، تجدید تعلقات کرنا چاہتا ہے- تاہم ترکی بھی وسط ایشیائی ریاستوں میں سیاسی اور معاشی

اصلاحات نہ ہونے اور ان کی قیادت کے جبر وتشدد کی وجہ سے خاصا پریشان ہوا ہے- ترکی کے نجی شعبے نے بھی وسط ایشیا میں اپنی سرمایہ کاری روک دی ہے اور اس کی وجہ ترکی کا معاشی بحران نہیں بلکہ وسط ایشیا میں اصلاحات کا نہ ہونا، کاروباری معاملات کی غیر شفافیت اور کنٹریکٹس کے تعین میں ہیرا پھیری، اس کا سبب ہیں، جس سے سرمایہ کاری غیر محفوظ ہوجاتی ہے-

حالیہ سالوں میں، ترکی کا کردار وسط ایشیا میں کم ہوتا گیا ہے- اس کی وجوہات کچھ یوں ہیں: ترکی کا اپنا اندرونی سیاسی اور معاشی بحران، وسط ایشیائی قیادت کی اصلاحات کے پروگرام میں عدم دل چسپی اور چھ ریاستوں کی باہمی چپقلش- ترکی وسط ایشیا میں مشترکہ اقتصادی منڈی اور مشترکہ سلامتی کے معاہدوں میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا مگر قیادت کی باہمی رقابتوں نے اسے ناممکن بنا دیا- لیکن آج بھی ترکی وسط ایشیا کا ایک اہم کھلاڑی ہے کیونکہ ترکی عوام کے وسط ایشیا سے انتہائی قریبی روابط ہیں اور ویسے بھی وسط ایشیا کی سیکولر اور جمہوری قوتوں کے لئے ترکی ایک بہترین ماڈل ہے- امریکہ، نیٹو اور اسرائیل کی بھی اسے بھرپور حمایت حاصل ہے اور یہ ممالک اس کے علاقے میں اہم کردار ادا کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کررہے ہیں- لیکن جب تک وسط ایشیا میں قیادت کی نئی نسل نہیں ابھرتی ___ جو ترکی کے ماڈل کو زیادہ مثبت انداز میں دیکھ سکے گی، شاید وہ ترکی کی تقلید کرنا چاہے ___ ترکی علاقائی استحکام کے عمل میں کوئی مدد نہیں دے پائے گا-

سعودی عرب: وہابیت کا مبلغ

سعودی عرب نے وسط ایشیا میں ریاستی تعلقات کو سرے سے ہی نظر انداز کردیا- اس کے بجائے، اس نے سعودی اسلامی خیراتی اداروں اور جماعتوں کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ اسلامی گروپوں، مساجد، مدرسوں کی مالی امداد کرکے اور لوگوں کو حج کے دنوں میں مکہ آنے کی دعوت دے کر، وہابی مسلک کو ترویج دیں- سعودی اسلامی خیراتی اداروں نے وسط ایشیا میں مبلغین بھیجے ہیں، سکالرشپ اور اسلامی لٹریچر فراہم کئے ہیں اور قرآن مجید کی لاکھوں جلدیں، ان کی قومی زبانوں میں ترجمے کے ساتھ، انہیں مہیا کی ہیں- لیکن یہ سعودی دریا دلی ایک خاص وجہ سے پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو ان کے انقلابی وہابی

عقیدے سے متاثر کیا جاسکے- علاوہ ازیں،سعودی عرب نے تیل کی بے اندازہ دولت کے باوجود، وسط ایشیا میں حقیقی سرمایہ کاری بہت ہی کم کی ہے- اگرچہ بعض چھوٹی سعودی آئل کمپنیاں، افغانستان کے راستے، مجوزہ پائپ لائن پراجیکٹ میں شامل تھیں- دراصل ابتدا میں سعودی عرب نے تجارتی،معاشی اور سیاسی تعلقات کو اہمیت دینے کے بجائے، وسط ایشیا میں اسلام (ترجیحاً وہابیت) کے لئے عوامی حمایت کا حصول اپنا مشن بنایا تھا- اسطرح کی پالیسیاں نہ صرف کوتاہ اندیشی پر مبنی تھیں بلکہ سعودی عرب کے لئے خطرناک بھی تھیں: سعودی عرب جن گروپوں کو فنڈز دیتا رہا، انہوں نے خود کو سعودی شاہی خاندان کے دشمن، اسامہ بن لادن سے منسلک کر لیا جبکہ وسط ایشیائی حکومتیں سعوی عرب کے بری طرح خلاف ہوگئیں اور اسے اپنا اتحادی سمجھنے کے بجائے، اپنے مستقبل کے استحکام کے لئے خطرہ سمجھنے لگیں-

سعودی عرب علاقے کے سب سے انتہا پسند گروپوں کی مسلسل حمایت کرتا رہا ہے- اس کی ابتدا اس نے1980ء کےعشرے میں افغانستان میں حکمت یار کی حزب اسلامی کی مالی امداد سے کی تھی- وہ1996ءتک بن لادن کی مسئلے پر اختلافات ہونے سے پہلے طالبان کی بھی بھرپور پشت پناہی کر رہا تھا- تاجکستان کی خانہ جنگی کے دوران جماعتِ احیائے اسلام کو بھی مالی امداد دی جاتی رہی تاکہ وہ ایران سے نہ جاملیں- ازبکی تحریک کو مکہ اور مدینہ میں مقیم سعودی ازبکوں کی طرف سے فراہم ہونے والے فنڈز کو بھی روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی- بڑے بڑے اسلامی خیراتی اداروں کا کنٹرول وہابی علماء کے ہاتھ میں ہے اور شاہی خاندان علماء کی تنقید سے بچنے کے لئے، ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا- سعودی حکومت کی روایتی ڈپلومیسی یہ رہی ہے کہ وہ طاقتور مخالفوں کو خرید لیتی ہے-فلسطین کے انتہا پسند گروپوں، سوڈان اور خلیج کے اسلامی گروہوں کے ساتھ بھی یہی کیا گیا تھا-1980ء کے عشرے میں حکومت نے سعودی باغیوں کے افغانستان جیسے دور دراز علاقے میں جاکرلڑنے کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اندرونی خلفشار نہ پھیلاسکیں- لیکن آج طالبان' ازبکی تحریک اور چیچن باغیوں کے ساتھ مصروفِ رزم ہزار رہا سعودی قومی سلامتی کے لئے زبردست خطرہ بنتے نظر آتے ہیں- یہ انقلابی سعودی، بن لادن کی ساتھ مل کر، شاہی خاندان کی حکومت ختم کرنے کے خواہاں ہیں- خطرہ یہ ہے کہ سعودی عرب دوسرا الجزائر نہ

بن جائے- وہاں بھی1980ء کے عشرے میں افغان جنگ میں شریک مجاہدین نے واپس آ کر1990ء کے عشرے کی خانہ جنگی شروع کر دی تھی-

سعودی خارجہ پالیسی ذاتی تعلقات اور اندرونی گروہوں مثلاً علما کی سرپرستی کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے- اس طرح ایک متوازن قومی سلامتی پالیسی کو شکل دینا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے- یورپی ممالک اور امریکہ کے لئے یہ امر مسلسل پریشانی کا باعث رہا ہے کہ سعودی عرب نے افغانستان اور وسط ایشیا کے لئے کبھی واضح خارجہ پالیسی اختیار نہیں کی- تاہم سعودی آئل، اسلحے کے معاہدوں اور اس کی اہمیت کی وجہ سے، مغربی ممالک اور خاص طور سے امریکہ نے، سعودی پالیسیوں میں تبدیلی کے لئے ، دباؤ ڈالنے سے صاف انکار کر دیا- یہی وجہ ہے کہ ایک طرف امریکہ علاقائی افواج کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری جانب، اسلامی دنیا میں اسکا اہم ترین اتحادی سعودی عرب، ازبکی تحریک تک فنڈز پہنچانے کے لئے سعودی شہریوں کو کھلی چھٹی دیئے ہوئے ہے-

لیکن گیارہ ستمبر کے بعد، صورتِ حال ڈرامائی طور پر تبدیل ہوگئی- ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان پر ٹکرائے جانے والے ہوائی جہازوں اور پین سلوینیا میں کریش ہوجانے والے جہاز کو ہائی جیک کرنے والے انیس فدائین میں سے پندرہ سعودی باشندے تھے- اگرچہ سعودی عرب نے امریکی اتحاد کی____ دہشت گردی کے خلاف____ فوری حمایت کا اعلان کر دیا تاہم وہ امریکی افواج کو اڈے مہیا کرنے یا سعودی دہشت گردوں کے ذرائع کو جاننے کے لئے ایف بی آئی سے تعاون کیلئے خاصی ہچکچاہٹ کا شکار تھا- سعودی عرب کے خیراتی اداروں کے ذریعے طالبان کو مالی امداد بند کرنے سے انکار پر امریکی سیاست دانوں اور میڈیا نے شدید مذمت کر کے، اپنے غم و غصے کا اظہار کیا- بن لادن کو مالی امداد دینے والے خیراتی اداروں (ان میں سے بعض ادارے سعودی بھی ہیں) اور دہشت گرد تنظیموں کی فہرستیں جب سے امریکہ نے جاری کرنا شروع کی ہیں، سعودی حکومت کو مجبوراً ازبکی تحریک کی پشت پناہی کرنے والے خیراتی اداروں اور دوسرے کاروباری لوگوں کی سرگرمیوں کی چھان بین کرنا پڑی ہے- ممکن ہے سپلائی کے ان ذرائع کے خاتمے کے لئے حکومتی کریک ڈاؤن کی بھی ضرورت پڑے-

نئی مسلمان شراکت؟

خلیجی عرب ریاستوں نے بھی، نجی مالی معاونت کی اجازت اور اپنی بندرگاہوں اور شہروں میں سہولتیں فراہم کر کے انقلاب پسندوں کو خریدنے کی کوشش کی ہے۔ طالبان، بن لادن اور ازبکی تحریک ان کے شہروں کو منشیات کی نقل وحمل، روزمرہ کی اشیاء کی سمگلنگ، اسلحہ کی تجارت، منی لانڈرنگ اور دوسری مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عرب امارات میں دبئی کی فری پورٹ ان سرگرمیوں کا مرکز بن گئی ہے۔ مغربی خفیہ ادارے، دبئی کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے انتہا پسند اسلامی گروپوں کے لئے بینکنگ اور منی لانڈرنگ کا سب سے بڑا مرکز گردانتے ہیں۔لیکن جنوری 2001ء میں طالبان پر اقوام متحدہ کی پابندیوں اور امارات میں امریکی فوج کی موجودگی کے باوجود، نہ تو اقوام متحدہ نے اور نہ ہی مغربی ممالک نے دبئی میں صورتِ حال پر نگاہ رکھنے کی کوشش کی۔ پشاور اور کراچی کے بجائے، اب دوبئی طالبان اور ازبکی تحریک کے لئے فنڈز کے حصول اور اسلحہ خریدنے کا مرکز بن گیا ہے۔

ہمہ جہتی اسلامی تحریکیں بھی، وسط ایشیا میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم ان میں سب سے زیادہ اہم ہے اور اس میں ترپن اسلامی ممالک شامل ہیں۔ اس نے بھی وسط ایشیا میں کشیدگی کو کم کرنے یا ازبک حکومت اور ازبکی تحریک کے مابین بات چیت شروع کرانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ افغانستان کے متحارب گروہوں کو صلح کے لئے آمادہ کرنے پر بھی ناکام ہوچکی ہے۔ عرب خلیجی ریاستوں کے شدید غلبے اور مسلم دنیا کی باہمی رقابتوں اور تقسیم نے اسلامی کانفرنس کو ان شعبوں میں ناکارہ کر کے رکھ دیا ہے جہاں اس کی منضبط موجودگی ازحد ضروری تھی۔

درحقیقت، وسط ایشیا کے ہمسایہ اسلامی ملکوں نے خارجہ پالیسی کے متصادم مقاصد یا اندرونی اسلامی انقلاب پسندوں کے طے شدہ مقاصد کے لئے کام کیا چنانچہ وہ علاقے میں کوئی بھی تعمیری اقدامات نہیں کر پائے۔ اسلامی دنیا جب تک وسط ایشیا میں تنازعات کے

خاتمے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل نہیں ہوتی اور علاقے کی ترقی کے لئے سرمایہ کاری میں اضافہ کرنا شروع نہیں کرتی، وسط ایشیا اور افغانستان یونہی انقلاب پسندوں کی آماجگاہ بنے رہیں گے اور وہ لوگ وقت آنے پر، اپنے اپنے وطن کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیں گے- اگر وسط ایشیائی ریاستیں، اپنی اندرونی اسلامی تنظیموں کو اپنے ریاستی ڈھانچے میں شامل کرنے کی ضرورت کونہیں سمجھ پائیں تو اسلامی دنیا بھی وسط ایشیا کی ضرورت اور علاقے کے استحکام میں مدد دینے کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی ہے- افغان جنگ کے اختتام اور طالبان کے خاتمے کے بعد موعودہ نئے دور میں، علاقے میں امن و استحکام کے خواہاں صرف یہی امید کر سکتے ہیں کہ اسلامی دنیا اور وسط ایشیا اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں گے-

باب 11

غیر یقینی مستقبل

وسط ایشیا میں اسلام کے جہادی تصور کی مقبولیت کی اصل وجہ اس کے حکمرانوں کا جبر وتشدد ہے- یہ حکومتیں سیاسی بنیادوں کو وسعت دینے، معمولی جمہوری اصلاحات کے نفاذ یا کسی بھی طرح کی سیاسی اپوزیشن کی اجازت دینے سے بھی انکاری ہیں- غربت اور بے روزگاری میں بے پناہ اضافہ اور معاشی مواقع میں ازحد کمی، ایسی صورتِ حال ہے جس میں کوئی بھی تنظیم یا پارٹی، قرضوں کے بوجھ تلے دبے معاشرے میں، بہتر زندگی کی امید جگا کر، عوامی حمایت حاصل کرسکتی ہے- حکمران صرف تشدد کی زبان جانتے ہیں- وہ اسلامی جہادی قوتوں کو ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی شعائر کو، اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں- اسی کوتاہ نظری نے زیادہ انقلابی اسلام پسندوں کے لئے عوامی حمایت کا دائرہ وسیع تر کیا ہے-

وسط ایشیا کے استحکام کو سب سے بڑا خطرہ افغانستان کی خانہ جنگی سے ہے، مگر اسلامی انتہا پسندی اور اسامہ بن لادن سے نتھی دہشت گردی، جس کا طالبان، ازبکی تحریک اور پاکستان میں سلامی جہادی گروپوں پر گہرا اثر ہے، کے اضافے نے بھی علاقائی مسائل کو خاصا الجھا کر رکھ دیا ہے- بن لادن نے طالبان میں بین الاقوامی تصورات کو اپنانے کی حوصلہ افزائی کی ہے- خاص طور سے1999ء میں ازبکی تحریک کو پناہ دینے کے لئے طالبان کو قائل کیا- ازبکی تحریک کی مالی امداد کے ساتھ، لادن نے وسط ایشیا کے بہت سے جہادیوں کو اپنی تنظیم القاعدہ میں شامل کرلیا- امریکی انٹیلی جنس کے مطابق القاعدہ کا عالمی

نیٹ ورک چونتیس ممالک میں سرگرم عمل ہے۔ یہی نیٹ ورک وسط ایشیائی جہادیوں اور عالمی انقلابی اسلام کی سیاست کو باہم منسلک کرتا ہے۔ انہیں مالی اور فوجی امدا فراہم کرتا ہے اور ان کے متعلقہ ریاستوں میں خفیہ طور پر آنے جانے کا انتظام کرتا ہے۔

ان گروپوں نے منشیات کی تجارت میں بڑا پیسہ بنایا ہے۔خصوصاً بن لادن اس میں بہت ملوث رہا ہے۔1980ء کے عشرے میں منشیات کی برآمد کا واحد راستہ پاکستان تھا۔ اور اب وہ ایران، چین، وسط ایشیا اور عربی خلیج تک پھیل گیا ہے۔ ان کا کنٹرول پاکستانی، افغان، عرب، چیچن اور وسط ایشیائی مجرم تنظیموں کے ہاتھ میں ہے۔ منشیات کا پیسہ سیاسی سرگرمیوں کے پھیلاؤ اور اسلحہ کی خرید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ تنظیمیں اب ازبکی تحریک اور دوسری اسلام پسند انقلابی تحریکوں کی وزارتِ خزانہ کا کام انجام دے رہی ہیں۔

دریں اثناء انتہا پسند گروپوں اور منظّم جرائم کی وجہ سے جنگیں صورتِ حال کو مزید ہوا ملی ہے، ان کے ساتھ علاقائی تنازعات نے بھی علاقائی معاشی حالات کو بری طرح تباہ کیا ہے۔ یہ انتہا پسند گروپ اپنے فوجی مراکز، پناہ گاہوں اور مجرمانہ معاشی سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اگرچہ انکی کاروائیاں اپنے ملک سے بہت دور ہوتی ہیں مگر اس سے ان کے اپنے ملک بھی اسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ''سرحدوں اور انتظامی اہلیت کی کمزوری، بین الاقوامی متحرک نیٹ ورکس اور بین الاقوامی مسلح گروہوں کے ساتھ مل کر جنگ زدہ معیشت مثلاً لوٹ مار، سمگلنگ اور منشیات یا اسلحے بلکہ انسانوں کی تجارت کے لئے بھی مثالی صورتِ حال پیدا کردیتے ہیں۔ یہ معاشی سرگرمیاں کمزور ریاستی ڈھانچے میں گھس کر اور منافع بخش مواقع پیدا کرنے والے تنازعات کے ذریعے، اپنے مخصوص مفادات کو جنم دیتی ہیں۔'' یہ برنٹ روبن کا مشاہدہ ہے۔ مفلسی سے پیدا ہونے والے جرائم اور منشیات کی تجارت ایسے مسائل پیدا کررہے ہیں، جن کے متعلق پہلے کسی کو علم بھی نہیں تھا۔ ایڈز کے خاتمے کے لئے بین الاقوامی کمیٹی کا کہنا ہے کہ وسطی ایشیا کی پانچ ریاستوں میں اس وقت اندازاً تین لاکھ افراد ایڈز میں مبتلا ہیں۔ انجکشن کے مشترکہ استعمال اور منشیات کی عادت سے یہ مرض شدید وبائی صورت اختیار کرسکتا ہے۔

2001ء کا موسمِ گرما ختم ہونے لگا تو وسط ایشیا ازبکی تحریک کے حملوں کا منتظر تھا اور پہلی دفعہ، بین الاقوامی برادری وسط ایشیا کے بحران کو عالمی خطرے کے طور پر محسوس کرتی نظر

آ رہی تھی- نیٹو، یورپی یونین، بش کے وائٹ ہاؤس، بیجنگ اور ٹوکیو کی سرکاری راہداریوں میں بیانات دیئے جا رہے تھے، رپورٹیں جاری ہو رہی تھیں اور وارننگ دی جا رہی تھی کہ وسط ایشیا اور افغانستان کے تنازعات اور بین الاقوامی دہشت گردی کا خطرہ بین الاقوامی سلامتی اور استحکام کے لئے خوف ناک شکل اختیار کر رہا ہے۔ صدر کلنٹن کے قومی سلامتی کے سابقہ مشیر انتھونی لیک نے ان چھ ''گرم مقامات'' کے متعلق اپنی تجزیاتی رپورٹ چھاپی جو دنیا کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرغانہ کی وادی کو مستقبل کے ''تین گرم ترین خطرناک مقامات'' میں سے ایک قرار دیا۔ ''افغانستان میں مرتکز سرگرم مذہبی گروہ پورے وسط ایشیا اور کاکیشیا میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خراب معاشی صورت حال انقلابی اپیل کو اور زیادہ مقبول بنا دے گی۔'' انہوں نے خبردار کیا۔ یورپ کے بین الاقوامی کرائسس گروپ کا بھی لگ بھگ یہی خیال ہے۔ ''آبادی کی اکثریت کے لئے علاقائی صورت حال اتنی بگڑ گئی ہے کہ صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا ہے اور بے چینی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے- امکان یہ ہے کہ شدید غربت' حد سے زیادہ بڑھتی کرپشن، جابرانہ پالیسیوں اور مقامی ضروریات کی تکمیل میں حکومت کی ناکامیوں پر مایوسی اور غم وغصہ ایسی مقامی بے چینی اور ہنگامہ آرائی کی شکل اختیار کر سکتا ہے جو بڑھ کر وسیع علاقائی بدامنی پھیلانے کا باعث بن جائے۔''

اور اہم ترین امریکی میڈیا، نیویارک ٹائمز نے پہلی دفعہ اس بحران کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے اگست 2001ء میں خبردار کیا کہ وسط ایشیائی ''حکومتوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک مستحکم قوت ہیں۔ لیکن ان کا ظلم و تشدد عدم استحکام کو جنم دے رہا ہے۔ ازبکستان اپنے وسیع وعریض علاقوں میں سرکاری تحویل سے باہر تمام اسلامی اداروں کو زبردست کریک ڈاؤن کا نشانہ بنا رہا ہے۔ انتہائے ظلم و جبر تمام دیہاتوں میں مخالفت پیدا کر رہا ہے اور مذہب کو انڈر گراؤنڈ ہونے پر مجبور کر رہا ہے......اگر وسط ایشیا میں طالبان کی طرح کا کوئی خطرہ ابھرا تو اسے جنم دینے میں علاقائی آمریتوں کا مکمل ہاتھ ہوگا۔''

تاہم گیارہ ستمبر سے پہلے علاقےکے آمر حکمران موجود خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے یا باہمی جھگڑوں کو اپنے انداز میں ظاہر کر کے بین الاقوامی برادری کو آسانی سے دھوکہ دے دیتے تھے۔ ازبکستان قومی سلامتی کے لئے ادھر ادھر سے اسلحہ مانگتا پھرتا تھا مگر اس نے

از بکی تحریک کو کبھی سیاسی یا فوجی خطرہ تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی حکومت نے تنازعے کی بنیادی اقتصادی وجوہات کو دور کرنے کی کوئی خواہش ظاہر کی۔ جب پاکستان نے ازبکستان اور طالبان اوراز بکی تحریک اور بین الاقوامی برادری کے درمیان گفت وشنید کرانے کی کوششیں کیں، اس وقت بھی پاکستان طاقت کے اس کھیل میں ایران اور بھارت کو نیچا دکھانے کے لئے ان مسلح گروہوں کی خفیہ امداد کر رہا تھا۔ سعودی عرب بین الاقوامی برادری کو یقین دلا رہا تھا کہ وسط ایشیا کے تنازعے میں اس کا کوئی کردار نہیں اور نہ ہی وہ اس میں ملوث ہونا چاہے گا اور ساتھ ہی اپنے انتہا پسند وہابی علماء کو طالبان اور از بکی تحریک کے لئے مسلسل مالی امداد دینے پر اکسا رہا تھا۔ ماسکو کا کردار اور بھی زیادہ تباہ کن تھا۔ ایک سطح پر تو روس عالمی طاقت کے طور پر انتہائی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوجی مداخلت کنٹرول کرنے میں ان حکومتوں کی مدد کر رہا تھا اور دوسری جانب ہتھیار دے کر تنازعات کی شدت میں اضافہ اور ریاستی جبر کے تسلسل میں تعاون کر رہا تھا۔ ماسکو کے متعلق یہ شبہ بھی ہے کہ اس کے از بکی تحریک کے ساتھ خفیہ انٹیلی جنس تعلقات رہے ہیں۔

یہ پیچیدہ علاقائی تناظر ہر ریاست میں اور زیادہ پیچیدگی کا باعث بنا ہے۔ چنانچہ تاجکستان میں جماعت احیائے اسلام کے مخلوط حکومت میں موجود وزراء نے از بکی تحریک سے اپنے تعلقات جاری رکھے اور اسے امداد دی تا کہ وہ مخلوط حکومت میں اپنا دباؤ قائم رکھ سکیں۔ اسی اثنا میں صدر رحمانوف کے ساتھیوں نے طالبان کے خلاف جنگ میں طالبان مخالف اتحاد کی بھرپور مدد کی تا کہ ماسکو کو خوش کر کے اس سے فوجی مدد حاصل ہو سکے۔ اس طرح دونوں اطراف نے غیر متعلقہ بیرونی قوتوں کی مدد کی اور یہ بات تاجکستان کی اقتصادی ترقی کے لئے انتہائی نقصان دہ تھی۔

ازبکستان میں بھی صورت حال اتنی ہی پیچیدہ رہی ہے۔ شمالی تاجکستان میں ازبک نسل کے بنیادی سیاسی کرداروں کو تاجک امن معاہدے میں شامل ہی نہیں کیا گیا اور صدر کریموف نے ان تاجکوں کو پناہ دے کر اور ٹھکانے فراہم کر کے اس مسئلے کو بری طرح اچھالا۔ بعد میں انہوں نے ان مہاجرین کو واپس کرنا شروع کر دیا۔ 2001ء کے آغاز میں انہیں محسوس ہوا کہ وہ مہاجرین کو گھر بھیج کر تاجکستان کے لئے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔ وہ وہاں بدامنی پھیلائیں گے اور ان کی خاصی بڑی تعداد کی واپسی نازک تاجک معیشت کے

لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ ازبک کمانڈر محمود خدائے بردیف اور اس کے ساتھیوں کو، تاشقند میں اپنے پاس رکھ کر تاجکستان اور روس دونوں پر اپنا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ انہیں ان دونوں کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ ازبکی تحریک کی خفیہ حمایت کر رہے ہیں۔

''کریموف حکومت کا بے ہودہ رویہ مسلح اسلامی انتہائی پسندوں کی حمایت میں اضافے اور خطرناک معاشی بگاڑ پیدا کر کے اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ روزافزوں مخاصمت کی شکل میں علاقائی استحکام کو براہ راست نقصان پہنچا رہا ہے۔'' یہ خیال بین الاقوامی کرائسس گروپ کا ہے۔ چینی صدر جیانگ زیمن نے اپنے پڑوسیوں کو مشورہ دیا: ''دوسروں کی سلامتی کے بنیادی مفادات کو نقصان پہنچا کر کوئی ملک بھی اپنی سلامتی کو محفوظ نہیں کر سکتا۔'' لیکن چینی صدر کو چین کی مغربی سرحدوں پر موجود صورت حال پر شدید تشویش بھی تھی کیونکہ طالبان اور ازبکی تحریک کے تربیت یافتہ اوئی غرزن جیانگ صوبے میں بدامنی کو جنم دے رہے تھے۔ چین کو چار و ناچار اس علاقے کا اہم کھلاڑی بننا پڑ رہا ہے۔

ان مسائل کو طے کرنے کے لئے اگر وسط ایشیائی حکمران، چین اور روس کوئی منضبط حکمت عملی اختیار نہیں کر سکے تو یہی حال امریکہ اور یورپی ممالک کا بھی ہے۔ وسط ایشیا کے جابر حکمرانوں کی دہشت گردی کے خلاف امداد اور ہلکے پھلکے لہجے میں انسانی حقوق کی پامالی پر لیکچرز کی کلنٹن انتظامیہ کی پالیسی علاقے کے لئے کوئی واضح حکمت عملی نہیں تھی۔ بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ فوجی امداد کو اقتصادی امداد اور دوسری ترغیبات سے منسلک کر دیا جاتا۔ معاشی اور سیاسی نظام کو آزاد بنانے کے لئے ان حکومتوں پر مسلسل دباؤ ڈالا جاتا اور ضروری بین الاقوامی امداد کو افغانستان میں جنگ کے خاتمے کے لئے متحرک کیا جاتا۔ مغرب کو ایک ایسی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت تھی جو علاقے کو مقامی مسائل کی گمبھیر زنجیر سمجھنے کے بجائے ایک اکائی کے طور پر لیتی۔

مثال کے طور پر افغانستان میں ابتر ہوتی صورت حال اور یہ حقیقت کہ ہزاروں کشمیری اور پاکستانی انتہاپسندوں نے ازبکی تحریک کے ہمراہ کابل میں تربیت حاصل کی ہے، تسلیم کئے بغیر' مغرب ازبکی تحریک کے خلاف جنگ میں شریک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ناتجربہ کار مغربی بصیرت اسے محض مختلف نسلی گروہوں، ریاستوں اور ان کے متضاد مفادات کا پیچ ورک سمجھ رہی تھی جبکہ اس ساری محاذ آرائی کے نتیجے میں باغیوں کے مابین ہم آہنگی اور مقاصد

کی مماثلت روز افزوں ہوتی چلی گئی۔ مختلف جہادی گروہ ایک دوسرے کو رسد بہم پہنچا رہے تھے، باہمی تعاون کر رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان کی فوجی اور نظریاتی یگانگت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پاکستان کے شیعہ مخالف گروہ طالبان اور ازبکی تحریک کے ساتھ جا ملے تاکہ ''جہادی'' تشخص پا سکیں۔ ادھر ازبکی تحریک طالبان کے لئے اور بن لادن کے عرب مجاہد ہر کسی کے لئے لڑ رہے تھے۔

قابل فہم حکمت عملی اختیار کرنے کے بجائے مغربی پالیسی سازوں نے اپنی توجہ دو عوامل پر مرتکز کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرے اہم عوامل کو شامل کئے بغیر علاقائی استحکام کا حصول قابل عمل ہوگا۔ بیرونی مداخلت کو روکنے کے لئے علاقائی افواج کی تعمیر میں امداد اور توانائی کے ذخائر کے استعمال......اس میں نئی پائپ لائنوں کی تعمیر بھی شامل تھی...... کے ذریعے، اندرونی سماجی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے علاقائی حکومتوں کو معاشی ترغیبات فراہم کرنا کافی ہوگا۔ دونوں میں سے پہلے فوجی امداد کی ابتدا ہوئی اور جلد ہی یہ ایک اہم بین الاقوامی منصوبہ بن گیا۔

وسط ایشیائی ریاستوں کو دوسری آزاد روسی ریاستوں کی طرح بلکہ روس کو بھی یہ محسوس ہوا کہ ان کی بدحال معیشتوں کی وجہ سے ان کی فوجی صلاحیتیں بھی ڈرامائی طور پر کمزور پڑ گئی ہیں۔ وسط ایشیا میں ہوائی جہاز، ٹینک اور آرٹلری (سوویت یونین کی وراثت) انتہائی پراگندہ اور ناقابل مرمت ہو چکے تھے اور بھاری ہتھیاروں کی کثیر تعداد ناقابل استعمال پڑی تھی۔ فوجی افسران، جن میں اکثریت روسی نسل سے تعلق رکھتی تھی (غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے) اس طرح کی بغاوتوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ کم تنخواہ، کرپشن، خراب رہائش اور ترقی کے کم مواقع کی وجہ سے جوش و جذبہ باقی نہیں رہا تھا۔ تمام ریاستی افواج میں رضاکارانہ بھرتی کے بجائے جبری بھرتی کا رواج ہے۔ تربیت، تحریک اور پیشہ ورانہ جوش بہت کم ہے اور فوج سے بھاگ جانے کے واقعات عام ہیں کیونکہ فوجی جبری مشقت، ادنیٰ خوراک اور بیماری سے تنگ آ جاتے ہیں۔ حال ہی میں روس اور امریکہ نے ان کے افسروں اور سپاہیوں کی تربیت کے لئے اقدامات شروع کئے ہیں اور امریکہ نے اپنی سپیشل فورسز کی طرز پر ازبک اور کرغیز فوج میں خصوصی کمانڈو دستے تیار کرنے میں بھرپور مدد دی لیکن ظاہر ہے حوصلہ اور تیاری راتوں رات نہیں بڑھائے جا سکتے۔

ازبکستان کی پچاس ہزار افراد پر مشتمل (اور اتنے ہی ریزروفوجی بھی) فوج، علاقے کی سب سے بڑی فوج تھی۔ ان فورسز میں محکمہ داخلہ کے اٹھارہ ہزار سپاہی اور ایک ہزار نیشنل گارڈز بھی شامل تھے۔ لیکن 2000ء میں ازبکی تحریک کے حملوں کے دوران یہ فوجی قوت بہت کم محسوس ہوئی کیونکہ یہ لوگ آسانی سے تحریک کے حملوں کا شکار ہوگئے۔ مزید براں ازبکستان کی طویل سرحدوں کی حفاظت (جو تقریباً ہر وسط ایشیائی ریاست اور افغانستان سے بھی ملتی ہیں) اس فوج کیلئے جان جوکھوں کا کام تھا۔ سرحدوں کو بند کرنا...... جیسا کہ فرغانہ میں کوشش کی گئی...... مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا کیونکہ ازبکی تحریک نے بارہا ازبکی سرحدی محافظوں کا حصار توڑ کر رکھ دیا اور تاریخ نے کئی دفعہ یہ ثابت کیا ہے کہ گوریلا حملوں کو روکنے کے لئے بڑی افواج بے مقصد اور ناکارہ ہوتی ہیں۔

کرغیزستان نے 1999ء میں ازبکی تحریک کے حملوں سے پہلے اپنی مسلح افواج کو بالکل ہی نظرانداز کیا ہوا تھا۔ حکومت کو صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے رضا کاروں کو بلانا پڑا کیونکہ جبری بھرتی کئے گئے سپاہیوں کا پیشہ ورانہ تعلق اور تربیتی معیار، دونوں ہی بہت پست تھے۔ ان کے بھرتی کئے ہوئے سپاہیوں میں خانہ بدوش شکاری اور کھوجی شامل تھے لیکن کم از کم انہیں ہتھیار کا استعمال تو آتا تھا۔ 1999ء اور 2001ء کے درمیان کرغیز حکومت نے اپنا دفاعی بجٹ 14 ملین ڈالر سے بڑھا کر 29 ملین ڈالر کر دیا، جو ان کی اندرونی خام پیداوار (GDP) کا 8% تھا۔ 2001ء تک کرغزستان نے 20 ہزار فوجی بھرتی کر لئے جن میں 12 ہزار باقاعدہ فوج میں تھے جبکہ باقی سپاہیوں کو داخلہ، دفاع اور قومی گارڈز میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سوویت زمانے سے کرغیزستان کے پاس بچاس جنگی جہاز اور سپیئر پارٹس مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بے کار پڑے ہیں۔ یہ تھی کرغیز فضائیہ، تاہم اب وہ ہیلی کاپٹروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تشکیل دے رہا ہے۔ کرغیزستان میں روس کا فوجی ہیڈ کوارٹر بھی ہے جو اوش کے روسی ٹرانسپورٹیشن بٹالین کے مرکز میں قائم ہے۔ سو سے زیادہ روسی فوجی ماہرین اسی مرکز سے مداخلت کے خلاف کرغیز کاروائی میں مقامی فوج کا ساتھ دیتے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا کہ 2001ء کی ابتدا میں اوش کے ہوٹلوں میں اس امریکی خصوصی فوجی دستے ''گرین بیریٹس'' کے افراد ٹھہرے ہوئے تھے جو کرغیز فوجیوں کو کمانڈو کورسز کرا رہے تھے۔

تاجکستان میں خانہ جنگی کے بعد جماعت احیاء اسلام کے ایک ہزار گوریلوں کو باقاعدہ

فوج میں شامل کر لیا گیا- پھر بھی2001ء میں کل تاجک فوج فنڈز کی کمی کی وجہ سے صرف نو ہزار تھی۔ دراصل تاجکستان میں مقیم روسی فوج قومی سلامتی کی حقیقی ذمہ دار تھی۔ (گیٹ چن سکایا ڈویژن کے)8200فوجیوں کو پورے ملک میں پانچ فوجی مراکز پر متعین کیا گیا تھا۔جبکہ14,500 روسی گارڈ (ان میں زیادہ تر جبری بھرتی شدہ تاجک تھے، البتہ ان کے افسر روسی تھے) تاجک افغان سرحدوں پر متعین تھے۔ روسی افسران اور جوانوں کو تاجک فوجیوں کی نسبت50%زیادہ تنخواہ دی جاتی تھی تاکہ وہ وہاں سے جانے کا نہ سوچیں۔ یہ سرحدی محافظ اپنی کرپشن کی وجہ سے خاصے بدنام تھے اور ان کے کئی اعلیٰ افسران منشیات کی سمگلنگ میں بھی ملوث تھے۔

2001ء میں، قازقستان نے ازبکی تحریک سے اپنی آئل فیلڈز کی حفاظت کے لئے اپنے دفاعی بجٹ کو دوگنا کرکے 171 ملین ڈالر کر دیا جو ان کی اندرونی خام پیداوار کا ایک فیصد تھا۔ افسروں اور جوانوں کی تنخواہوں میں 30%اضافہ کر دیا گیا۔ جولائی 2001ء میں قازقستان نے بارہ دن تک اپنی تین جنوبی ڈسٹرکٹس میں اپنی سب سے بڑی مشقیں کیں اور امریکی مدد سے دراندازی کے خلاف جوابی کاروائیوں کے لئے کمانڈو ٹریننگ بھی شروع کر دی۔ قدیم سوویت سازوسامان کو فوری طور پر ٹھیک ٹھاک کیا گیا۔ ساتھ ہی امریکہ نے نیا اطلاعاتی اور پہاڑی جنگ کا خصوصی سازوسامان فراہم کیا۔ قازقستان نے اپنی دفاعی حکمت عملی کو بھی پوری طرح تبدیل کر دیا اور چار نئے فوجی اضلاع تشکیل دیئے جنہیں دراندازی کے خلاف جوابی کاروائی کیلئے متحرک دستے مہیا کئے گئے۔ اس وقت قازق افواج ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہیں۔

جنوری2001ء میں روس نے اعلان کیا کہ وہ قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے ساتھ مل کر تین ہزار جوانوں پر مشتمل برق رفتار فورس تشکیل دے گا اور اسے دوشنبہ سے لیز پر لئے گئے نئے فوجی مرکز میں تعینات کرے گا۔ اعلان کے باوجود تاجکستان کے سوا کوئی ملک اپنی سرزمین پر ایسی فورس کی موجودگی کا خواہاں نظر نہیں آتا۔ مستقبل قریب میں کسی سریع الحرکت فورس کی تشکیل ناممکن ہی لگتی ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ روسی201 متحرک رائفل ڈویژن کو ہی نیا نام دے کر دوشنبہ میں رہنے دیا جائے۔

اسی طرح کی ایک کوشش شنگھائی فائیو کی جانب سے بھی جاری ہے۔2000ء میں

گروپ نے دہشت گرد مخالف ایک نیا مرکز بشکیک میں قائم کرنے کی منظوری دی تھی۔ جس کے ذمے خفیہ معلومات کا حصول، فوجی دستوں کی تعیناتی اور فوجی کاروائیوں کو باہم مربوط کرنا تھا۔ لیکن کسی بھی ملک نے اس کے قیام کے لئے اپنے ذمے واجب فنڈز یا اپنے افسران فراہم نہیں کئے۔ ہر ملک اپنی افواج اور اپنے کنٹرول کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ قومی بدامنی کے باوجود حقیقی فوجی تعاون دور کی بات ہے۔

آٹھویں باب میں، میں بتا چکا ہوں کہ فوجی امداد علاقے میں مسلسل آتی رہی ہے۔ گیارہ ستمبر تک امریکہ، چین، اسرائیل اور نیٹو ممالک نے (نیٹو شراکت برائے امن پروگرام کے تحت) وسط ایشیائی افواج کی تعمیرنو کے لئے فوجی امداد مہیا کی ہے۔ مغرب کی زیادہ تر امداد غیر مہلک ساز وسامان مثلاً تربیت اور تعاون پر مشتمل تھی مگر روس اور چین نے ہتھیار فراہم کئے۔ وسط ایشیائی افواج کی سالخوردہ فوجی صلاحیتوں کی تعمیر اور دراندازی کے خلاف جدید تربیتی پروگرام یقیناً اہم ہے۔ لیکن یہ اہم فوجی امداد کسی طرح کی بھی معاشی یا سیاسی بہتری کا باعث نہیں بنی۔ علاقائی حکمرانوں کو اپنے ریاستی ڈھانچوں کو بہتر بنانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ فوجی امداد کے ساتھ وسیع پیمانے کی معاشی ترغیبات کی پیش کش نہیں کی گئی۔ مثلاً غیر ملکی قرضوں کی معافی کا وعدہ یا معاشی ترقی کے لئے جامع مالی امداد وغیرہ۔ اس طرح حکمران صرف فوجی حکمت عملی پر ہی نظر نہ رکھتے بلکہ سماجی اور معاشی حکمت عملی کی تشکیل اور اس پر عملی جامہ کا بھی سوچتے۔

تاریخی طور پر سماجی اور اقتصادی امداد نے ایسی دراندازیوں کو روکنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ کھاتی پیتی، رہائشی سہولتوں اور روزگار کی حامل آبادیوں میں ازبکی تحریک یا کسی بھی دہشت گرد تنظیم کو اپنے مطلب کے جوان نہیں مل سکتے۔ ایسی ہی صورت حال اس وقت سامنے ہے۔ مغربی اتحاد نے طالبان اور القاعدہ کے خلاف جنگ میں وسط ایشیا میں فوجی ٹھکانے مانگے اور لے بھی لئے۔ جنگ کے دوران امریکہ شاید وسط ایشیائی ممالک پر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے مگر جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ (اگر چاہے تو) یقیناً علاقائی حکمرانوں پر اصلاحات کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لئے زیادہ سختی سے اثر انداز ہوگا۔ ایک اور اہم مغربی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ قازقستان، ترکمانستان اور آذربائی جان کے قدرتی وسائل سے صحیح استفادے کے لئے ایران اور روس کے اثر سے آزاد پائپ لائن بچھائی جائے تاکہ

وسط ایشیا کی آئل اور گیس کی مغرب تک برآمدات محفوظ کی جاسکیں اور اس کے ذریعے کمایا جانے والا زرمبادلہ واقعتاً علاقے کے عوام کی بہبود پر خرچ کیا جائے۔اب تک مغربی آئل کمپنیوں کی سرمایہ کاری کے ذریعے آنے والا پیسہ یا اس کے اثرات عوام تک نہیں پہنچے۔ آذربائی جان، قازقستان اور ترکمانستان تیل کی امیر ترین قوموں میں سے ہیں مگر ان کے حکمران بھی علاقے کے سب سے کرپٹ لوگ ہیں۔ ان حکمرانوں نے بیرونی سیاحت اور قیمتی تحائف کے علاوہ امریکی آئل کمپنیوں سے ٹھیک ٹھاک پیسے بٹورے ہیں۔ اچھا خاصا زرمبادلہ کمانے کے باوجود یہ ریاستیں اپنے کارکنوں کو باقاعدہ تنخواہیں اور پنشن دینے کے معاملے میں خاصی پیچھے ہیں۔

درحقیقت مغربی آئل کمپنیوں کی سرمایہ کاری ایک بے انتہا دولت مند اور کرپٹ اقلیتی طبقے کو جنم دے کر مزید سماجی بے چینی پیدا کر رہی ہے۔ وسط ایشیا کے عوام روزانہ معاشی عدم مساوات اور کرپشن کے مظاہرے دیکھتے ہیں۔ باکو اور الماتے کی سڑکوں پر دوڑتی مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو کاریں حکمران طبقے کی خواتین کا شاہانہ انداز، کپڑوں اور زیورات کے ڈیزائنوں کے لئے فائیوسٹار ہوٹلوں میں جمگھٹے، ٹھاٹھ دار طرز زندگی، حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کے سوئس بینک اکاؤنٹس، یہ طرز زندگی تیسری دنیا کے تیل کے ذخائر کے مالک انڈونیشیا اور نائیجریا میں بھی آیا ہے، جہاں پیسہ اچانک ہی برسنے لگا۔ وہاں بھی حکمران طبقہ بے پناہ دولت مند ہوگیا ہے جبکہ عوام کی بھاری اکثریت مزید غریب، ناراض تر اور حد سے زیادہ پریشان ہوگئی ہے۔

یہاں ایک امریکی کمیونسٹ جان ریڈ کے ، اسّی سال پرانے تبصرے کا تذکرہ انتہائی برمحل ہے، جو انہوں نے وسط ایشیائی بالشویکوں کے آئل کے متعلق امریکی ہوس کا ذکر کرتے ہوئے کیا تھا:

> ''آپ کو پتہ ہے کہ ''باکو'' امریکہ میں کس طرح بولا جاتا ہے؟ اسے ''آئل'' کہا جاتا ہے اور امریکی سرمایہ دار پوری دنیا میں آئل کی اجارہ داری قائم کرنے کی کوششوں میں لگا ہے۔ تیل کے چکر میں خون بہایا جا رہا ہے۔ تیل کے لئے امریکی بینکاروں اور سرمایہ داروں کی ہر جگہ کوشش ہے کہ جہاں کہیں تیل مل جائے، وہاں کے علاقوں کو فتح کرکے مقامی لوگوں کو غلام بنا لیا جائے......مشرق کے باشندو! تم نے، ایشیا کے لوگوں نے ابھی امریکہ کی

حکمرانی کا مزانہیں چکھا۔''

یونو کال کی، عین خانہ جنگی کے دوران افغانستان کے راستے گیس پائپ لائن بچھانے کی شدید مگر ناکام کوشش اس امر کی غماز ہے کہ امریکی آئل کمپنیاں کس طرح تنازعات کو اپنے زیادہ سے زیادہ مفادات کے حصول میں استعمال کرتی ہیں۔

پھر بھی جان ریڈ کے زمانے کے سرمایہ دارانہ نظام کا آج کی طاقتور مگر زیادہ سماجی شعور کی حامل امریکی آئل کمپنیوں کے ساتھ تقابلی جائزہ یقیناً زیادتی ہوگا۔ اب تو آئل کمپنیاں جہاں تیل کے لئے ڈرلنگ شروع کرتی ہیں، وہاں عموماً سکول، ہسپتال اور سڑکیں بناتی ہیں۔ علاقے میں ماحولیاتی تحفظ کے پروگرام پر عمل کرتی ہیں۔ شیوران قازقستان میں اسی انداز میں کام کر رہی ہے لیکن آئل کمپنیوں کی یہ ذمہ داری بہرحال نہیں ہوتی کہ اپنی دولت یا رسوخ کے ذریعے علاقائی حکومتوں کو......تنازعات اور مسائل کے حل کے لئے......زیادہ جامع حکمت عملی کی تشکیل پر مجبور کریں اور نئے فوجی دستوں کی تعمیر سے باز رکھیں۔ وسط ایشیا کے تیل کے ذخائر اور تقریباً ہر ملک میں سے گزرنے والی پائپ لائن کی تعمیر، امریکہ اور مغربی ممالک کے ہاتھوں میں ایک انتہائی اہم ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ سماجی اور سیاسی اصلاحات کے لئے علاقائی حکمرانوں کو مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ وہ ہتھیار ہے جسے کبھی صحیح معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ تیل کمپنیاں، اگر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ جنگ، دکھ، تکلیف اور تنازعات سے تباہ ملک میں لوگوں کی سماجی مشکلات کو نظرانداز کر کے پائپ لائن کی تعمیر یا بعدازاں اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں تو وہ کوتاہ اندیش ہیں یا انتہائی غیر ذمہ دار۔

تیل ہی علاقائی تعاون کی حقیقی امید کی بنیاد ہے۔ بڑی طاقتوں روس، چین اور امریکہ کے درمیان علاقے میں توانائی کے وسائل کو بروئے کار لانے اور پائپ لائنیں بچھانے کے موجودہ مقابلے کو تعاون میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ روس کو دہشت گردی کے خلاف امریکی تعاون کی امید نہیں رکھنی چاہیے، اگر وہ علاقے کی ترقی اور ریاستوں کو تیل برآمد کرنے کے راستے کے چناؤ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ چین کی تیل کی ضروریات بھی اگلے عشرے میں بہت بڑھ جائیں گی، اس لئے اسے بھی آئل کمپنی کنسورشیم کے قیام کے لئے امریکہ اور روس کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔ اس طرح نہ صرف توانائی کے نئے ذخائر دستیاب ہوں گے بلکہ علاقائی حکمرانوں کو بھی پتہ چل جائے گا کہ علاقے میں اشد ضروری

اصلاحات سے بچنے کیلئے وہ بڑی طاقتوں کے اختلافات کو استعمال نہیں کر سکتے۔

افغانستان میں جنگ کے خاتمے اور ایک مخلوط حکومت کے قیام کے بعد توقع کی جانی چاہیے کہ امریکہ تمام بڑی طاقتوں، علاقائی حکومتوں، ورلڈ بینک اور آئل کمپنیوں کی مکمل معاونت کے ساتھ ملک میں معاشی تعمیرنو کے عمل کے قابل ہو جائے گا۔ افغانستان کے راستے وسط ایشیا سے خلیج تک لائی جانے والی پائپ لائن افغانستان اور وسط ایشیا کے عوام کے لئے آمدنی، روزگار اور تعلیم و تربیت کے بے شمار مواقع پیدا کرے گی۔ یہ عمل افغانستان کو بیرونی دنیا سے مربوط کر کے باہمی علاقائی تعاون کے مواقع میں اضافہ کرے گا۔ ''امن کے لئے پائپ لائن'' آئل کمپنیوں کا نیا نعرہ ہونا چاہیے۔

ازبکستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے درمیان بٹی ہوئی وادی فرغانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جامع حکمت عملی اپنانا ہوگی۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت وادی فرغانہ ترقیاتی پروگرام، سوروس فاؤنڈیشن کے فرغانہ پراجیکٹ اور حفاظتی اقدامات کے مرکز کے تحت امریکہ میں قائم وادی فرغانہ ورکنگ گروپ نے اپنی اپنی رپورٹوں میں واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ وادی فرغانہ کے دقیق مسائل کو اسی وقت حل کیا جا سکتا ہے جب اس کے موجودہ سیاسی اور معاشی طور پر منقسم حلقہ ہائے اثر کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے لئے بین الملکی اداروں کی ضرورت ہے جو ''معاشی ترقی اور ہمہ نسلی تعاون کو بہتر بنا سکیں اور اہم تنازعے پر نظر رکھ سکیں۔'' تینوں ممالک کو وادی فرغانہ میں براہ راست بین الاقوامی امدادی اداروں کی سرمایہ کاری کی اجازت لازماً دینی چاہیے اور یہ ادارے وادی فرغانہ کی یکتا جغرافیائی حیثیت کو سامنے رکھ کر سرمایہ کاری کریں اور یہاں زراعت اور صنعت کی بحالی کا کام ......وادی کو، ایک وحدت سمجھ کر...... انجام دیں۔ یہ کام اس وقت تک ناممکن ہے اور اس سے اس کے 10 ملین باشندوں کو قطعی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جب تک علاقائی حکمران یہ حقیقت نہیں سمجھ لیتے کہ سرحدی کنٹرول، بارودی سرنگیں، خاردار باڑیں اور سڑکوں اور آبپاشی نہروں کو بند کر دینے کا عمل معاشی، زراعتی یا کسی بھی طرح کی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہیں۔

جمعہ نعمان غنی جب وادی فرغانہ کو فتح کرنے کا خواب دیکھتا ہے تو وہ اس کی غیر فطری تین ملکوں میں تقسیم کو نظر انداز کر کے ایک فطری وحدت کے طور پر دیکھتا ہے۔ اگر حکمرانوں نے وادی کو تین علیحدہ علیحدہ حصوں میں ہی دیکھنے کی کوشش کی تو نعمان غنی کی جدوجہد

کامیاب بھی ہوسکتی ہے۔ اس رویئے کوتھوپنے کا سب سے بڑا مجرم ازبکستان ہے۔ اس حکومت نے اقوام متحدہ، سوروس فاؤنڈیشن، اے سی ٹی ای ڈی اور آغا خان فاؤنڈیشن جیسی اہم تنظیموں کو کراس بارڈر ترقیاتی کام کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا ہے۔ فی الحال یہ سب ادارے کرغیزستان اور تاجکستان میں الگ الگ یونٹ بنا کر وادی میں کام کرنے پر مجبور ہیں جبکہ وادی کے ازبکی حصے میں ان کے جانے پر پابندی ہے۔ تاشقند کھلم کھلا دعویٰ کرتا ہے کہ وادی میں کوئی معاشی مسائل ہیں ہی نہیں لہٰذا امدادی اداروں کی ضرورت نہیں۔

تاہم جن شعبوں میں انہیں کام کی اجازت ہے، یہ ادارے مائیکرو کریڈٹ سکیم جیسے بنیادی مگرانتہائی مفید پروگرام تشکیل دے رہے ہیں۔ ان پروگراموں کیوجہ سے لوگ خیرات کے بجائے ملازمت کرکے اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی کوششوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی ہے کہ وادی فرغانہ کی ترقی کے جامع منصوبے کیلئے بہت زیادہ فنڈز کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک لاکھ ڈالر کے بجٹ سے اے سی ٹی ای ڈی نے باتکن اور وادی کے کرغیز حصے میں ہزاروں کسانوں کو مائیکروکریڈٹ سکیم کے تحت نئی فصلوں کی کاشت، مویشی خانوں اور آبپاشی کے نیٹ ورکس کی تعمیر کے لئے مالی امداد دی ہے۔

وسط ایشیائی ریاستوں میں معاشی ترقی کے لئے مربوط اندازفکر کی عدم موجودگی، مستقبل قریب میں پانی کے مسئلے پر جنگ کے امکانات کو وسیع تر کر رہی ہے۔ سوویت دور میں تاجکستان اورکرغیزستان کے سلسلۂ کوہ پر پگھلنے والی برف کے پانی کو اکٹھا کرنے کے لئے وسیع وعریض ذخائر اور آبپاشی نظام تعمیر کیا گیا تھا تاکہ وسط ایشیا کی بڑی فصل کپاس کو پانی میسر آ سکے۔ یہ آبپاشی نظام چینی سرحد سے یورال کے پہاڑوں تک مربوط اورمنظّم تھا لیکن نئی ریاستوں کے قیام اور سرحدی کنٹرول نے پانی کے بہاؤ کو متنازعہ بنا دیا ہے۔ کرغیزستان اور تاجکستان دونوں نے ہمسایوں کے تعزیری اقدامات کے خلاف پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً جب ازبکستان نے بشکیک کی گیس سپلائی بند کر دی تو کرغیزوں نے ازبک آبپاشی کے لئے پانی بند کرنے کی دھمکی دے دی۔ مزید براں ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق آبپاشی کی نہروں میں پانی کی مقدار، پانی کی کمیابی (آبپاشی نظام کے بریک ڈاؤن اور ریاستوں کی بلیک میل کی پالیسی) کی وجہ سے50% کم ہوگئی ہے۔1991ء سے وسط ایشیاء کی20% سے30% تک زرعی زمین پانی کی کمیابی کی وجہ سے ناقابل استعمال ہوگئی

ہے۔ تاجکستان جہاں صرف سات فیصد رقبہ قابل کاشت ہے۔ آبپاشی سے سیراب ہونے والی50% زرعی زمین پانی نہ ملنے کی وجہ سے......کیونکہ خانہ جنگی کے دوران آبپاشی نظام تباہ ہوگیا تھا_____ بے کار ہوگئی ہے۔

علاقائی امن کیلئے تاجکستان کو مدنظر رکھ کر جامع حکمت عملی تشکیل دینا ہوگی کیونکہ علاقے میں مستقبل کے لئے صرف تاجکستان ہی کو ایک سیاسی ماڈل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک بہیمانہ خانہ جنگی کے بعد ایک مخلوط حکومت قائم ہوئی ہے جس میں اسلام پسند' نئے کمیونسٹ اور قبائلی سردار شامل ہیں۔ اسلام پسند الیکشن ہار گئے ہیں لیکن وہ الیکشن میں شامل تھے اور انہوں نے اپنی شکست کو قبول بھی کیا ہے۔ وسط ایشیائی حکمرانوں کو جو فی الحال اپنے مسلمان عوام کو دبانے کی کوشش میں ہیں، تاجکستان کی شروعات کی پیروی کرنی چاہیے اور ایسی مخلوط حکومتوں کا نظریہ اپنانا چاہیے جس میں مختلف طبقات، سیاسی پارٹیوں اورنظریات کی نمائندگی ہو۔

لیکن تاجکستان غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔2000ء میں تاجکستان نے اپنی چوہتر سالہ تاریخ میں بدترین قحط کا سامنا کیا۔ اناج کی پیداوار47% تک گر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی کا پانچواں حصہ 1.2 ملین آبادی شدید غذائی قلت اور بھوک کا شکار ہوگئی۔ ''یہ سوچنا غلط ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہوگا کہ غذائی بحران صرف قحط کی قدرتی تباہ کاری کی وجہ سے ہے۔ اس اچانک صورت حال کے پیچھے پیچیدہ سیاسی اور معاشی اسباب پنہاں ہیں۔'' یہ بات ریڈکراس کی بین الاقوامی کمیٹی کی ایک رپورٹ میں بتائی گئی۔ اگست2001ء تک ریڈکراس کی رپورٹ تھی کہ اس دفعہ فصل (2000ء کی تباہ کن فصل کی نسبت)15% کم ہوگی اور تقریباً ایک ملین لوگوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اگر بین الاقوامی اداروں نے بروقت مدد نہ کی۔

''لوگوں نے خوراک خریدنے کے لئے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تک بیچ ڈالی ہیں اور اب ان کے پاس بیچنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔'' ریڈکراس کے ایک افسر راجر بریک نے اپنا خیال ظاہر کیا: ''ہم نے بچوں کو کھیتوں میں چوہوں کے بل کھودتے دیکھا کہ شاید (سردیوں کے لئے ان کے جمع کردہ ذخیروں میں) گندم کا کوئی دانہ مل جائے۔'' جنوبی تاجکستان میں پینسٹھ ہزار بچے جوتے اور کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے سکول نہیں جا پا رہے

تھے۔

مخلوط حکومت ان معاشی ناہمواریوں سے نمٹنے میں ناکام ہوگئی ہے۔ تاجکستان کے کمزور ریاستی ادارے تو اپنے ملک پر پورے کنٹرول کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتے۔ ملک کو ازبکی تحریک کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔تحریک کم از کم کسانوں کو رقم تو ادا کرتی ہے اور اپنے ساتھ شامل گوریلوں کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔ ماضی میں مغرب کی جانب سے نظرانداز ہونے کی وجہ سے تاجکستان روس کی طفیلی ریاست بنا ہوا ہے اوراپنی سلامتی اور اپنے اقتصادی وجود کو قائم رکھنے کے لئے مکمل طور پر روس کا محتاج ہے۔ ریاستی ڈھانچے کی تشکیل نو، زراعت کی بحالی اور معیشت کی ازسرنو تعمیر کیلئے مغرب کی فیاضانہ اقتصادی امداد اور حمایت نہ صرف تاجکستان کے استحکام میں بلکہ عالمی برادری میں شمولیت اور رویوں اور قومی تعمیر کے بین الاقوامی معیاروں سے آگہی کے زبردست فائدے، ہمسایہ ملکوں پر بھی اجاگر کرنے میں ممد ہوسکتی ہے۔ جب تک وسط ایشیائی ریاستیں ان پالیسیوں پر عمل پیرا نہیں ہوتیں، بین الاقوامی برادری کا تعاون حاصل نہیں کرتیں' وسط ایشیا کا علاقہ اسی طرح عدم استحکام کا شکار رہے گا۔ دہشت گردی، اسلامی جہادیت، منشیات کی تجارت، ایڈز اور نسلی بے چینی بڑھتی جائے گی۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام کے حکام کے مطابق تاجکستان کی30% سے50% تک آمدنی افغانستان سے منشیات کی تجارت سے حاصل ہوتی ہے۔

ازبکی تحریک یا حزب التحریر دونوں میں کسی کے پاس بھی علاقے میں کامیاب ہونے کے لئے طاقت ہے، نہ مقبولیت اور نہ ہی فوجی قوت۔ ان کی موجودہ کامیابی بنیادی طور پر ریاستی جبر وتشدد اور حکام کی نااہلی کی وجہ سے ہے، جس کے نتیجے میں وہ شہید بن جاتے ہیں۔ افغان خانہ جنگی جیسے بیرونی عوامل کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ ازبکی تحریک کی نظریاتی، تنظیمی اور سماجی بنیاد طالبان اور حزب التحریر دونوں ہی سے مختلف ہے۔لیکن اس کی فوجی صلاحیتوں میں اضافہ طالبان کی وجہ سے ہوا ہے اور اس کے نظریات اس افغان، پاکستانی اور عرب نیٹ ورک سے متاثر ہیں، جو طالبان کا بھی مشاورتی ادارہ ہے۔

اگرچہ ازبکی تحریک کے نظریات خالص وہابی نوعیت کے نہیں، جیسے کہ کریموف کا دعویٰ ہے، تاہم اس کا عالمی جہاد کا نظریہ یقیناً ان دیوبندی، وہابی عقائد پر مبنی ہے جو پاکستان اور سعودی عرب سے درآمد کئے گئے ہیں۔ یہ وہ عقائد ہیں جن کا وسط ایشیا کے روایتی اسلام

سے کوئی تعلق نہیں۔ از بکی تحریک میں اپنی تاریخ اور روایات کی عدم پاسداری، اس میں انتہا پسند اسلامی نظریات کا غلبہ ظاہر کرتی ہے اور متلون مزاج وادی فرغانہ سے باہر تحریک کے لئے عوامی حمایت کو محدود بھی کر سکتی ہے۔

حزب التحریر کے تصورات بھی درآمد شدہ ہیں اور وسط ایشیا کی روایات کے لئے بالکل اجنبی۔ اس کا جہادی لٹریچر عالمی سامعین کے لئے ہے اور وسط ایشیا اور اس کے عوام کے حقیقی مسائل کو اجاگر نہیں کرتا۔ مزید براں دونوں گروپوں کی ہیئت ترکیبی اور قیادت خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ وہ خود کو ظاہر کئے بغیر اور عوام کو سمجھائے بغیر ...... کہ ان کے پاس عوام کے لئے کیا پروگرام ہے...... خود کو صدر کریموف یا صدر آقائیوف کا متبادل نہیں بنا سکتے۔ ان گروہوں کے حلقہ اثر کو ختم کرنے کیلئے علاقائی حکمرانوں کے پاس بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی قیادت کو عوام کے سامنے لے آئیں۔ ملک میں اسلامی شعائر پر عمل کی آزادی دے دی جائے اور اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اس طرح تحریک کے پاس محض بدیسی نظریات رہ جائیں گے۔

بہتر معاشی اور سماجی صورت حال میں ایسی تحریکوں کیلئے عوامی اپیل یا اثر نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ے اور یہ عموماً اسلامی دنیا کے گرد حاشیے کا کام دیتے ہیں، جیسے کہ کئی دوسرے مسلم ممالک میں حزب التحریر کا اثر نہایت محدود ہے۔ وسط ایشیا کے بحران کی مخصوص صورت حال نے از بکی تحریک اور حزب التحریر کو مرکزی مقام اور نوجوانوں کو اجنبی نظریات اور کردار سے گہرا جذباتی تعلق دے دیا ہے۔ خطرات بڑھنے کے ساتھ علاقائی حکمران نہ صرف مزید متشدد ہوتے جا رہے ہیں بلکہ عوامی احتیاجات اور مسائل حل کرنے سے بھی بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ جوں جوں لوگ ناراض اور پریشان ہو رہے ہیں، توں توں حکمران تبدیلی کی ضرورت نظرانداز کر رہے ہیں۔

''ایک ناکام ریاست کوئی مرتی ہوئی ریاست نہیں ہوتی۔ تاہم ایسا ہونا بھی ممکن ہے۔ ناکام ریاست وہ ریاست ہے، جہاں پالیسیوں کی ناکامیوں کو ان پر دوبارہ غور وفکر کیلئے مناسب وجہ کبھی نہیں سمجھا جاتا۔'' یہ وارننگ ایک پاکستانی سفارت کار اور سکالر اشرف جہانگیر قاضی نے دی۔ پاکستان، افغانستان یا وسط ایشیائی ریاستوں میں سے کسی کے بھی بارے میں قاضی نے یہ بات کہی ہوگی۔

گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد پیدا شدہ بحران نے خطرات کو اور سنگین کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی تبدیلی کا شاندار موقع بھی مل رہا ہے۔ القاعدہ کے خلاف مغربی اتحاد میں شامل وسط ایشیائی ممالک نے دہشت گردی اور اسلامی انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں بین الاقوامی برادری کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی کاروائیوں کے طویل مدتی نتائج کو نظر انداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر امریکی سربراہی میں یہ اتحاد ازبکی تحریک کا خطرہ ختم کر دیتا ہے تو بین الاقوامی برادری علاقائی حکومتوں پر زور ڈال سکتی ہے کہ وہ بین الاقوامی معیار کے مطابق جمہوریت کی تعمیر، معاشی ترقی اور سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ براء ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وسط ایشیائی حکمران ایک انتہائی نازک چوراہے پر کھڑے ہیں۔ وہ افغانستان سے ملنے والا سبق نظر انداز کر کے مزید دہشت گردی، عدم استحکام اور قحط سالی کا سامنا کر سکتے ہیں یا وہ علاقے میں عالمی برادری کی حالیہ توجہ سے اپنی ریاستوں کی تعمیر نو کے لئے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

وسط ایشیا کا حقیقی بحران مداخلت کاروں کی بجائے ریاستی حکمران طبقے سے ہے۔ بالآخر بین الاقوامی برادری اس حقیقت کو سمجھ رہی ہے اور وسط ایشیا میں حقیقی امن کے امکانات جتنے آج روشن ہیں، اتنے کبھی نہیں تھے۔